ایس۔ ڈیگشٹ
کی رنگین پیشکش
کلپنالوک کی ایسٹ مین کلر تصویر
نیل کمل
پروڈیوسر : ـــــــ پنا لال مہیشوری
ڈائرکٹر : ـــــــ رام مہیشوری
موسیقی : ـــــــ روی
گیت : ـــــــ ساحر لدھیانوی
کہانی :۔ گلشن نندہ، اسکرین پلے :۔ فنی موجمدار، مکالمے :۔ کدار شرما
فوٹوگرافی :۔ فلی
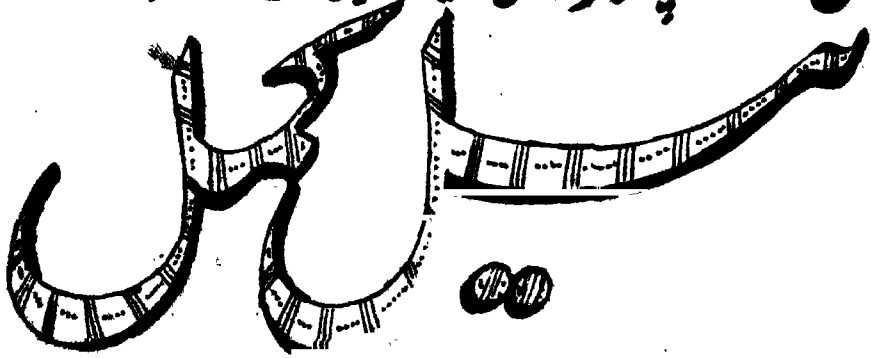
ہی راستہ

اڈور

سادھنا

ھول کا پھول

قانون

ھرم پتر

مراہ

اور

وقت

بنانے والے ادارے بی۔ آر۔ فلمز کی طرف سے

گفتگو

کے قلمی معاونین اور پڑھنے والوں کے لئے

ین خواہشات

ٹوڈیوز۔ پریل۔ بمبئی ۱۲

ادب اور تہذیب کا باشعور ترجمان

گفتگو
سہ ماہی

۱۹۶۷ء

جلد ۱
شمارہ نمبر ۱

مدیر

سردار جعفری

سالانہ چندہ بیس۲۰ روپے
قیمت فی جلد چھ۶ روپے
بیرون ہند (مع ڈاک خرچ بذریعہ رجسٹری) چالیس۴۰ شلنگ

مقام اشاعت

۲۰- کھیتان بھون- جے- ٹاٹا روڈ- بمبئی ۱

طباعت

یونیورسل لیتھو پریس ۲۳۴- نوروجی اسٹریٹ- بمبئی ۲
مالک، ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر علی سردار جعفری- اشاعت پہلا سہ ماہی

عنوانِ گفتگو

مضامین اور مقالے

لطفِ سخن

بیرونی ادب

ہم صفیرِ انقلاب

تبصرے

پیش گفتار

یہ گفتگو کا پہلا شمارہ ہے۔ اس میں گفتگو تخلیقی سطح پر ہے۔ پرانی سے پرانی صنف رباعی اور غزل، نئی سے نئی صنف؛ اکھڑے اکھڑے لہجے اور کھردری لفظی تصویروں کی آزاد نظمیں، طویل افسانے اور مختصر افسانے، ڈرامے اور تنقیدی مضامین، سماجی اور سیاسی موضوعات اور محض داخلی سرگوشی، رجائی انداز اور پسپا ہو جانے کی کیفیت، غرض سب ایک دوسرے سے مصروف گفتگو ہیں۔ یہ خاموش گفتگو اوراق پر سنی جائے گی اور قاری اس میں شریک ہے۔ ایسے مضامین اور خطوط کی اشاعت سے احتراز کیا گیا ہے جن کا انداز معاندانہ تھا یا جن میں منھ چڑانے اور گالی بکنے کی خو کی تسکین کا سامان تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی وجہ سے پیش نظر اشاعت میں چٹخارے کی کمی نظر آئے لیکن اپنے ادبی اور نظریاتی اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے اور اپنے نقطۂ نگاہ پر اصرار کرتے ہوئے، ایک ادبی سنجیدگی اور علمی وقار برقرار رکھنے کی ضرورت ہے۔

آویزش وہی پرانی ہے۔ ادیب پر کوئی سماجی ذمہ داری عائد ہوتی ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہوتی تو سماج میں ادیب کا کیا مقام ہے۔ اور ہوتی ہے تو اس ذمہ داری سے فن کارانہ انداز میں کیسے عہدہ برآ ہوا جا سکتا ہے۔ فرد اور سماج کا کیا رشتہ ہے، ذات اور کائنات کا کیا سمبندھ ہے۔ اپنی ذات کے حصار میں محصور ہو جانا دانش مندی ہے یا اس حصار کو توڑ کر کائنات کی طرح لامحدود اور بیکراں ہو جانے کی کوشش فنی عظمت کی دلیل ہے۔ سیاست ادب اور ادیب پر کہاں تک اثر انداز ہوتی ہے اور ادیب اور ادب کہاں تک سیاست پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ کیا اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی جہالت، مفلسی، ہوسناکی، ظلم، جبر، مکاری، سازش اور ریشہ دوانی کے مقابلے پر صرف فرد کی مظلومیت کا نوحہ، شکستہ شخصیت کا ماتم اور تنہائی کی فریاد کافی ہے یا اس سب کے خلاف احتجاج بھی کوئی معنی رکھتا ہے۔ ادیب صرف حالات کا شکار ہو جاتا ہے یا حالات سے نبرد آزما بھی ہوتا ہے۔ وہ صرف ٹوٹے ہوئے آدرشوں اور زخمی خوابوں کے ویرانوں میں سسکتا رہتا ہے یا نئے آدرش تلاش کرنے اور نئے خوابوں کے دیکھنے کا حوصلہ بھی رکھتا ہے۔ اس کا ذاتی شعور و احساس سماجی شعور و احساس کا ایک حصہ ہوتا ہے یا کہیں خلا سے شعور و احساس پیدا ہوتے ہیں۔ انسان کی بہیمیت، زندگی کی شہوت اور جہالت کے تاریک گوشوں میں کھو جانا ادیب کا منصب ہے یا اپنے فن کے ذریعے سے شائستگی پیدا کرنے کی کاوش سے ادیب کا مقام متعین ہوتا ہے۔ انھیں سوالات سے ملے ہوئے صورت اور معنی کے سوالات ہیں۔ یہاں قومی مزاج کو کوئی اہمیت دی جا سکتی ہے یا نہیں۔ فن کی بیرونی شکلوں کو اپنے یہاں کی جانی پہچانی شکلوں کے ساتھ کس طرح ملایا جا سکتا ہے۔ روایت کی شکست میں کیا کوئی تسلسل بھی باقی رہ جاتا ہے یا نہیں۔ نیا پن پرانے پن کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے یا یکایک کہیں سے نازل ہو جاتا ہے۔ اظہار اور ابلاغ پر

ابہام اور تجرید کے کتنے پردے ڈالے جا سکتے ہیں۔ معنویت کی تہہ داری اور معنویت کے مزاج میں کوئی فرق ہے یا نہیں۔ انتخاب الفاظ حسن کاری اور معنی آفرینی کا کوئی توازن ہونا چاہیے یا نہیں۔ اور ایسے ہی بہت سے سوالات ہیں جو کف در دہان تنقید اور مباحثے سے طے نہیں کیے جا سکتے۔ ان کا آخری فیصلہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر گفتگو جاری ہے تو نئے نئے راستے کھلتے رہیں گے۔ شرط یہ ہے کہ ادیب ادیب کا احترام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اپنے خلاف تنقید سننے کی ہمت۔ اگر اس کو دوسروں کی تخلیقات ناپسند کرنے کا حق حاصل ہے تو دوسروں کو ان کی تخلیقات ناپسند کرنے کا بھی حق ہونا چاہیے۔ اور اس حق کی حفاظت کو ایک مقدس فرض کی طرح پورا کرنا چاہیے۔

ادب اور ادیب اس وقت ایک بحرانی دور سے گزر رہے ہیں۔ عقیدے زخمی ہیں اور یقین و اعتماد کی سانس اکھڑی سی ہے۔ ہماری نظروں کے سامنے آدرشوں کے چہرے مسخ ہوئے ہیں۔ خوابوں کو قتل گاہوں سے گزرنا پڑا ہے اور قدروں کی شکستگی کی کیفیت نے دلوں میں ہول بٹھا دیا ہے۔ ان پھیلے ہوئے ریگزاروں میں کہیں کہیں نئی اپج، نئے انداز تخلیق اور نئی فکر کے نخلستان ملتے ہیں لیکن ان کے سائے اتنے گھنے نہیں ہیں کہ اردو ادب ہڈیوں کو پگھلا دینے والی تپتی ہوئی دھوپ سے بچ سکے اور نہ پانی کے چشمے اتنے وافر ہیں کہ پیاسے اپنی پیاس بجھا سکیں۔ اس لئے سب کرب میں مبتلا ہیں۔ ذات کے قلعے میں بند ہو جانے والے اور ذات کے قلعے سے باہر یلغار کرنے والے سب آگ میں جل رہے ہیں۔ لیکن اصل اختلاف وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں یہ سوال آتا ہے کہ اس آگ کو کیسے بجھایا جائے اور اسے کس طرح نار سے نور میں تبدیل کیا جائے۔

صرف کرب، صرف تشنج، صرف جلتے رہنے میں نہ تو انسانیت کی نجات ہے نہ ادیب کی۔ ذات کی سپر بیکار ہے۔ نظریات کی سپر، عقائد کی سپر، یقین کی سپر بھی اس وقت تک بے معنی ہے جب تک وہ سورما پیدا نہیں ہوتا جو اپنی سپر کو تلوار میں تبدیل کر دینے کی صلاحیت اور طاقت رکھتا ہو۔

آج حوصلے اور امنگ اور مستقبل کے خوبصورت خوابوں کا وہ دور باقی نہیں رہ گیا ہے جب روح کے اندر ایک قوس قزح انگڑائی لیتی رہتی تھی۔ آج ان کوہ کنوں کا عہد ہے جو تیشے سے سر پھوڑ کر مر جانے کے بجائے اپنے بیستون غم سے ایک نئی قوس قزح کو جوئے شیر کی طرح تراش کر باہر نکالیں گے۔ اس کے لئے سماج سے ٹکرانا پڑے گا اور ماحول کی تپتی ہوئی آگ سے گزرنا پڑے گا۔ آج کے دور میں صرف عظیم شاعر اور عظیم ادیب پنپ سکتا ہے۔ یہ عظمت ہر اہل قلم کو آواز دے رہی ہے۔ جس میں حوصلہ ہو وہ آگے بڑھ سکتا ہے۔

گفتگو کا خیر مقدم جس طرح کیا گیا ہے۔ وہ حوصلہ افزا ہے۔ میں اپنے تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنھوں نے روپے کی فراہمی اور مضامین کی فراہمی میں دل کھول کر ساتھ دیا ہے۔ اس شمارے میں اتنے سارے اچھے اور بڑے، پرانے اور نئے ادیب ایک ساتھ شامل ہوئے ہیں جو برسوں سے ایک جگہ جمع نہیں ہوئے تھے۔ قرۃ العین حیدر ایک نئے اور اہم ناول کے ساتھ آئی ہیں جو گفتگو میں قسط وار شائع ہوگا۔ میں ان احباب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے خطوں کا جواب دینے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ گفتگو کا شمارہ ان کے پاس بھی پہنچے گا اور پھر ایک بار ان کو اس حلقے میں شریک ہونے کی دعوت دے گا۔

گزشتہ تین چار ماہ میں کئی اہم ادبی اجتماع ہوئے ہیں۔ شروع دسمبر میں حیدرآباد میں جشن مخدوم منایا گیا اور آخر

جنوری میں کروڑی مل کالج دہلی یونیورسٹی نے جشنِ فراق منایا۔ ہمارے یہ دونوں بزرگ شعراء اس قدر و منزلت کے مستحق ہیں اور اہلِ مبارکباد ہیں۔ جشنِ مخدوم کی دستاویز رسالۂ "صبا" (حیدرآباد) کے ضخیم مخدوم نمبر کی شکل میں آرہا ہے اور جشنِ فراق کے موقع پر کروڑی مل کالج نے "فراق گورکھپوری" کے نام سے ایک خوبصورت کتاب شائع کی ہے۔ اس میں بعض ممتاز ناقدین کے مضامین ہیں۔ پیشِ نظر شمارے میں بھی ان دونوں پر محبت بھرے مگر تیکھے مضامین ہیں۔ اب تک ہماری تنقید ادیبا و شاعر کو ہیرو اور پیغمبر بنا کر پیش کرنے کی عادی رہی ہے۔ لیکن شاعر کو انسان کے روپ میں ابھارنا ضروری ہے۔ اس سے جذبۂ احترام میں کمی نہیں آتی۔

گزشتہ دسمبر میں تیرہ سال کے التوا کے بعد ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مختلف زبانوں کے درجنوں ممتاز ادیبوں نے شرکت کی۔ اب ترقی پسند ادب صرف تحریک نہیں ہے بلکہ اردو ادب کا ایک مستند اور قابلِ احترام رجحان ہے۔ اس کانفرنس میں پرانی انتہا پسندی اور ادعائیت کا جائزہ لیا گیا۔ کھلے دل سے غلطیوں کا اعتراف کیا گیا اور انجمن کو وسیع تر بنیادوں پر از سرِ نو منظم کیا گیا۔ یہ ایسے ہم خیال ادیبوں کی انجمن ہے جو ادب میں سماجی ذمہ داری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کا مقصد ایسے اچھے ادب کی تخلیق ہے جو ملک، قوم اور وسیع تر انسانیت کو بہتر اور خوبصورت مستقبل کی طرف لے جانے میں مفید ثابت ہو۔ وہ مستقبل جو جنگ کی شیطنت اور انسانی استحصال کی خباثت سے پاک ہو۔ جس میں قوموں کی ترقی اور فرد کی بالیدگی کے سارے امکانات بروئے کار آئیں۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو یہ تصور محض ایک آدرش، محض ایک خواب معلوم ہو۔ لیکن اتنا خوبصورت خواب دیکھنا زندہ رہنے کے لئے ضروری ہے اور بہتر اور حسین تر ادب کی تخلیق کی ضمانت ہے ؎

زمن جوئے دربدر نکو زیستن
جگر خوردن و تازہ روز زیستن

در اندیشہ محوِ تلاشم ہنوز
قدح سازو ساقی تراشم ہنوز

سردار جعفری

فیض احمد فیض

غزل

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

ہم سہل طلب، کون سے فرہاد تھے، لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

گھر رہیۓ تو ویرانیٔ دل کھانے کو آوے
رہ چلیۓ تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

ہے صاحبِ انصاف، خود انصاف کا طالب
مُہر اُس کی ہے، میزان بدستِ دگراں ہے

اربابِ جنوں یک بہ گر دست و گریباں
اور جیشِ ہوس دُور سے نظّارہ کناں ہے

○

ن ۔ م ۔ راشد

راہبہ

آرزو راہبہ ہے، بیکس و تنہا و حزیں
آرزو راہبہ ہے، عمر گزاری جس نے
انہی محرومِ ازل راہبوں، معبد کے نگہبانوں میں
ان مہ و سالِ یک آہنگ کے ایوانوں میں
کیسے معبد پہ ہے، تاریکی کا سایہ بھاری
روئے معبود سے ہیں خون کے دھارے جاری

راہبہ رات کو معبد میں نکل آئی ہے
جھلملاتی ہوئی اک شمع لئے
لڑکھڑاتی ہوئی، فرش و در و دیوار سے ٹکراتی ہوئی
دل میں کہتی ہے کہ اس شمع کی لَو ہی شاید
دور معبد سے بہت دور چمکتے ہوئے انوار کی تمثیل بنے
آنے والی سحرِ نو ہی قندیل بنے

آرزو راہبہ ہے، بیکس و تنہا و حزیں
ہاں مگر راہبوں کو اس کی خبر ہو کیونکر
خود ہیں کھوئے ہوئے، سہمے ہوئے، سرگوشی سے گھبرائے ہوئے
راہبوں کو یہ خبر ہو کیونکر
کس لئے راہبہ ہے بیکس و تنہا و حزیں
راہب استادہ ہیں مرمر کی سِلوں کے مانند
بے کراں عجز کی جاں سوختہ ویرانی میں
جس میں اُگتے نہیں دل سوزیِ انساں کے گلاب

راہبہ شمع لئے پھرتی ہے
یہ سمجھتی ہے کہ اس سے درِ معبد پہ کبھی
گھاس پر اوس جھلک اُٹھے گی
سنگریزوں پہ کوئی چاپ سُنائی دے گی

شخصیت

ظ۔ انصاری

فراق گورکھپوری

مگر پھر بھی

"۔۔۔۔فراق صاحب! آپ کی شخصیت پر ظ انصاری سے مضمون لکھنے کو کہا ہے اور۔۔۔۔۔"

"۔۔۔۔۔اجی توبہ کیجئے! وہ مجھ ہی اگلوں کی شخصیت کیا سمجھتے ہیں' جو مجھ کو سمجھیں گے۔۔۔۔۔"

اگلوں سے مراد عموماً میرؔ و غالبؔ ــــ بہت ہوا تو آتشؔ و مصحفیؔ جیسے شاعر بھی گھس پل کر ان میں شامل ہو جاتے ہیں۔ یوں فرماتے ہیں فراقؔ صاحب۔ جس زمین پر ہم رہتے ہیں وہاں کا حال یہ ہے کہ

"آسماں آنکھ کے تل میں ہی دکھاتی دیتا"

یہ سب خیال مجھے آیا تو میں نے فراقؔ صاحب کی شخصیت پر قلم اُٹھایا! اب لاکھ قلم گھسے جاؤ۔ مضمون میں وہ بات نہ پیدا ہوگی' ان مضمونوں کی سی جو فراق صاحب خود اپنی شخصیت اور شاعری پر لکھتے یا لکھواتے ہیں۔ ان میں کہیں نہ کہیں۔

ماورائے سخن بھی ہے اک بات!

یہ "اِک بات" ایسی پُراسرار کیفیت ہے' جو اُن کی نثر میں اور نظم کی رگوں میں جاری و ساری ہے۔ وہ نہ محض انگریزی ادبیات کے وسیع مطالعے کا بھراؤ ہے' نہ صرف شاعرانہ تخیل کی اُچھال۔ اُس "اِک بات" کی اگر جلدی سے تشخیص نہ ہوگئی تو لوگ اپنی سہولت کے لئے اُسے 'فراقیت' کہنے لگیں گے۔

ہماری وضع کے لوگ جو فراقؔ صاحب کو جی جان سے چاہتے ہیں۔ اُن کی محبت میں ایسے وارفتہ نہیں ہوئے کہ احترام سے سر بہ سجدہ ہو جائیں۔ وہ اپنا احترام خود ہی نہیں کرنے دیتے' چھیڑ خانی کرتے ہیں اور چھیڑ خانی پر اُکسا کر برہم بھی ہوتے ہیں اور دل ہی دل میں مسکراتے بھی جاتے ہیں۔ غصہ اور پیار اُن کے یہاں دو متضاد کیفیتیں نہیں ہیں۔ ایک ہی کابک کے کبوتر ہیں ایک ہی دانہ چگتے ہیں۔ جیسے شاعری میں' ایسے ہی روزمرہ کی زندگی میں۔ ایک مزے دار شاعر کی پھلجھڑی یاد آئی؛

مزا برسات کا چاہو تو ان آنکھوں میں آ بیٹھو

سفیدی ہے' سیاہی ہے' شفق ہے' ابر باراں ہے

"اِن آنکھوں "سے بڑھ کر دنیا تک کیفیت ہے فراق کی آنکھوں میں" اور یہ ایک نہیں دو ہیں۔ اُن کی تنقید اور شاعری دونوں میں برابر کی پہنچ ہے۔ فراق جیسے صاحبِ نظر کو ہم نے اُس کی شاعری میں تو کچھ کچھ پہچان لیا ہے۔ مضامین اور خاص کر تنقیدی یا نیم تنقیدی مضامین میں اور اُن ادبی گفتگوؤں میں، جہاں وہ ذہن کی کھانیاں کھولتے ہیں' اچھی طرح نہیں پہچانا ہے۔ فراق اپنی شاعری کے ہی نہیں۔ اپنی علمی نظر کے شارح اور ترجمان بھی خود ہیں اور یہ اُن کی ادبی شخصیت کا بہت اہم پہلو ہے۔

خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گلِ کوزہ

اپنی شخصیت کے سفر میں (ذکرِ میر لکھنے والے میر سمیت) آج تک کا کوئی شاعر منزل بہ منزل اس طرح قافلے کر نہیں چلا جیسے فراق دوسروں نے یہ کام اپنے زمانے کے یا بعد والے دَور کے اہلِ نظر پر پورے اعتماد کے ساتھ چھوڑ دیا۔ فراق صاحب کو یا تو یہ اعتماد نہیں میسر۔ یا پھر یوں ہے کہ "مقامات" کی پہچان میں وہ اپنی فن کارانہ شخصیت کے ذریعے کچھ ایسے پیمانے عام کرنا چاہتے ہیں، جن سے عالمی ادب کی بڑی شخصیتوں کو ناپا جا سکے۔

"مقامات" کا لفظ میں نے بس یوں ہی نہیں لکھ دیا۔ اِس لفظ کے سلسلے دُور تک گئے ہیں ..... ہر نکتہ مقامے دارد یک ..... ، میر نے (جس کا فراق وظیفہ پڑھتے ہیں) "مقام" کو خاص اِسی معنی میں استعمال کیا ہے۔

ہر سخن اُس کا اک مقام سے ہے

اور اقبال اس لفظ کی گہرائی سے آگاہ تھے۔ جب اُنھوں نے کہا۔

یہ سالک مقامات میں کھو گیا

فراق "مقامات" کے آدمی ہیں، اُن کی تہہ در تہہ اور پیچ در پیچ شخصیت نہ سادہ لکیر ہے، نہ دائرہ۔ اس کا کارڈیوگرام مختلف سطحوں پر بنتا ہے اور نہایت ناہمواری میں ایک منطق لئے رہتا ہے

فراق جیسی شخصیت کی تلاش مختلف سمتوں سے اُدھوری سچائیوں تک پہنچاتی ہے۔ صوفیانہ اصطلاحوں کی غزل گوئی اور پھر اُن غزلوں کی تہوں میں ایسے پہلو نکالنے والے اشعار جو حسّی تجربوں کو چھونے اور دیکھنے اور دکھانے پر ہی لفظوں کی بندش قبول کر سکتے ہیں۔ یہاں سے وہ چلے۔ ادب اور فلسفے کے مطالعے میں خاص کر رومانوی دور کی انگریزی شاعری نے سب سے زیادہ اُن کا دامنِ دل کھینچا۔ ذہن کی وہ تیزی، جس میں "آبگینہ پگھلا جائے ہے۔" کی کیفیت اور پھر سماج کی بعض ناہموار بندشوں سے نبلے رہنے کی بھی کوشش۔ "برکفِ جامِ شریعت، برکفے سندانِ عشق۔"

وہ اپنے سوانح کے بیان میں ناموزوں شادی کو سب سے بڑا سانحہ سمجھتے ہیں:

..... "میری زندگی ناقابلِ برداشت عذاب بن گئی۔ میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہیں تھا لیکن معمولی سے معمولی انسان سے بھی یہ لڑکی کند ذہن اور نااہل تھی۔ صورت میں کوئی کشش نہیں، بلکہ اُلٹے شدید ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا۔ یہ لڑکی گھر کو بالکل نہیں چلا سکتی تھی اور اس کا میرے گھر آنا پورے کنبے کے لئے منحوس ثابت ہوا

کوئی دوسرا ہوتا' تو یا دوسری شادی کر لیتا یا من مار کر رہ جاتا۔ میں دوسری شادی بھی نہ کر سکا اور تب سے آج
تک میری زندگی ایک ناقابلِ برداشت تکلیف اور تنہائی کا شکار رہی۔ پورے ایک سال شادی کے بعد مجھے
نیند نہیں آئی اور عمر بھر اس مصیبت کو نہیں بھول سکا۔۔۔۔۔"

گھریلو زندگی کی راحت بڑی دولت ہے اور شخصیت کے متوازن اٹھان کے لئے عام طور سے اُس کی اہمیت مانی گئی ہے لیکن
غیر معمولی دل و دماغ کے پاؤں اپنے آنگن کی نرم گیلی مٹی میں دھنس بھی جاتے ہیں۔ تعداد شخصیتوں کی سوانح عمری میں اکثر گھر کی یا بعد
میں ازدواجی زندگی کی بے آرامی کا کچھ حال کھلتا ہے۔ لیکن کبھی کسی نے اس طرح اپنے "سوزِ درون" کا پتہ نہیں دیا۔ "شب بیداری" کے
دُکھ کو ایک کے سر نہیں منڈھا۔ اور یہ سوچے بغیر کہ اُس لڑکی پر کیا بیتی۔

DAVID COPPERFIELD کے مصنف چارلس ڈکنس نے اپنے بچپن اور نوجوانی کے دُکھوں کا بیان
"در حدیثِ دیگراں" کیا ہے۔

غالب نے عمر بھر مسکرا مسکرا اپنی بیوی کے مزاج کی شکایت کی ہے۔ لیکن ایک عورت کو بیوی قبول کر کے اُس کی زندگی میں
کُڑھتے رہنا۔ اور ان لفظوں میں کھلے عام کُڑھن ظاہر کرنا' وہ بھی ایسے وقت میں جبکہ بچے جوان ہو چکے ہیں۔ یقیناً اس کلچر کے نزدیک
ناقابلِ قبول ہوگا۔ جس کلچر کو فراق نے اپنی (روپ کی) رباعیوں میں شان سے آئیڈیلائز کیا ہے۔

ایسے بیانات دے کر فراق اپنی شخصیت کی ڈور کا سرا ہمارے ہاتھوں میں دے رہے ہیں یا پڑھنے والے کو غم کا شریک
ماز کرنا چاہتے ہیں؟ ہمیں معلوم ہے کہ ہمدردی کے مقابلے میں اُنھیں "رنجشِ بے جا" گوارا ہے۔

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست
آہ اب مجھ سے تجھے رنجشِ بے جا بھی نہیں

یہ شکایت برسبیلِ تذکرہ حکایت بھی نہیں ہو سکتی' کیونکہ بار بار اپنی شاعری کے متعلق باتیں کرتے ہوئے اُنھوں نے زندگی کے
اس "دردناک" پہلو پر زور دیا ہے۔

فراق کی شخصیت کی کھوج میں جب ہم اُس ستی ساوتری کی رسوئی میں جا نکلتے ہیں جس کی گھریلو زندگی کے روپ ہم رباعیوں
میں دیکھ چکے ہیں تو خیال گزرتا ہے کہ "اردو شاعری میں آفاقی کلچر کے عناصر کی کمی" جتاتے وقت خود شاعر اپنی عمر بھر کی تشنگی کی تلافی
ایسے مناظر سے کرنا چاہتا ہے۔ جس میں کلچر اس قدر "ارضی" اور "مقامی" ہو گیا ہو۔

منڈپ کے تلے کھڑی ہے رس کی پتلی — جیون ساتھی سے پریم کی گانٹھ بندھی
ہلکے شعلوں کے گرد بھانور کے سمے — مکھڑے پہ نرم چھوٹ سی پڑتی ہوئی

چوکے کی سہانی آنچ مکھڑا روشن — ہے گھر کی لکشمی نہاتی بھوجن

سیتا کی رسوئی کے کھنکتے برتن　　دیتے ہیں کرچھی کے چلنے کا پتہ

ازدواجی زندگی کی تلخ کامی، کتنی ہی تلخ حقیقت کیوں نہ سہی، تاہم وہ اُن کی شخصیت کے بکھرے ہوئے جام کی تلچھٹ ہے۔ اُس سے نہ اُن کی شخصیت کا خمیر اُٹھا ہے، نہ شاعری کا۔ اگر وہ ادھر سے شادکام ہوتے تب بھی کچھ ایسے ہی ہوتے، جیسے ہیں۔ اُن کے سے شدید احساس، تیز ذہن، گہری سوچ بچار کرنے والے کو اپنی شخصیت کے بھرپور تعمیر کے لئے جتنا بے نیاز ہو کر جینا چاہیئے تھا، وہ اتنے بے نیاز نہیں رہ سکے۔

فراق نے آئی۔سی۔ایس کے مقابلے سے اُس وقت ہاتھ اُٹھایا، قومی آزادی کے محاذ پر اس وقت جیل کاٹی جب وہ نوجوان تھے اور ملک آزادی کے معرکے میں اُترا ہوا تھا۔ پھر ایک بار وہ یونی ورسٹی میں انگریزی ادبیات کے اُستاد ہو کر آئے تو پچیس ۲۵ برس تک خوش و ناخوش اسی طرح نباہتے رہے جس طرح انھوں نے بیوی سے نباہی بھی اور اس سے بیزار بھی رہے۔

اپنے طرزِ بیان اور طرزِ فکر میں فراق نے بڑا لمبا فاصلہ طے کیا ہے۔ اس فاصلے کو پوری طرح دریافت کئے بغیر اُن کی شخصیت کے کچے خاکے میں رنگ نہیں بھرا جا سکتا۔

جب فراق اس پر اصرار کرتے ہیں کہ انھیں اردو کے صفِ اول یا صفِ دوم کے اور شاعروں میں شمار نہ کیا جائے تو ہمیں اس فاصلے کا بھی احساس دلاتے ہیں جو انھوں نے ذہن اور بیان میں ۳۵ سال کے عرصے میں طے کیا اور ساتھ ہی اس احتجاج سے واقف کرتے ہیں جو اُن کے وجود کے اندر برپا رہا ہے۔ فراق سے کمتر دل و دماغ کے شاعر اور اہلِ قلم اُن سے زیادہ مقبول ہوئے اور زیادہ پوجے گئے۔ فراق نے کالجوں کے پروردہ ادب دوستوں میں اس وقت اپنے مداحوں کا حلقہ پیدا کیا جب انھیں یہ احساس ہو گیا کہ غزل کی صنف میں نئے گوشے نکالنے کی بہت کم گنجائش ہے اور جو آنچ اُن کے ہاں موجود ہے وہ بھی نیم فلسفیانہ، نیم صوفیانہ اصطلاحوں کی خاکستر میں دب کر آنکھوں سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ بجا یہ ہے کہ فراق کی شخصیت ایک زمانے تک اُن کی شاعری سے زیادہ بیباک، ہنگامہ خیز، اور نمایاں مسئلہ رہی اور یہ اُن کی شاعری نہیں تھی جس نے عمر کی ڈھلتی دوپہر میں انھیں منوا لیا۔ بلکہ اُن کی دل آویز اور لڑاکو شخصیت تھی جس نے فراق کی شاعری پر متوجہ کیا۔

فراق کی شخصیت کے سمجھنے میں الہ آباد یونی ورسٹی کے اندر اُن کی حیثیت پر بھی نظر رکھنی چاہیئے۔ امر ناتھ جھا جو بعد میں وائس چانسلر ہوئے اور رہے۔ کالج کی طالب علمی کے دنوں میں فراق کے مدِ مقابل تھے۔ اور خود فراق صاحب کی زبانی ہم نے سنا ہے کہ وہ ایک سال امتحان صرف اس لئے ٹال گئے کہ فراق سے مقابلہ تھا اور اس بات کا اندیشہ کہ کہیں فرسٹ کلاس فرسٹ کی پوزیشن ہاتھ سے نہ نکل جائے۔

فراق نے ایک روز کلاس سے نکلتے نکلتے کئی طالب علموں کے سامنے کہہ دیا کہ جسے آپ یونی ورسٹی کا خدا سمجھتے ہیں اس کی صورت میرے باپ کے سائیس سے ملتی ہے۔ امر ناتھ جھا تک بات پہونچی اور وہ پی گئے۔

اب ایک تو فراق، یونی ورسٹی کے خدا، کو خاطر میں نہ لائیں، دوسری طرف انھیں شعبے کے صدر اور طالب علموں کے تقاضے تک کا خیال رکھنا پڑے۔ جبر و اختیار کی اسی کش مکش میں انھوں نے اپنی حیثیت منوانے کے لئے جتنے جتن کئے ہیں

بی کو دیکھ کے وہ استاد جانتے ہوں گے جن پر آئے دن فراق صاحب کے طنز و تمسخر کے چھینٹے پڑتے رہتے تھے۔ ذہن اور فن میں دونوں سے بڑھ کر جست لگا لینا۔ بڑی حد تک زندگی کی محرومیوں کی تلافی کر دیتا ہے۔ لیکن تلافی اور تسکین میں بڑا بُعد ہے۔ اگر سی درجے کی بے نیازی نہ ہو جو رنج و راحت کو ہموار کر سکے تو شخصیت میں بل پڑ جاتے ہیں۔ جیسے بعض لوگ فراق کی دو رنگی لیتے ہیں۔ وہ نہ دو رنگی ہے، نہ باطنی تضاد، وہ ایک ہی کیفیت کے دو انتہائی سرے ہیں جن کے درمیان فاصلہ حائل کا تول نہایا

کسی نے کبھی سوچا ہے کہ فراق کو رات کے پچھلے پہر سے یہ گہری نسبت کیوں ہے؟ رات کے سنگیت اور سکوت کو انھوں نے اپنی رگ رگ میں سمو رکھا ہے۔ اردو تو کیا، دنیا کی اور کئی بڑی زبانوں میں، جہاں تک میری نظر گئی، میں نے کہیں شبِ ہجر کی ایسی مشاطہ نہیں دیکھی۔ بے خوابی کے عالم بہتوں پر گذرے ہیں۔ فردوسی نے شاہنامے کی ابتدا ایسی ہی ایک رات کی بے چینی سے کی تھی لیکن فراق رات ڈھلے اور صبح ہونے سے پہلے کی جس کیفیت سے ہمیں روشناس کرتے ہیں وہ بیان سے باہر ہے۔ ان کا یہ کہنا بالکل برحق ہے ؎

میں ہوں راتوں کی کہانی، مجھے کہتے ہیں فراق　　مجھ سے اے انجم و مہ آنکھ نہ پھیرو، دیکھو!

میخانۂ سخن میں یہ راتیں نہ آئی تھیں　　کچھ کام کر گئیں مری شب زندہ داریاں

یہ راتوں کی جگائی نہ محض جنسی ناآسودگی کا نتیجہ ہے، نہ فکر و تصور کی تنہائی کا، اس کے پیچھے ذہن کی بیداری، اندیشوں کی سازش اور اعصاب کی ہاتھا پائی چھپی بیٹھی ہے۔ فراق کسی ایک سیاسی یا فلسفیانہ نظریے کی نہ تو پیداوار تھے، نہ اس سے نباہ سکتے تھے۔ نہ اس کی گونج سے پوری طرح آزاد ہو سکتے تھے۔ ہر نظریہ ان کے فکر کے قدموں پر تسمے لگے چھوڑ جاتا اور وہ آگے کی تلاش میں نکل جاتے۔ انھوں نے مارکس ازم کے سرچشمے سے بھی ادبی اور فلسفیانہ بصیرت حاصل کی۔ مگر سانکھیہ اور ویدانت سسٹموں کی گونج سے بے نیاز ہو کر نہیں کی۔ تصوف کے "ہمہ اوست" سے ان کی اتنی آشنائی قائم رہی جتنی مارکس ازم کے ارضی اور سائنسی تصور سے۔ اپنی گفتگو میں یا فکر میں جب وہ اڑان بھرتے ہیں تو رشتہ بپا ہوتے ہیں اور ان کے لئے کسی چھتری پر اتر پڑنا اسی قدر آسان ہوتا ہے جتنا اسے حریفوں کے لئے چھوڑ جانا۔

خود فراق کے حق میں یہ عمل، عمل خیر ثابت ہوا۔ ان کی روز مرہ زندگی کسی ایک کیفیت میں نہیں، کیفیتوں میں بسر ہوتی ہے۔ صبح کو گیتا کا پاٹھ ہو رہا تھا۔ دوپہر کو "شمع" کے معمے حل کر رہے ہیں۔ شام کو کرسٹوفر کاڈویل کی کتاب "خواب اور حقیقت" زیرِ بحث ہے۔ رات کو پیتے جاتے ہیں اور جوش کی تنگ دامانی کا ماجرا سناتے جاتے ہیں، کچھ سوئے، پھر جاگ پڑے۔ اور صبح ہونے سے پہلے ؎

چھلکی چھلکی صبح جی ہو رہا نسیم　　فطرت کی وہ پچھلی رات اعضا شکنی

• فراق صاحب " یہ آپ اعضا شکنی اور موت کا ذکر اس قدر کیوں کرتے ہیں، کوئی زندگی بھری چیز سنائیے!"

"آپ کو کوشش بھی ہے، موت زندگی سے بڑی حقیقت ہے۔"

"یہ آپ فرما رہے ہیں؟"

"جی حضور میں فرما رہا ہوں جس نے فرمایا ہے ؎

موت کا بھی علاج ہو شاید — زندگی کا کوئی علاج نہیں

"تو پھر زندگی کا علاج کیجیے۔ موت کو بیچ میں کیوں لاتے ہیں؟"

"جناب موت ایسی بے رحم طاقت ہے کہ میاں لینن کو بھی آ جاتی ہے۔ اور ان کی ہڈیوں کا بھی فاسفورس نکال دیتی ہے۔"

"مگر یہ آپ شعر سناتے سناتے لینن کے مقبرے پر کیوں جا پہونچے؟"

"جی ہاں —— اس لئے کہ جب کسی کو گالی دی جاتی ہے تو اس کے ماں باپ کو تو بیچ میں ڈالتے ہیں۔ کوئی ماں باپ سے دشمنی تھوڑی ہوتی ہے! اور لینن کا تو میں بھی احترام کرتا ہوں۔"

فراق کی تحریروں اور تقریروں میں جو ترنم آنچ کے ساتھ کسی تیز رنگ جیسی بے باکی کا لہجہ ملتا ہے، وہ ان کی شخصیت کا جزوِ اعظم ہے۔ ان کی سلگتی ہوئی شخصیت، جو حسن کے مادی اور روحانی تصورات کی جستجو، نشاط و غم کے اندرونی ربط کے شدید احساس اور موت و حیات کے رموز کی گہرآلود وادیوں میں پروان چڑھی ہے، اپنے اظہار کے سانچے ساتھ لے کر ابھرتی ہے۔ نقوش کے ایڈیٹر کے نام (۱۹۵۳-۵۴ء) میں جو خطوط انھوں نے اپنی خواہشوں، عادتوں اور کیفیتوں کے بارے میں لکھے تھے۔ ان میں زندگی کے ایک کوڑ کے لئے جو میڈیکل وجہ جواز دے کر فراق نے ایک ذاتی مجبوری کو سماجی منظر میں تبدیل کر دیا اور ستوڑہ سے لے کر تیز رنگ کو اپنی صف میں کھینچ لائے۔ تو ہم میں سے بعض لوگوں نے بہت منھ بنایا۔ ہماری طرف سے کچھ بدزبانی بھی ہوگئی۔ اور فراق بہت دنوں دم بخود رہے۔ پھر خود ہنس پڑے۔

وہ سوکھی لکڑی نہیں ہیں جو ہوا کے جھونکوں میں بھڑک کر راکھ ہو جائیں۔ سلگنا اور ہوا کی زد پر شرارے اڑانا انھیں ایسا آتا ہے کہ باید و شاید۔ سلگنے میں ایک سنجیدگی ہے اور شراروں میں بے رحمی و بے باکی۔

ان کا کیسا بھرپور پورٹریٹ بنے اگر کوئی فراق کے اس شعر کو مصوّر کر دے ؎

لئے تھے ہنستے کھیلتے میخانے میں فراق — جب پی چکے شراب تو سنجیدہ ہو گئے

سنجیدگی ان کی فطرت ہے، اور ہنسنا کھیلنا ان کا اوڑھنا بچھونا۔ ہنسنے کھیلنے کو انھوں نے لطیفہ گوئی کی حد تک پسند عام کی چیز بنا دیا ہے۔ اپنے اوپر ہنس لینا بڑے ظرف کا کام ہے۔ اور اس سے زیادہ جان لیوا شغل ہے۔ اپنے اوپر ہنسانا۔ فراق نے فطرت کی سنجیدگی اور شب تنہائی کی عشاشکنی کا لوہا اپنے تجربے سے نکالا ہے یا کہیں اور سے ڈھونڈ پایا ہے، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ تاہم وہ صفت جو ان کے مزاج کا مخصوص پہلو نظر آتی ہے اسی طرح کا حربہ ہے جیسے خیام کی رباعیاں اس کی فلسفیانہ شخصیت کیلئے

اہلِ مذہب کے لئے وہ پکار جس قدر اپنے فلسفے کی بے باکی سے مردود تھا اتنا ہی وہ اپنی رباعیوں کی سرمستی سے مقبول ہو گیا۔
ویت نام کی جنگ ہو یا امریکہ کی صدارت کا الکشن، چین میں ایٹمی بم کے تجربے ہوں یا انیم 238 کا استعمال ہو یا پڑوس کی کوٹھی میں چولی کی کھلکاریاں اور اپنے احاطے میں آملہ کے نوجوان پیڑ کی فصل، وہ ان سب کے بارے میں یکساں طور پر سنجیدہ ہیں اپنے گرد و پیش سے اس قدر باخبر رہنے کی اور باخبر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اُن کے شہر میں اکثر رکشا والے سڑک کا نام نہیں جانتے لیکن ان کا گھر پہچانتے ہیں۔ پچھلے چھ سو برس کے دوران اردو کے لکھنے والوں میں شاید ایسے نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں۔ جو اپنے گرد و پیش کی معمولی زندگی میں اس قدر پیوست رہے ہوں۔
محض اس پہلو سے دیکھئے تو فراقؔ بھی میرؔ، غالبؔ، اور اقبالؔ کی صف کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ حسن عسکری نے جرمن عالمِ نفسیات، حیجیات ولہلم رائخ کے نظریہ" اور گون " کے مطالعہ کے ضمن میں یہ اشارہ کیا ہے کہ" اور گون کا جیسا ادراک فراقؔ صاحب کو حاصل ہے۔ وہ کسی دوسرے اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ یعنی وہ اپنے اور باقی کائنات کے درمیان کا پردہ اٹھا دیتے ہیں!
" فراقؔ صاحب آپ کی شاعری ایک طرف، مجھے آپ کی باتیں بھی بڑی خیال انگیز معلوم ہوتی ہیں۔"
" ہاں، تو میری حیثیت ایک ناقد کی ہے۔ اور سنیئے حضور، شاعری کا معاملہ یہ ہے کہ وہ تاج محل بھی ہوتی ہے، جامع مسجد بھی، اور اعلا درجے کی حویلی بھی۔ آپ بڑی چونکا دینے والی شاعری کو ایڈ مائر کر سکتے ہیں۔ واہ وا، لیکن اس میں رہ بس نہیں سکتے۔ میں تو اپنے وجود کے معمولی پن پہ نازاں ہوں۔ بلند پایہ شعراء کا کلام بیشتر تاج محل یا جامع مسجد ہے۔ لال قلعہ کہہ لیجئے۔ ان کی عظمت کا احساس ہوتا ہے دیکھ کر۔ میری خواہش ہے کہ میرے یہاں عظمت کے بجائے قربت کا احساس ملے، اپنا پن محسوس ہو آدمی کو۔
ان کی شاعری میں بعض اوقات اوزان کا اضطراب اور الکھڑا ہوا لہجہ قربت کے احساس میں حائل ہو جاتا ہے۔ ان کی شخصیت میں وہ بھی حائل نہیں ہوتا۔ انجمن آرائی کا سلیقہ ان کو خوب ہے کہ جس محفل میں ہوتے ہیں خود کو ہجوم میں گم کئے بغیر اپنے پن میں فرق نہیں آنے دیتے۔ اپنی سج دھج سے، آنکھوں اور انگلیوں کے سرگم سے، کٹیلے جملوں سے، چھیڑ خانی سے، کھکلاہٹ سے ورنہ بے نیازی برت کر کچھ ایسی سچوا سے شن پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کا وجود بہ یک وقت بہت معمولی، بہت مانوس اور سب سے اہم اور ممتاز نظر آنے لگتا ہے۔ میری عمر کے لوگ ایسے کئی حادثوں کی گواہی دیں گے۔
فراقؔ کی شخصیت "معمولی پن" پر زور دے کر معمولی کا ایک حصہ بننے پر آمادہ نہیں، تحریر سے، تقریر سے، باتوں اور گھاتوں سے وہ اپنے وجود کی لو اونچی رکھتے ہیں۔ اور زندگی کی کسی بھی زیر زمیں لرزش سے بے خبر رہنا پسند نہیں کرتے۔ اس پر اُن کی اپنی رائے ہوتی ہے۔ اور عموماً اس رائے میں اور بہت سی رایوں کے اتنے سارے سلسلے آکر جڑ جاتے ہیں کہ کوئی لیبل اُن پر پوری طرح چپکنے نہیں پاتا۔ ایک ہی لمحے میں وہ نئے اور پرانے کے سنگم پر حاوی ہوتے ہیں ؎

آج دو جگ مل رہے ہیں کانپتی ہیں پے بہ پے
باس کی پرچھائیوں کو دوڈ کی پرچھائیاں

کہیں یہی تو نہیں ہے فراق کے ذہن اور فن کا پادربا ذس ؟

• رگھوپتی.........

"تم کو یاد ہوگا تم نے کبھی انگریزی میں غالب پر جو مضمون لکھا تھا اس میں غالب کو چند حیثیتوں سے شیلی کا مشابہ ٹھہرایا تھا۔"

• غالب اصل کیفیات اور حالات سے اتنا دور اور غیر متعلق رہتے ہیں کہ ان پر تحلیلی تبصرہ کر سکیں اسی لئے ان کے وہاں ہر بات ایک مطالعہ (روما نٹک) ہو جاتی ہے۔ تاثر وغیرہ کو اس کی مہلت نہیں۔ وہ انہی حالات اور کیفیات میں کچھ اس طرح مبتلا اور کھوئے ہوئے ہیں کہ جو کچھ ان پر گذرتی ہے اس کو وہ بے ساختہ اور بے کم و کاست بیان کر دینے پر مجبور ہوتے ہیں......"

• ....تم اردو شاعری کی ہر بحث میں آتش کو کھینچ لاتے ہو اور ان کو بڑھا چڑھا دیتے ہو.......

"رگھوپتی، آتش کے کلام میں ایک مستانہ پن میں مانتا ہوں جو درد کے وہاں نہیں۔ مگر حافظ کے وہاں ہے۔ لیکن پھر بھی وہ لکھنؤ کے رنگ میں کافی رنگے ہوئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ انھوں نے اسی رنگ میں ایک نرالا بانکپن بھی نکال لیا ہے۔
ایک بات اور یاد رکھو، ان کا ہر جذبہ اور ہر کیفیت جس کو وہ شعر میں بیان کرتے ہیں، دوری رفت فنا اور آنی معلوم ہوتی ہے۔ ان کی کوئی حالت مسلسل اور دیرپا نہیں ہوتی —— چنانچہ وہ ایک استغراقی حال میں ایک بات کہہ کر بہت جلد ہوش میں آ جاتے ہیں اور پھر ان سے اتنی بلند یا گہری بات نہیں نکلتی......

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ آتش کے کلام میں جیسی تکلیف دہ ناہمواری ہے کسی اردو شاعر کے کلام میں نہیں ہے۔ اور تو اور ان کے مصرعے بھی عموماً ناہموار ہوتے ہیں........"

گورکھپور میں، فراق اور مجنوں کی یہ خط و کتابت اگرچہ تمام تر چاندپوری کی شاعری سے متعلق ہے۔ لیکن نادانستہ ایسا نکتہ آ گیا ہے جس سے فراق کی شخصیت کو اور پھر اسی کے ساتھ ان کی تمام تحریروں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ فراق بار بار آتش کو بحث میں کیوں کھینچ لاتے ہیں؟ انھیں کیوں بڑھا چڑھا دیتے ہیں؟ یہ اتفاقی امر نہیں ہے۔ آتش کے وجود میں فراق کو اپنی پرچھائیں بھی چلتی پھرتی نظر آتی ہے —— زمانے اور افکار کے فرق کے ساتھ۔

فراق کی شخصیت میں ایک بانکپن اور ان کا مخصوص لہجہ ایسی شے ہے جس کے بغیر نہ تو ان کا تصور مکمل ہوتا ہے نہ ان کا شعر صحیح طور سے ادا ہو پاتا ہے۔ وہ کسی ایک کیفیت میں نہ تو ٹکے رہتے ہیں نہ اس میں ڈوب جاتے ہیں۔ وہ "بہت جلد ہوش میں آ جاتے ہیں"

فن پارے اور فنکار کا اندازہ کرنے میں رد و قبول میں فراق کو جو دور رس عقابی نظر میسر ہے، افسوس کہ وہ انھوں نے خود اپنے اوپر بے دردی سے نہیں آزمائی۔ غالب نے عمر کی چالیس برساتیں دیکھ کر پہلے تو خود فیصلہ کیا کہ اپنے کلام

کا سختی سے انتخاب کیا جائے۔ اور اق یک قلم چاک کیے، اور پھر اپنے سخن فہم دوستوں سے کلام کا انتخاب کرایا، تب جاکے اسّنداللہ کا وہ دیوان زادہ تیار ہوا جسے ہم عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں، بڑا جگر چاہیے اپنے لختِ دل پر قلم پھیرنے کو۔

فراق کے ایسے اشعار کا، جن پر ان کی شخصیت کی مہر لگی ہوئی ہے، انتخاب ان کی آنکھوں کے سامنے ہو جائے تو وہ نقد ادب میں ہمارے زمانے کے سب سے مقبول اردو شاعر فیض احمد فیض کے مجموعی کلام سے کم نہ نکلیں گے [1]

میں خوش عقیدگی سے نہیں بلکہ جہاں دیکھ کر یہ بات کہہ رہا ہوں، اور اگر ان کی باتیں انٹرویو، آنا کے [2] اور مضامین یکجا کر دیے جائیں تو وہ الگ سے ان کے اشعار کی تفسیر ہمارے عہد کے بہترین انشائیے اور تنقیدی مضامین کا مقام پائیں گے اور اگلی نسل میں ہماری خوب صورت جاندار نثر کی چاشنی عام کریں گے۔

فراق میں، جنھوں نے سوبات کی ایک بات "عشق توفیق ہے گناہ نہیں" کہی اور برتی۔ دراصل ڈاکٹر جانسن اور اسکروائلڈ کی شخصیت یک جا نظر آتی ہے۔ پھر اوپر سے اردو کا ایک ایسا شاعر جو اتش کی صف میں نچلا بیٹھنے کو تیار نہیں اور غالب سے آنکھ ملاتے شرماتا نہیں۔

میں تو فراق صاحب کی شاعرانہ شخصیت کی کچھ جھلکیاں دکھانے چلا تھا۔ یہ ایک لمبا چوڑا مضمون ہو گیا۔ قلم تھام کر جب میں نے اول سے آخر تک پڑھا تو پتہ چلا کہ کچھ بات نہیں بنی۔ آسان نہیں ہے فراق کی رنگا رنگ "نہایت پست و نہایت بلند" کیفیتوں کا ایک ہلکے پھلکے مضمون میں احاطہ کر لینا البتہ ان کی خوشی ناخوشی سے ذرا بے نیاز ہو کر آسنا چاہا دوں، اب جب کہ وہ تھک تھکا کر

زندگی، زندگی کہاں ہے میاں آدمی، آدمی کہاں ہے میاں

قسم کی طول طویل غزلیں اور غزلوں کے ساتھ اڈیٹر کے نام چٹھی پتری چھپوانے تک اتر آئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہے ان کی تمام تحریروں کے کڑے انتخاب کا۔ وہ انتخاب بہرحال مجموعوں پر وزنی مجموعوں پر بھاری نکلے گا۔ اور ایک زمانے تک دورِ حاضر میں ہماری زبان کی آبرو کہلائے گا۔

فراق کی تمام تحریروں کا انتخاب —— یک جا ہوگا تو ان کے لطیفے، تقریروں اور بیانوں کے جملے بھی ان کا ایک لازمی حصہ ہوں گے۔ اور فراق کی شخصیت کو ہر پہلو سے اور ہر رنگ سے زندہ، توانا اور تازہ دم رکھیں گے۔ وہ نہ یہ شعر ؎

ہزار بار زمانہ ادھر سے گذرا ہے
نئی نئی سی ہے کچھ تیری رہگذر پھر بھی

[1] اس قسم کا تقابل گمراہ کن ہے

[2] ہم اس لفظ سے ناواقف ہیں

۲ راہی معصوم رضا

شخصیتوں کا مطالعہ اور تجزیہ کرنا ماہرین نفسیات کا کام ہے۔ عام آدمی تو صرف غیر سائنسی نتائج اخذ کر سکتا ہے۔ میں بہت منکسر المزاج نہیں ہوں کہ یہ تمہیدی اعتراف خاک ساری سمجھ لیا جائے۔ میں ان دشواریوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں جو جعفری صاحب سے وعدہ کر لینے کی وجہ سے میری تقدیر ہو گئی ہیں۔

فراق صاحب سے دس بیس یا سو سوا سو بار ملا ہوں۔ ان کا کلام پڑھا بھی ہے۔ اور سُنا بھی ہے۔ ان کے بارے میں رائے بھی قائم کی ہے۔ لیکن کسی جیتی جاگتی شخصیت کے بارے میں اظہار خیال جان جوکھم کا کام ہے۔ یہ کام میرے لئے خاص طور پر بہت دشوار ہے۔ کیوں کہ اپنی لاعلمی یا کم علمی کی بنا پر میں ایک شخصیت کا قائل نہیں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدمی میں بہ یک وقت کئی آدمی زندہ ہوتے ہیں۔ اور یہ کئی آدمی ہر وقت متصادم رہتے ہیں۔ ان کئی شخصیتوں میں جو شخصیت غالب نظر آتی ہے وہی اس آدمی کی شخصیت کہی جانے لگتی ہے۔ فنی شخصیت کو میں اکتسابی شخصیت کہتا ہوں۔ یہ شخصیت مختلف شخصیتوں کے تصادم کا نتیجہ یا تجربہ ہے۔ یعنی میرے نزدیک فرد ایک ناقابل تقسیم وحدت نہیں ہے۔ لیکن ایک فرد کی مختلف شخصیتوں کو خانے کھینچ کر الگ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ دیومالائی اور داستانی ادب میں ہیرو اور رقیب کے جو کردار ملتے ہیں انہیں Type کہنا صحیح نہیں ہے۔ دیومالا اور داستانوں کے خالقوں نے آدمی کے فاضل عناصر تراش کر الگ کر دیئے ہیں۔ ان کے سامنے صرف خیر اور شر کا مسئلہ تھا۔ اس لئے انہوں نے آدمی کو بیچ سے چیر ڈالا۔ ایک ہیرو ہو گیا دوسرا رقیب، آدمی کے چیلنج کو ناول نے قبول کیا۔ ناول نگاروں نے پورے آدمی کو اپنا موضوع بنایا۔ لیکن ابھی تک ناول نگار بھی ایک آدمی کی تمام شخصیتوں کا احاطہ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ اسی لئے میں یہ سوچ رہا ہوں کہ جب ناول میں انسان کی شخصیت کی تہیں ابھی تک نہیں کھولی جا سکی ہیں۔ تو پھر میں فراق جیسی نادر شخصیت کا اظہار کیسے کروں۔ صرف ایک صورت ہو سکتی ہے کہ میں ان کی شخصیت نہ لکھوں۔ بلکہ ان کی شخصیت کے بارے میں کچھ لکھنے کی کوشش کروں۔

رگھوپتی سہائے کو تو میں جانتا ہی نہیں۔ رگھوپتی سہائے پر تو مجنوں صاحب یا رگھوپتی سہائے کا کوئی اتنا ہی قریبی دوست لکھ سکتا ہے۔ لیکن دقّت یہ ہے کہ فراق گورکھپوری پر رگھوپتی سہائے اپنی تمام شخصیتوں سمیت سایہ ڈالتا رہتا ہے۔ یہ رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا۔ یہ ایک مسلسل تصادم ہے۔ فراق گورکھپوری اس رگھوپتی سہائے کی ضد ہے۔ جو کچھ رگھوپتی سہائے کے پاس نہیں ہے وہ فراق کے پاس ہے۔ اسی لئے رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری سے جلتا ہے۔ اور اسی لئے فراق ہر وقت چوکنا رہتے ہیں۔

رگھوپتی سہائے ایک مجمع کا نام ہے۔ وہ ایک بدصورت بیوی کے شوہر ہیں۔ (یا شاید تھے) وہ ایک بیٹے کے باپ ہیں۔ جسے وہ نیم پاگل بتلاتے ہیں۔ اور جس نے خودکشی کر لی۔ وہ انگریزی ادب کے استاد ہیں (تھے) وہ ہندو ہیں۔ وہ

ہندوستانی ہیں۔ اور وہ اردو کے شاعر ہیں وغیرہ وغیرہ
میں نے ایک بدصورت بیوی کے شوہر کو جان بوجھ کر سرِ فہرست رکھا ہے۔ یہ ناآسودہ حسن پرست شوہر ان کی شاعری کا سب سے اہم محرک ہے پہلے انہیں کی زبانی چند باتیں سن لیجئے۔ لکھتے ہیں۔

" مجھے اور میرے پورے خاندان کو دھوکا دیکر ایک صاحب نے میری شادی ایک ایسے خاندان میں اور ایک ایسی لڑکی سے کرادی کہ میری زندگی ایک ناقابل برداشت عذاب بن گئی۔ میری بیوی میں کوئی اخلاقی عیب نہیں تھا۔ لیکن معمولی سے معمولی انسان سے بھی یہ لڑکی کند ذہن اور نااہل تھی۔ صورت میں کوئی کشش نہیں تھی۔ بلکہ الٹے ناپسندیدگی کا اثر پڑتا تھا۔۔۔۔۔ تب سے آج تک میری زندگی ایک ناقابل برداشت تکلیف اور تنہائی کا شکار رہی۔ پورے ایک سال شادی کے بعد مجھے نیند نہیں آئی۔" (شاہ کار۔ فراق نمبر ص ۳۶۱)

کہا جا سکتا ہے کہ دھوکا دیکر نہ معلوم کتنے لوگوں نے کتنے لوگوں کے سر بدصورت لڑکیاں منڈھی ہوں گی لیکن ایسے تمام لوگ فراق گورکھپوری نہیں بن جاتے۔ کچھ دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ کچھ بازاری خاتونوں کی سیر میں لگ جاتے ہیں اور کچھ نسل کشی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ایسوں میں سے ایک آدمی فراق گورکھپوری ہو گیا۔ تو کیا شاعر بننے کے شوقین حضرات بدصورت لڑکیوں سے شادی کرنا شروع کر دیں؟ میرے خیال میں تو یہ ضروری نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی ایک تصادم ہے۔ اس ناآسودگی کے جواب میں فراق نے تخلیق حسن کا کام شروع کیا۔ فراق کی شاعری میں حسن کے جو جیتے جاگتے نمونے ہیں۔ ان کی بنیاد یہی ناآسودگی ہے۔ لیکن جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں۔ رگھوپتی سہائے فراق کا پنڈ نہیں چھوڑتا۔ ہم نے ابھی دیکھا کہ فراق کی شاعری میں تنہائی کا جو درد اور تخلیق حسن کی جو امنگ ہے اس کی بنیاد ان کی بیوی کی بدصورتی اور ازدواجی زندگی کی تکلیف دہ ناکامیابی ہے۔ لیکن بات یہیں ختم نہیں ہوتی۔ یہ بدصورت بیوی ایک اور حیرت انگیز کارنامہ انجام دے گئی ہے۔ فراق صاحب ہی کا کہنا ہے کہ:

" ذہنی اور دلی کرب اور ازدواجی زندگی سے بیزاری کی وجہ سے آئی، سی، ایس، اور پی سی ایس دونوں عہدوں سے استعفیٰ دیکر مہاتما گاندھی کی رہبری میں جنگ آزادی میں شریک ہو گیا"

(شاہ کار فراق نمبر ص ۳۶۴)

اگر یہ خود فراق صاحب ہی کا قول نہ ہوتا تو میں اسے کہنے والے کی نامعقولیت پر محمول کرتا۔ لیکن فراق صاحب کو کیسے جھٹلا دوں! فراق صاحب نے ازدواجی زندگی سے بھاگنے کے لئے گاندھی جی کی رہنمائی میں جنگ آزادی میں شرکت کی! جنگ آزادی میں ان کی شرکت وطن پرستی کی وجہ سے نہیں ہوئی۔ انہیں اس خیال نے بھی نہیں اکسایا کہ آزادی انسان کا بنیادی حق ہے وہ تو بیوی کی بدصورتی سے بچنے کے لئے اس آگ میں پھاند پڑے تھے۔ تو اب ان سے یہ شکایت کیا کی جائے کہ ان کی شاعری

اس جنگ میں حصہ کیوں نہیں لیا۔ کیوں کہ اگر ان کی بیوی خوبصورت رہی ہوتیں۔ تو وہ کلکٹر و لکٹر بن کر گاندھی جی کے چیلوں پر لاٹھی چارج کروا رہے ہوتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ ان کی بیوی بدصورت تھیں چنانچہ بیوی سے بھاگ کر ایک طرف تو وہ کانگریسی ہو گئے۔ اور دوسری طرف شاعر، کانگریس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں لیکن اردو ادب ان کی بیوی کی بدصورتی کا ممنون ہے۔

یہ بات میں نے اس لئے چھیڑی کہ مجھے فراق صاحب کے یہاں فنکارانہ خلوص کی کمی کا احساس شدت سے ہوتا ہے۔ ان کے پاس اپنی آسودگی کے سوا کوئی اور پیمانہ یا قدر نہیں ہے۔ جس اردو کے بیشتر شاعر نیم فاقہ کشی کے عالم میں زندگی بسر کر گئے اسی اردو کے فراق گورکھپوری کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ :

" اب تو کچھ اردو رسالے بھی معاوضہ دیتے ہیں اس لئے اپنی غزلوں اور اردو نثر کے مضامین سے بھی میں دوسرے ادیبوں کے مقابلے میں کافی زیادہ کما لیتا ہوں ! "

(شاہکار فراق نمبر ص ۴۷)

آپ کما ہی لیتے ہیں خاک ! آپ کی زندگی بھر کی کمائی حسرت ہے پوری یا ساحر لدھیانوی کی سال بھر کی کمائی سے کم ہوگی ۔"

قصہ یہ ہے کہ فراق صاحب کو اپنے آپ سے بے پناہ محبت ہے۔ اور وہ کسی معاملہ میں اپنے آپ کو کسی اور سے کمتر ماننے پر تیار نہیں ہیں۔ یہی ان کی شخصیت کی ٹریجڈی ہے۔ ان کا مطالبہ یہ ہے کہ انہیں سب سے بڑا شاعر تو خیر مانا ہی جائے، لیکن کسی اور کی بڑائی کا ذکر بھی نہ کیا جائے۔ اگر بڑائی کا ذکر بھی کرنا ہو تو یوں کہ ہر بہت بڑے شاعر تھے۔ مگر فراق صاحب ان سے بیس ہیں۔ اسے خود اعتمادی کی کمی ہی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی صوبائی کانفرنس میں جب ڈاکٹر رام بلاس شرما نے اپنی نہایت بورنگ رپورٹ پیش کی تو کئی لوگ باہر نکل آئے۔ باہر نکل آنے والوں میں جعفری صاحب بھی تھے۔ اور رضیہ آپا بھی پرکاش چندر گپت اور بھیرو جی شاید ہم ہی لوگوں کے ساتھ تھے۔ ایک ٹی اسٹال پر ہم لوگ چائے پینے لگے۔ نہ معلوم کس طرح اہم شاعروں کی بات نکل آئی۔ جعفری صاحب نے ابھی جوش اور شاید فیض ہی کا نام لیا تھا کہ فراق صاحب بیچ میں بول پڑے۔

" کا بھائی کا ہم جگر دسے بڑے شاعر نا ہیں ! "

سب نے انھیں یقین دلایا کہ وہ جگر صاحب سے بہت بڑے ہیں تو وہ کم عمر بچوں کی طرح خوش ہو گئے۔ وہ مطمئن ہو گئے فراق جیسے اہم شاعر کو یہ باتیں زیب نہیں دیتیں۔ مگر جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ وہ رگھوپتی سہائے سے ہر وقت ہو کنار رہتے ہیں آپ انہیں کسی مشاعرہ میں دیکھیے۔ وہ دوسرے شاعروں کے شعر نہیں سنتے۔ بلکہ جب کوئی اور شعر سنا رہا ہوتا ہے۔ تو فراق صاحب ٹیڑھے سیدھے منہ بناتے رہتے ہیں۔ یا اس پر جملہ بازی کرتے رہتے ہیں۔ وہ سارے مجمع کو مخاطب کئے رہتے ہیں تاکہ مجمع کسی اور کو نہ سن سکے۔ اور جب خود شعر سنانے آتے ہیں تو ٹھنک کر بات " سے آغاز کرتے ہیں۔ فراق سے کمتر درجہ

کا شاعر بیٹھ کر شعر سنانا شروع کر دے تو ہوٹ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ فراق صاحب نہایت عمدہ قسم کے بیٹھ کر شعر سناتے ہیں۔ لیکن ایسے میں انہیں ذرا بھی یہ خیال آجاتا ہے کہ مجمع پر ان کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے۔ تو وہ لطیفہ بازی اور جملے بازی کے ٹکڑے لگانے لگتے ہیں، آدھ پون گھنٹے کے بعد غزل شروع کرتے ہیں۔ دو شعر سنانے کے بعد اگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ غزل مقبول نہیں ہو رہی ہے۔ تو نہایت پھرتی سے پینترہ بدل کر پھر بیٹھ کر اشعار یا "روپ" کی رباعیوں پر آجاتے ہیں۔ انہیں یہ گوارہ نہیں کہ کوئی یہ کہے کہ فراق صاحب فلاں مشاعرہ میں نہیں چلے۔ وہ سکۂ رائج الوقت بنے رہنا چاہتے ہیں۔ اپنی یہ حیثیت برقرار رکھنے کے لئے وہ اپنے آپ کو ڈی ویلو کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں۔

رگھوپتی سہائے فراق سے جلتا بھی ہے۔ لیکن فراق سے چمٹا بھی رہتا ہے۔ کیوں کہ فراق ہی اس کی پونجی ہیں۔ چنانچہ کئی برس پہلے بنے بھائی کے یہاں لکھنؤ میں شام کے وقت کچھ لوگ اکٹھا ہوئے۔ فراق صاحب، مخدوم محی الدین نیاز حیدر اور میں، فراق صاحب کمیونسٹوں سے خفا تھے۔ اور تقریر کر رہے تھے بنے بھائی اور مخدوم محی الدین نہایت سنجیدگی سے انہیں یہ بتلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین نے بڑے بڑے کام کئے ہیں۔ میں اس بحث سے دور آنگن کے دوسرے گوشہ میں رضیہ آپا سے گپ لڑا رہا تھا۔ میں نے رضیہ آپا سے کہا کہ رہیئے میں اس جھگڑے کو طے کرواتا ہوں۔ چنانچہ میں بھی وہیں چلا گیا۔ میں نے فراق صاحب سے پوچھا آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ بولے! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کیا کمیونسٹ کوئی شکسپیر پیدا کر سکے؟ میں نے کہا، نہیں۔ بولے، ورڈز ورتھ؟ میں نے کہا نہیں! بولے کوئی ٹے نی سن؟ میں نے کہا ہر گز نہیں۔ اس کی داڑھی بہت بھیانک تھی۔ مگر انجمن ترقی پسند مصنفین نے ایک فراق گورکھپوری کو پیدا کیا۔ فراق صاحب کی آنکھیں ناچ گئیں۔ غصہ ختم ہو گیا۔ بولے ہاں اس بات پر میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ بحث ختم ہو گئی اور فراق صاحب نے دیر تک نہایت عمدہ شعر سنائے۔ یہ نسخہ میں بار بار استعمال کرتا ہوں۔ اور ہر بار کامیاب ہوتا ہوں۔

اور میں یہ بات تفریحاً نہیں کرتا۔ فراق صاحب کی شاعری کا میں سختی سے قائل ہوں۔ میری ہی طرح اور نہ معلوم کتنے ہزار یا لاکھ لوگ فراق صاحب کی شاعری کے قائل ہیں۔ لیکن فراق صاحب خود اپنی شاعری پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ اسی لئے جب کوئی ان سے کہتا ہے کہ وہ اچھے یا بڑے شاعر ہیں تو فراق صاحب اس خیال سے خوش ہو جاتے ہیں کہ چلو ایک ہم خیال ملا حالانکہ ان کے ہزاروں ہمخیال ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی شاعری پر مضمون لکھ کر اسے دوسروں کے نام سے چھپوانے میں بھی نہیں ہچکچاتے، اب انہیں کوئی اس بات کا یقین کیسے دلائے کہ وہ ان سب کے باوجود بڑے شاعر ہیں۔ اردو ہندی جھگڑے میں وہ عجیب عجیب سوانگ بھر چکے ہیں۔ تفصیلات میں جانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ایک دو برس پہلے انہوں نے اردو والوں پر یہ الزام لگایا کہ ان میں سنسکرت آگاہی نہیں ہے۔ وہ اس کا جواب نہیں دے پاتے کہ سنسکرت آگاہی کیوں اور کیسے چل کر وادی سندھ کی تہذیب ملتی ہے۔ مگر فراق صاحب کو باتیں کرنے اور اپنی آواز سننے کا شوق ہے۔ اور جب آدمی مستقل بولتا رہے گا تو چاہے وہ فراق گورکھپوری ہی کیوں نہ ہو کبھی کبھار بے معنی باتیں بھی ضرور کرے گا۔ بنگلہ میں

انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے ایک جلسہ کی صدارتی تقریر میں جھونک میں یہ بھی کہہ گئے کہ جب کوئی میرے سامنے ہندی کا نام لیتا ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اس نے میری بوڑھی ماں کو گالی دی ہو کسی زبان کے بارے میں خیال کی یہ سطح حیرت انگیز ہے۔ یہاں ہی جس طرح وہ ہندی شاعری کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں۔ وہ اردو دوستی سے زیادہ چڑ فراق پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ ہندی شاعری کا مذاق اڑانے سے اردو شاعری قابلِ احترام نہیں ہو جائیگی۔ فراق صاحب کی ایک اسی قسم کی تقریر کے بیچ میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ ہندی کے اساتذہ اور ہندی کے کئی نام ور ادیبوں کو جلسے سے اٹھ جانا پڑا تھا۔ اور بعد میں لیپ پوت کرنے میں اعجاز صاحب کو جو دشواریاں جھیلنی پڑیں وہ اعجاز صاحب ہی جانتے ہیں

لیکن ان تمام چھوٹی چھوٹی باتوں کے باوجود فراق صاحب ہمارے محبوب شاعر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان گھٹیا باتوں سے پاک ہے۔ ان کی شاعری رگھوپتی سہائے کی ضد ہے۔ اسی لئے ان کے شعر سنتے یا پڑھتے وقت ہم رگھوپتی سہائے کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ انہیں کا شعر ہے۔

دکھا تو دیتی ہے بہتر حیات کے سپنے
خراب ہو کے بھی یہ زندگی خراب نہیں

یہ شعر فراق صاحب پر منطبق ہوتا ہے۔ ان کے فن کی دنیا میں جا کر ہم ان کی انفرادی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان کو پیغمبر تو مانتا نہیں کہ ان کی ذاتی زندگی کا احتساب کیا جائے۔ رگھوپتی سہائے کیسا آدمی ہے اس سے ہمیں غرض نہیں۔ لیکن فراق گورکھپوری اچھا شاعر ہے۔ اور کوئی اچھا شاعر بڑی مشکل سے ہوتا ہے۔ میں یہ ہرگز عرض کرنا نہیں چاہتا کہ اچھے شاعر کو من مانی کرنے کا حق ہے۔ ہرگز نہیں۔ وہ سماج کا ایک حصہ ہے۔ اور سماج کے سامنے جوابدہ ہے۔ لیکن فقط اس لئے کہ وہ فرشتہ نہیں ہے۔ ہم اس کی شاعرانہ عظمت سے انکار نہیں کر سکتے

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں!
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں!

فراق صاحب کی شاعری بھی اپنی منفرد شخصیت کی وجہ سے دور سے پہچان لی جا سکتی ہے۔ لیکن دقت یہ ہے کہ رگھوپتی سہائے اتنی دھول اڑاتا ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں۔ فراق صاحب مشاعروں میں جانا چھوڑ دیں تو ان کے کلام کی آبرو بڑھ جائے کیوں کہ ان کا نرم گھریلو لہجہ ہم پر رعب نہیں ڈالتا بلکہ ہم سے باتیں کرتا ہے۔ ہمیں اپنے دکھ درد بتاتا ہے۔ اور یہ باتیں سن کر ہمارا دکھ درد کم ہو جاتا ہے۔ چونکہ وہ تنہائی کے پرانے مریض ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں خود کلامی کی کیفیت زیادہ ہے۔ لیکن جہاں یہ کیفیت نہیں ہے۔ وہاں بھی وہ انجمن نہیں بناتے، بلکہ اپنے کسی گہرے دوست سے باتیں کرنے لگتے ہیں۔ انفرادی طور پر یہ اثر پڑتا ہے کہ ان کا وہ گہرا دوست وہی ہے۔ اور اس جادوگری کا راز یہ ہے کہ فراق نے احساس کو مہذب بنایا ہے۔

مکتوبِ فراق

پیارے سردار۔

تمہارے خطوط ملتے رہے۔ مجنوں کو میں نے لکھ تو دیا ہے کہ میرے بارے میں، اپنے کسی شاگرد کو بول کر لکھوا دیں اور اُسے تمہارے پاس بھیج دیں۔ تم بھی اِسی مضمون کا ایک خط لکھ کر اُنھیں بھیج دو اور یہ بھی لکھ دو کہ اُن کی تحریر سے رسالے کی قیمت بڑھ جائے گی اور اس سے تمہیں ذاتی خوشی اور کئی لحاظ سے فائدہ پہنچے گا۔ اور ایسا کر کے وہ تم پر احسانِ عظیم کریں گے۔ میرے فن اور شخصیت پر، پروفیسر احتشام حسین، صدر شعبۂ اُردو، الہ آباد یونیورسٹی — (Prof. Ehtisham Hussain — Head of Urdu Department, Allahabad University) بھی بہت اچھا مضمون لکھ سکتے ہیں۔ اُنھیں لکھ کر دو ڈھائی ہزار الفاظ کا مضمون منگوا لو۔

مجھ سے تم کلام کیوں مانگ رہے ہو، دور نہ جاؤ، میری تضمین، جو حال ہی کے رسالوں میں نکلی ہیں، کچھ اُن سے اقتباس کر لو اور بہت سا Matter تو شاہکار کے فراق نمبر سے ہی تم کو مل جائے گا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حیدرآباد میں تمہیں، میری بہت اچھی تصویریں مل گئیں۔ ذرا یہ لکھو کہ گفتگو کا سائز کیا ہوگا اور کتنے صفحات ہر شمارے میں ہوں گے۔ پہلے شمارے میں فراق کے فن اور شخصیت اور انتخابِ کلام پر آخر کتنے صفحات ہوں گے۔

ایک موضوع پر بحث تو ایک زمانے سے ہو رہی ہے لیکن اتنے دنوں کے غور و فکر کے بعد، جو رائے تم نے قائم کی ہے اُسے کم سے کم الفاظ میں، میں جاننا چاہوں گا۔ سماج کو بدل کر بہتر بنانے میں، یا نظام کو بدل دینے میں، یا سماج کے افراد کو صحت مند طریقے پر باعمل بنانے میں، تاریخ بدل دینے میں اور عملی انقلاب پیدا کر دینے میں شاعروں یا ادیبوں کا حصہ زیادہ ہوتا ہے یا political Social، ایسے کارکنوں کا، جو نہ ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور نہ ادب سے اپنے عمل یا کوششوں کے متعلق کچھ سیکھتے ہیں۔ اگر ادب سماج کو نہیں بدلتا اور خارجی طور پر عمل ادب سے متاثر نہیں ہوتا نہ داخلی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ تو ہم ادب کا منصب و مقصد، انقلاب و مقصد انقلاب و تاریخ سازی یا انسان کی عملی زندگی سے بالکل الگ کیوں نہ سمجھیں۔ صرف وجدانی و جمالیاتی محسوسات تک ہم ادب کا دائرہ کیوں نہ محدود رکھیں۔ یا پھر یہ بتاؤ کہ ہومر، ورجل، والمیک، دانتے، گیٹے، شکسپیر، خسرو، نظیری، اقبال، ٹیگور اور قریب قریب تمام مشاہیر ادب کے کارناموں نے تاریخ بدلنے، سماج کی زندگی بدلنے یا انقلاب پیدا کرنے میں آخر کیا حصہ لیا۔ البتہ مشاہیرِ ادب نے وجدان کی جو دولت اور صرف محسوسات کی جو دولت ہمیں دی وہ عمل اور انقلاب کے سورما ہمیں نہیں دے سکتے تھے۔ یعنی دولتِ عمل ہمیں ادب نہیں دے سکتا اور دولتِ ادب عمل یا عامل ہمیں نہیں دے سکتی۔ میرے نزدیک ادب برائے ادب کا مفہوم۔ داغ یا نوح کی شاعری نہیں، بلکہ حافظ یا کیٹس

کی شاعری ضرور ادب برائے ادب ہے۔ اِس فقرے میں برائے ادب کا مفہوم نہ برائے لفاظی ہے نہ برائے چونچلا نگاری ہے نہ برائے مشاعرہ بازی ہے نہ برائے سطحیت ہے بلکہ برائے ادب کے معنی برائے جمالیاتی مہک اور برائے جمالیاتی وجدان ہیں جس کا کوئی تعلق عمل سے نہیں ہے۔ زندگی سے جو محبت بغیر فنون لطیفہ کی مدد کے، انسانوں میں موجود ہے، صرف اس محبت کی بنا پر، لینن انقلاب کرا سکتا ہے۔ لیکن کوئی انقلاب زندگی سے اس محبت کا احساس نہیں کرا سکتا جو ترگنیف کے "باپ اور بیٹے" اور اُس کے دوسرے ناولوں کو پڑھنے سے ہمارے اندر پیدا ہوتی ہے لیکن یہ محبت، جو صرف ادب ہمارے اندر پیدا کرتا ہے، اس لئے ہرگز نہیں ہے کہ اس کا واسطہ دے کر انقلاب پیدا کیا جائے یا سماج کو بدلا جائے۔ ایک معقول اور بے عیب سماج بھی جمالیات اور وجدان کے لحاظ سے، ایک بے حس سماج ہو سکتا ہے، جس طرح ایک نیک سے نیک اور کار آمد سے کار آمد آدمی بھی جمالیاتی اور وجدانی احساس سے بالکل بے بہرہ ہو سکتا ہے۔ رائج ترقی پسندی سے میری یہی لڑائی ہے۔ لینن عمل اور سماج کے لحاظ سے بہتر انسان اور بہتر انسانیت حاصل کرنے میں ہماری بڑی مدد کر سکتا ہے لیکن یہ بہتر انسان اور بہتر انسانیت، بغیر فنونِ لطیفہ کے، جمالیات اور وجدان کی دولت سے محروم بھی رہ سکتی ہے۔ صرف مردِ معقول ہونے سے کام نہیں چلتا۔ اور ترقی پسندی کی دوڑ صرف مردِ معقول تک ہے۔ عملی طور پر میر و غالب کے زمانے میں، میر و غالب سے بہت بہتر انسان موجود تھے لیکن وجدانی و جمالیاتی محسوسات کے لحاظ سے میر و غالب اپنے زمانے کے سب سے بڑے انسان تھے۔ کاش میرے یہ الفاظ، ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے علاوہ، کوئی اور ردِ عمل تمہارے اندر پیدا کر سکیں۔

گھر پر سب کو سلام و دعا۔ بھائی خدا کرے اب سے اختتامِ الیکشن تک کوئی آفت ناگہانی نہ پیدا ہو جائے۔

تمہارا فراق

تین شعر

فضا تبسمِ صبحِ بہار تھی لیکن
پہونچ کے منزلِ جاناں پہ آنکھ بھر آئی

اک جنوں ساماں نگاہِ آشنا کی دیر تھی
اِس بھری محفل میں ہم تنہا نظر آنے لگے

دیکھ رفتارِ انقلاب فراق
کتنی آہستہ اور کتنی تیز

شخصیت

مخدوم محی الدین

زینت ساجدہ

حاضرین جلسہ! واقعہ ایک دن کا یہ ہے کہ میر حسن نامی ایک شخص اردو ہال کے اسٹیج پر صدر بنا بیٹھا تھا۔ کسی شاعر مرحوم کا یوم منایا جا رہا تھا اور تقریروں میں مرحوم کے اوصاف پسندیدہ کے گن گائے جا رہے تھے۔ ایسی عمدہ عمدہ بے شمار باتیں لوگوں نے کہیں کہ اگر بیچارہ مرحوم زندگی میں سن پاتا تو پھولے نہ سماتا۔ زمانہ کی کج ادائی کا شکوہ نہ کرتا۔ بلکہ اس کا بھی امکان تھا کہ وہ سن لیتا کے لوگ اسے کسقدر اچھا سمجھتے ہیں۔ تو سچ مچ اچھا بن جاتا۔ بس خیال ہوا حسن کو کہ اگر زندگی میں ایسی قصیدہ خوانی کی جائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ مارے خوشی کے عمر عزیز کے پانچ سات سال اور بڑھ جائیں۔ پھر یہ بھی کیا بھروسہ ہے کہ ہم جس طرح گذرے ہوؤں کو یاد کرتے ہیں لوگ ہمیں بھی یاد کریں۔ پرانے بادشاہ اسی بے اعتباری کے سبب اپنا مقبرہ جیتے جی ہی تیار کروا لیتے تھے چنانچہ شخص مذکور نے حلقۂ احباب میں یہ بات چھیڑی کہ اس طرح ایک دوسرے کی تعریف و تحسین کی جائے۔ باقاعدہ ایک پروگرام بنے اور آپس میں سب ایکدوسرے کو بھلا کہیں اور سنیں۔ قرعۂ فال مخدوم کے نام نکلا۔ کیونکہ اس کمبخت کے چاہنے والے اس شہر میں بے حساب و بیشمار ہیں۔ ہر طبقے اور ہر گوشے میں پائے جاتے ہیں۔ ہم نے اس سلسلہ کا نام رکھنا چاہا "من ترا حاجی بگویم"

حضرات! چونکہ مخدوم کے چاہنے والے بیرون شہر و دیگر اقطاع ہند میں بھی پائے جاتے ہیں۔ اس لئے خیال ہوا کہ سب کو شرکت کا موقع دیا جائے۔ کیونکہ سب کی آرزو یہی تھی۔ اس لئے سلسلہ زلف کی طرح دراز ہوا اور خدا معلوم کب وہ روز نیک آیا کہ اچانک رمضان شریف آپہونچے۔ اور اس کے بعد مخدوم اپنے ساٹھ سال پورے کر لیتا اس لئے جشن کا اعلان ہوا۔ مخدوم نہ اپنے آپ کو بوڑھا سمجھتا ہے نہ لوگ سمجھنا چاہتے ہیں تو اس لئے عین اس کی جوانی میں اس کا جشن منانا طے پایا۔ کچھ لوگ ایسے بھولے بھالے ہیں جو بڑی خوشی سے ذکر کرتے ہیں اور مبارکباد دیتے ہیں۔ کہ لیجئے مبارک ہو۔ مخدوم ساٹھ سال کا ہو گیا۔ سنا آپ نے ہاں حیرت ہے مگر سچ مانئے یہ سن سن کر مخدوم کے دل پر سانپ لوٹ جاتا ہے۔ خدا جانے کب سے اس نے یہ ٹرک کر رکھی ہے کہ اس کی عمر کا پہیہ الٹا گھوم رہا ہے' ہاں کبھی کبھی کوئی خاتون محترم اپنی جوان بچی کو اس سے ملاتے وقت کہتی ہیں بٹیا مرہ یہ ہمارے ابا کے کلاس میٹ تھے۔ یا کوئی مرد بزرگ

جن کے بالوں میں چاندی جھلملا رہی ہے بڑے خضوع و خشوع سے ہاتھ ملا کر کہتے ہیں آپ نے پہچانا نہیں میں سٹی کالج میں آپ کا طالب علم رہ چکا ہوں۔ تو بیچارے مخدوم کی عجیب حالت ہوتی ہے۔ کیونکہ جب بھی لڑکیاں گروہ در گروہ اس کے سامنے سے گزریں تو مخدوم بشرٹ کا کالر ٹھیک کر لیتا ہے کیونکہ اس معصوم کو ابھی تک یہی خیال ہے کہ وہ سب اسے ہی دیکھ رہی ہیں۔ بات اسے دیکھ کر اتنی عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ خدا معلوم اس نے اور اس کے ساتھیوں نے مصری ممیوں کا کونسا نسخہ استعمال کیا تھا کہ برسوں سے اسے دیکھ رہے ہیں اور جوں کا توں سدابہار۔ میرا خیال ہے کہ ریفریجریٹر اور تھرماس بنانے والی کمپنیاں مخدوم کو بطور اشتہار استعمال کر سکتی ہیں۔ چونکہ بزنس میں نے سمجھائی ہے، فقطی فقطی نہ سہی ۱۵ فی صد رائلٹی کی حقدار ہوں۔

ہر ایک شخص جشن مخدوم میں اس کی قصیدہ خوانی پر تلا ہوا ہے 'سن سن کر جی جلا اور جل بھن کر کباب ہو گیا۔ کیوں نہ جلیں' ویسے بھی مخدوم سے جی جلتا ہے۔ جبلپورہ کے نوابوں سے لے کر چکڑپلی کے مزدوروں تک جس کو دیکھو فیشن سا بنا لیا ہے کہ مخدوم کی محبت میں مرے جا رہے ہیں۔ سال بھر میں وہ ایک ہی غزل یا نظم کیوں نہ کہے' سارا شہر اسے منھ زبانی ایکا پالی یاد کر لیتا ہے' حیدرآبادیوں کی تو خیر مخدوم کمزوری بن گیا ہے۔ افیون کی طرح وہ اس کے عادی ہو گئے ہیں مگر نو وارد آندھرا کے نوسکھ بھی لہرا لہرا کر "منڈیلی کے جیتبوسے تلے" گنگناتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو سیکھ گئے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں نے اس کا دماغ اور بھی خراب کر دیا ہے۔ ایک تو شاعر ہے ویسے ہی اترا تا ہے۔ پھر ان تعریفوں نے تو ناس ہی مار دیا اس کا کریلا اور نیم چڑھا بن گیا۔ اس لئے میرا جی چاہتا ہے کہ سب تعریف کریں' تو میں ہجو گوئی پر اتر آؤں تاکہ تریاق کا کام کرے۔ گھر میں بھی اس کی مخالفت مشکل ہے' چاہنے والے ہر گھر میں جو موجود ہیں۔ اس لئے یہاں زیادہ محفوظ ہوں۔ کیونکہ اسٹیج پر ایک نہیں کئی صدور تشریف فرما ہیں۔ جان و مال کی.. حفاظت کی امید ہے۔

مخدوم اصل میں سخت کمینہ ہے۔ دیکھئے کئی سال ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ ایک غزل لکھ دے تاکہ میں مشاعرے میں پڑھ کر داد وصول کر سکوں' آپ کو تو معلوم ہی ہے شاعروں پر واہ واہ سبحان اللہ مکرر ارشاد' تعریف و تحسین کے ڈونگرے برسائے جاتے ہیں۔ تو پھر جی للچا ہی اٹھتا ہے۔ مخدوم نے فوراً حامی بھر لی کہ تازہ کلام مجھے دیدے گا۔ لیکن حال یہ ہے کہ شعر کا لفظ لفظ جس طرح وارد ہوتا ہے لوگوں کو سنانے لگتا ہے' پاؤ مصرع' آدھا مصرع' پون شعر اور پورا شعر' ہر منزل پر سنایا جاتا ہے اطراف لوگ نظر نہ آئیں تو فون پر سنائے گا۔ فون پر کوئی سننے والا نہ ملے تو لوگوں کے گھر جائے گا۔ روپیہ رہن رکھا کر رکشا کا کرایہ چونی وصول کرے گا پھر روپیہ بھی ہضم کر جائیگا۔ اور شعر سنائے گا۔ اگر کوئی ڈھنگ کا سننے والا نہ ملے تو راستہ چلتے آدمی کو روک کر سنائے گا۔ بلکہ اسے دیکھ کر آدمی خود سننے رک جائے گا۔ کوئی نہیں تو رکشا والے کو سنائے گا۔ ننھے منے بچوں کو سنائے گا غرض وہ اسی طرح غزل یا

نظم کے تمام ہونے سے پہلے ہر لفظ کئی بار سیکڑوں لوگوں کو سنا چکتا ہے، اور اس کا کلام مرض متعدی ہے سننے والے دوسروں کو سنائیں گے اس طرح حیدرآباد کی ساری پبلک طوطے کی طرح اس کا کلام رٹ لیتی ہے اس طرح تازہ غزل مجھ تک پہنچنے سے پہلے سب کو زبانی یاد ہو جاتی ہے۔ پھر آپ ہی بتائیے کمینہ نہ کہوں تو اسے کیا کہوں۔ میر کے کلام سے سرقہ کرنا آسان ہے ممکن ہے کسی کو پتہ نہ چلے لیکن مخدوم کا آدھا شعر بھی چوری کر لیجئے اور کسی کو سنائیے تو سننے والا بقیہ آدھا سنا کر کہتا ہے مخدوم نے کیا خوب کہا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو والے خواہ اس کا کلام نشر کرنے سے بچتے رہیں اس کا کیا بگاڑ لیتے ہیں۔ خود ہی بدنام ہوتے ہیں۔ وہ تو بذات خود ریڈیو اسٹیشن ہے۔ اور بار بار اپنے پروگرام اس طرح نشر کرتا ہے کہ دور و نزدیک سب نہ صرف سن لیں بلکہ سن کر یاد رکھنے پر مجبور ہو جائیں۔ اور جب کسی محفل میں سنانے کی فرمائش ہو تو وہ بے حد بچنے کی کوشش کرے گا۔

بھئی! یاد نہیں۔ پبلک کے بے حد اصرار پر سناتے سناتے اٹک جائے گا۔ اور پبلک ایک آواز ہو کر جب اسے یاد دلائے گی تو اصیل مرغ کی طرح اکڑ کر ادھر ادھر فخریہ دیکھے گا۔ دیکھا آپ نے شاعری اس کو کہتے ہیں۔ اور دوسرے شاعر بیچارے غمزدہ ہو کر اپنی ناقدری کا غم بھلانے کیلئے رونے لگیں گے۔ کسی شاعر کو بھی اس کے اپنے شہر کے لوگ اس طرح سر آنکھوں پر نہیں بٹھاتے۔ ایسی مزاجداری نہیں کرتے۔ میں نے کہا، سب نے اس کا دماغ خراب کر دیا ہے گھر کی مرغی دال برابر سمجھا ہی نہیں۔ صدیوں کی ناقدردانی ابنائے وطن کی روایت توڑ دی، حد ہے بھئی، واقعی حد ہے، وہ روز سنائے اور سال بھر تک وہی ایک چیز سناتا رہے تو بھی سب ہمہ تن گوش بن جاتے ہیں۔ خدا جانے کون سا منتر پڑھ کر پھونک دیا ہے۔ اکتانے کا نام نہیں لیتے، باسی پرانی، بوسیدہ غزلیں تک شوق سے سنتے ہیں اور دوسرے.. شاعروں کی سائیکلوجی خراب ہوتی ہے۔

اصل میں اس کی آواز میں جادو ہے۔ گہری طرحدار، کھرا دبر چڑھی ہوئی آواز۔ جب غزل چھیڑتا ہے تو آپ ساز بن جاتے ہیں۔ اور اماوس کی رات میں گویا دیپک سا جل اٹھتا ہے۔ مگر جہاں آپ نے شوق کا اظہار کیا کہ لگے.. نخرے دکھانے، اصرار کیجئے کہ غزل ترنم سے سناؤ تو تحت اللفظ پڑھنے لگے گا بے سروں کو تو گانے کا شوق ہے مگر اس کا حال یہ ہے کہ ذرا آواز کی تعریف کی اور یہ تحت اللفظ پر اتر آیا۔ میرا خیال ہے جشن مخدوم میں ایک.. ریزولیشن پاس کر دیا جائے کہ مخدوم جب سنائے ترنم سے سنائے۔ مجھ سے عرب ملکوں کی سیاحت کر کے آنے والے ایک سیاح نے کہا ام کلثوم ہے آواز اس کی۔ ساٹھ برس کی ہو چکی مگر آواز کا جادو نہیں ٹوٹا۔ میں نے کہا آپ نے مخدوم کو نہیں سنا، ساٹھ برس سے تو ہم ہی سن رہے ہیں۔ مگر آواز کا کلف نہیں ٹوٹا، بلکہ ابرق سی چمکنے لگی۔

ریزولیشن کی بات آئی ہے تو ایک ریزولیشن اور پاس کرنا ہو گا۔ وہ یہ کہ جب بھی ادبی محفلوں میں مخدوم آئے تو اپنی لمبی لمبی تقریروں سے بور نہ کرے، نظم سنایا کرے۔ مروت میں لوگ اس کی تقریروں کو جھیل لیتے ہیں

و سمجھتا ہے کہ اس کی تقریر سننے کیلئے بیٹھے ہیں۔ حالانکہ سب اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ اس لمبی تقریر کے بعد شعر سنائے گا۔ تقریر سننی ہے تو راج سے سن لیں گے۔ ہمارے لئے مخدوم شاعر ہے اور اس کا شعر سننے کے لئے ہی ہم آتے ہیں۔ تقریریں وہ ادب کی سرحد کے پار جلسے جلوسوں میں کر سکتا ہے۔

مخدوم شاعر بھی ہے شخصیت بھی' جادو بھری ہے اور جادوگر بھی۔ مگر ہے ٹیڑا لیپوٹ' اس کا اعتبار مشکل ہے۔ وہ جب نہایت سنجیدگی سے باتیں کرتا نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ کسی کو بنا رہا ہے۔ اور سننے والے کو خبر بھی نہ ہو گی۔ آندھرا پردیش نیا نیا بنا تھا۔ ایک خاتون اردو سے بالکل ناواقف اپنی دانست میں بے حد بااثر ایک محفل میں مخدوم کو شعر پڑھتے سن کر بے حد متاثر ہوئیں۔ آواز یقیناً کانوں میں رس گھول گئی ہو گی۔ شفقت سے پوچھا آپ کیا کام کرتے ہیں۔ مخدوم نے سوکھا منہ بنا کر مظلومیت سے دکھڑا رو یا کہ بے کار ہوں۔ بے چاری ریڈیو اسٹیشن میں کام دلانے کا ایک وعدہ کر بیٹھیں اور مخدوم نے ان کی سرپرستی کے انداز کو داد و رشہ دی۔ انگلش میں ان سے بات کرتا اُردو میں منتری دیتا جاتا۔ پاس بیٹھنے والوں کا برا حال تھا۔ ایکٹنگ تو اس کیلئے فطری تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو لال.. مخدوم ہے تو بس نام سے ہی بدکنے لگیں۔

'وہ تو خیر۔ مگر یہ سردار جعفری۔ خاصا چالو آدمی ہے' وہ بھی جھانسے میں آگیا۔ جب مخدوم نے اپنی آواز کا سلسلۂ نسبی حضرت بلال حبشیؓ سے ملایا تو اس نے اپنے مضمون میں لکھ مارا' اور شاید آج تک خبر نہ ہوئی۔ حالانکہ یہ چار سو بیس جب چاہتا ہے' سقراط بقراط بن جاتا ہے' جب چاہتا ہے قلوپطرہ اور قرۃ العین کا عاشق۔ یہ تو دلی کی راجدھانی جیسا ہے جس نے کبھی کسی سے پیچ لڑانا وفا کی۔ مگر وہ لوگ بھی خوب جانتے ہیں کہ وہ سنجیدہ باتیں لطیفوں کی طرح بیان کرتا ہے اور گپ مارتے وقت افلاطون کی طرح سنجیدہ اور ذی شعور نظر آتا ہے وہ بھی جو ہمیشہ سے اسے جانتے ہیں بارہا الو بنے ہیں' کھسیائے ہیں' وہ تو گرگٹ ہے جب دیکھئے ایک نئے رنگ میں نظر آتا ہے۔ اعتبار ہی نہیں کیا جا سکتا کہ اس بہروپیہ کا سچا رنگ کونسا ہے۔

مخدوم اپنی مقبولیت پہ آپ نازاں ہے کہ مجھے سب چاہتے ہیں چاہیں نہیں تو جائیں کہاں۔ جو آپ کے سر پہ سوار ہی ہو جائے' اسے سر پہ بٹھانا ہی پڑتا ہے۔ کوئی گھر ایسا نہیں جہاں وہ نہ جا سکتا ہو۔ عورتوں میں عورت مردوں میں مرد سیاست دانوں میں اپوزیشن لیڈر اور بچوں میں سرکس کا مسخرہ' میں نے بارہا اسے نہایت ہی گھریلو قسم کی عورتوں سے بگھارے بیگن یا انڈوں کے کٹ کی فرمائش کرتے اور انباڑے کے اچار کی ترکیب پوچھتے سنا ہے۔ مخدوم کو اپنے بلیو بلیک حسن پر بڑا ناز ہے۔ اب جو بنے بھائی نے اسے اجنتا کی مورتی قرار دیا ہے تو خدا جانے اور کیا مزاج دکھائے پہلے ہی سے وہ اپنے آپ کو دکن کی سنگلاخ چٹانوں سے ترشا صنم سمجھتا ہے!

مگر مخدوم سخت کافر ہے برا بھلا کہہ کر بھی عزیز رکھنے کو جی چاہتا ہے ایک بار شام بہاراں میں میں نے

اسے کافر کہہ دیا تھا تو دوسرے ہی دن کئی مولویوں نے خطوط بھیجے اور برا بھلا کہا کہ لکھا تھا غزل کا کافر ہے ہے کافر
نہیں، انہیں یقین ہے کہ ایک نہ ایک دن راہ راست پر آجائے گا عوام بھی کہتے ہیں دہریہ ہے تو کیا ہوا۔ دیکھ لیجئے پیر
پیر کے نام کی برکت سے کیا نام نکالا ہے! یہ سب سن کر وہ مُسکراتا ہے مُسکرانا لفظ دکنی زبان میں نہایت بلیغ ہے او
وہ مخدوم پر صادق آتا ہے اب بھی دیکھئے کس سے مُسکرا رہا ہے۔

مجھے آج سروجنی نائیڈو کی بیٹی لیلامنی یاد آرہی ہیں کالج میں کوئی تقریب ہو وہ سب سے آخر میں ختم کی
کرتیں "وہ خم گردن وہ دست ناز وہ ان کا سلام"۔ مگر لعنت ہے مخدوم پر جس کے ایسے قدر دان رہے ہوں وہ اپنی
قدر گنواتا ہے۔ کچھ کہئے تو ناراض ہوتا ہے لڑنے مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ کس قدر خواہش تھی کہ وہ متعلق کچھ
کتنے اصرار پر لکھا۔ مگر بدذوقی کی حد ہوتی ہے۔ جسے چاہتا ہے شعلہ رُخ شعلہ بدن بنا دیتا ہے۔

میرا خیال ہے کہ ساٹھ سال عمر کا اثر چہرے مہرے پر نہ سہی آنکھوں اور کانوں پر ضرور ہوا ہے، آنکھوں کے اتنے
اچھے اچھے ڈاکٹر شہر حیدرآباد میں موجود ہیں وہ یقیناً مخدوم کو بھی جانتے ہوں گے انھیں کیسے گوارا ہے کہ ان کی دور
دور تک بدنامی ہو اب بھی وقت ہے کہ ایک عینک اور ایک سماعت کا آلہ اس کی نذر کیا جائے۔

اس کا مجموعہ "بساط رقص" اجرا ہو گیا کچھ نظمیں تو بالکل راک ان رول کرتی معلوم ہوتی ہیں۔ بلکہ ٹوسٹ اور شیک۔ اس لئے
جب بیحد ینگ اسمارٹ لڑکیاں مخدوم کو سننے اور (ADMIRE) کرنے آتی ہیں اور ڈاؤن ہونے لگتی ہیں کہ اللہ کتنے سویٹ
ہیں مخدوم صاحب تو میں خطرے کی گھنٹی بجا دیتی ہوں۔ وہ جو سفید سر والے بزرگ راج بہادر بیٹھے ہیں نا ان سے فل ٹین
ایئرس بڑے ہیں۔ اور کئی نواسے نواسیوں کے نانا حضرت' وہ بڑی بے اعتباری سے "اڈگوش" کہہ کر سنبھل جاتی ہیں۔ او
وقت کے سر پر سے خطرہ ٹل جاتا ہے۔ خدا معلوم مخدوم کیوں نہیں سوچتا کہ اور شاعر چاہے جو کریں مگر مخدوم کو لوگ
چاہتے ہیں تو اس سے کچھ معیاروں کے طلبگار بھی ہیں۔

مگر معلوم نہیں کیوں ہنسنے بولنے اور کھلکھلانے والا مخدوم شعر سناتا ہے تو مجھے بالکل تنہا نظر آتا ہے تنہا مسافر
شب گزیدہ جو اپنے دل کا چراغ جلائے سب کیلئے راہ تلاش کر رہا ہو آپ اس کی باتیں سن کر ہنستے ہوں گے۔ مگر شعر سن
کر جیسے دل پگھلنے لگتا ہے' اسی لئے کافر ہے' کمینہ ہے' سب کچھ ہے مگر بے ساختہ کہہ اٹھتے ہیں ؎

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

عرش ملسیانی

رباعیاں

تحقیق کے انداز نئی بات نہیں
یہ شورِ تگ و تاز نئی بات نہیں
قرنوں سے چلی آتی ہے افلاک کی سیر
آدم کی یہ پرواز نئی بات نہیں

ہر حال میں ہر مرد ہے عورت پہ نثار
نظروں میں زمانے کی ہے عورت کا وقار
یہ ہند کے فن کاروں پہ موقوف نہیں
آفاق کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

اللہ رے آشفتہ بیانی اپنی
تیزی پہ ہے اشکوں کی روانی اپنی
اک شخص کا یہ قصۂ پُر درد نہیں
دنیا کی کہانی ہے کہانی اپنی

ہوتا ہے حسیں حسن و محبت کا فریب
دلکش ہے احبا کی مروت کا فریب
یہ سارے فریب ہیں حسین و دل کش
ان سب سے حسیں تر ہے سیاست کا فریب

ہر شخص مناتا ہے یہاں جان کی خیر
دیکھو جسے ہے مانگتا ایمان کی خیر
صد حیف کہ انسانوں کی اس دنیا میں
کوئی بھی نہیں مانگتا انسان کی خیر

قندِ لب و گفتارِ عسل لائی ہے
کھلتے ہوئے چہرے کا کنول لائی ہے
وہ دولتِ افکار لٹانے والی
لاکھوں ہی مضامینِ غزل لائی ہے

آئی ہے وہ ہر ساز کا آہنگ لیے
آئی ہے وہ سو عشوۂ و نیرنگ لیے
ہر ایک بُنِ مُو ہے شبیہِ رنگیں
آئی ہے وہ سو نسخۂ ارژنگ لیے

سب بھول گیا میں کہ جو آموختہ تھا
باقی نہ رہا دل میں جو اندوختہ تھا
کیا تم سے سراسیمگیٔ عشق کہوں
جس وقت کہ وہ مجھ سے برافروختہ تھا

نریش کمار شاد

رباعیاں

معبودا! زمانے کی ضرورت کیا تھی
محتاج نہیں تھا تو نمائش کا اگر
یہ کھیل دکھانے کی ضرورت کیا تھی
دنیا کو بنانے کی ضرورت کیا تھی

آشفتہ بیانی مجھے جینے دیتی؟
ممنون ہوں اربابِ حسد کا ورنہ
یہ دشمنِ جانی مجھے جینے دیتی؟
کیا ہیچ مدانی مجھے جینے دیتی؟

ہر جابر و سفّاک سے بے زار ہوں میں
اقبال کے خود پسند شاہیں کا نہیں
خوں خوار نہیں واقعی غم خوار ہوں میں
کمزور کبوتر کا طرفدار ہوں میں

کشتی کو ڈبو ڈبو کے کھیتا ہوں میں
جو مجھ میں کمال ہے بخوبی اُس کو
پندار کو بھی فریب دیتا ہوں میں
دشمن کی نظر سے دیکھ لیتا ہوں میں

آلام کو غارت کبھی کرتے ہی نہیں
کچھ لوگ تو ہیں موت سے خائف اتنے
خوشیوں کی زیارت کبھی کرتے ہی نہیں
جینے کی جسارت کبھی کرتے ہی نہیں

سمجھاتا ہے ڈھنگ تاجرانا ہم کو
ہم ہوتے زمانے میں جو بکنے والے
افسوس کہ تو نے نہیں جانا ہم کو
بِک بِک کے خریدتا زمانا ہم کو

اپنے دلِ صد چاک کو سینا سیکھا
مجھ کو تو یہی ایک خوشی ہے میں نے
امرت کی طرح زہر بھی پینا سیکھا
آلام سے مرنا نہیں جینا سیکھا

یہ لوگ سخن فہم نہیں ہیں بخدا
دردِ دلِ شاعر کی انھیں کیا پروا
تفریح کا سامان سمجھتے ہیں مجھے
عیّاش رئیسوں کی ستائش پہ نہ جا

جوشؔ ملسیانی

غزل

خرد کی جستجو بے کار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے
یہ عالم عالمِ اسرار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

یہ مانا آپ کے دل میں بھی ہے جذبہ محبّت کا
مگر ملنا ملِا نا بار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

وہ جھگڑا آج بھی ہے کل جو تھا شیخ و برہمن میں
یہ فتنہ رات دن بیدار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

مسیحا ہے تمھاری آنکھ ہر بیمار کے حق میں
مگر یہ آنکھ خود بیمار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

تمھارے سامنے آتے ہی یہ کیا ہو گیا اس کو
مصوّر نقش بر دیوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

بُرا کہتا نہیں کوئی بھی ہم رندوں کو اے واعظ
تجھی کو یہ خدا کی مار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ہمیں کو تیری رحمت نے ہزاروں نعمتیں بخشیں
ہمیں کو زندگی دشوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

نوازا تھا بہت کچھ جس ادائے ناز نے ہم کو
وہی برچھی جگر کے پار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

خوشامد ہی پہ تم لطف و کرم محدود رکھتے ہو
نہایت پست یہ معیار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

تمھارے رخ پہ ہے پردہ بھی دل میں ہے کدورت بھی
پسِ دیوار اک دیوار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

ثنائے عظمتِ ساقی بھی جب اے جوشؔ لکھتے ہو
تمھیں پینے سے پھر انکار کیوں ہے ہم نہیں سمجھے

○

غلام ربانی تاباں

منزلوں سے بے گانہ، آج بھی سفر میرا
رات بے سحر میری، درد بے اثر میرا

گمرہی کا عالم ہے، کس کو ہم سفر کہیے
تھک کے چھوڑ بیٹھی ہے ساتھ رہگزر میرا

وہ فروغِ الفت بھی، انجمن سراپا بھی
بھر گیا ہے پھولوں سے دامنِ نظر میرا

اب ترے تغافل سے اور کیا طلب کیجیے
شوق نارسا میرا، عشق معتبر میرا

دورِ کم عیاری ہے کچھ پتہ نہیں چلتا
کون میرا قاتل ہے کون چارہ گر میرا

آسماں کا شکوہ کیا، وقت کی شکایت کیوں
خونِ دل سے نکھرا ہے اور بھی ہنر میرا

دل کی بے قراری نے ہوش کھو دیے تاباں
ورنہ آستانوں پر کب جھکا تھا سر میرا

اختر سعید

دو غزلیں

جان دی کس کے لئے ہم نے بتائیں کس کو
کون کیا بھول گیا، یاد دِلائیں کس کو

وہ جواب دردِ کو بھی درد نہیں کہتے ہیں
دیکھنے والو وہ دل اپنا دکھائیں کس کو

رُوٹھ جاتے تو منانا کوئی دُشوار نہ تھا
وہ تعلق ہی نہ رکھّیں تو منائیں کس کو

چاک دل چاکِ گریباں تو نہیں ہم نفسو
ہم یہ تصویرِ سرِ بزم دکھائیں کس کو

کون دیتا ہے یہاں خوابِ جنوں کی تعبیر
خواب ہم اپنے سُنائیں تو سُنائیں کس کو

کوئی پُرسانِ وفا ہے نہ پشیمانِ جفا
زخم ہم اپنے دکھائیں تو دکھائیں کس کو

کون اس شہر میں سُنتا ہے فغانِ درویش
اپنی آشفتہ نوائی سے رُلائیں کس کو

ہوگیا خاکِ رہِ کوئے ملامت اختر
راہ پر لائیں جو احباب تو لائیں کس کو

حیات اک رقصِ مستیٔ جوشِ پیہم ہے جہاں ہم ہیں
ستاروں سے پرے تقدیرِ آدم ہے جہاں ہم ہیں

زمیں پیروں سے نکلی جا رہی ہے جس جگہ تم ہو
ہمارے ہاتھ میں نبضِ دو عالم ہے جہاں ہم ہیں

بنا رکھّا ہے اک مُدّت سے جس کو تم نے انگارہ
اُسی مٹّی کو دیکھو کس قدر نم ہے جہاں ہم ہیں

زمانے کی ہوا کتنی مخالف ہے جہاں تم ہو
اِدھر بس ایک زُلفِ یار برہم ہے جہاں ہم ہیں

وہ شعلہ جس نے خود دامن تمھارا پھونک ڈالا ہے
وہی شعلہ اسیرِ حُسنِ شبنم ہے جہاں ہم ہیں

کوئی تصویر ہو تصویر مبہم ہے جہاں تم ہو
کوئی تنویر ہو تنویرِ عالم ہے جہاں ہم ہیں

بلندی سے ہماری سمت ہنس کر دیکھنے والو
بلندی خود ہمارے سامنے خم ہے جہاں ہم ہیں

جس اندازِ شگفتِ گُل پہ دُنیا جان دیتی ہے
وہ اندازِ شگفتِ گُل مسلّم ہے جہاں ہم ہیں

اُڑا دو دھجّیاں تم لاکھ دستورِ محبّت کی
یہ رشتہ آج بھی اُتنا ہی محکم ہے جہاں ہم ہیں

شکیل بدایونی

غزل

شعلہ بکف ہے زندگی امن و اماں کی خیر ہو
مل کے دعائیں مانگیے سارے جہاں کی خیر ہو

رہ نہ سکیں گے اب نہاں رازِ درونِ میکدہ
رندوں کو ہوش آگیا پیرِ مغاں کی خیر ہو

زہرِ حیات پی کے ہم کھیل رہے تھے موت سے
عشق نے پھر جلا دیا عمرِ رواں کی خیر ہو

ہیں مگر دل سے بے خبر پھر بھی بزعمِ یک نظر
آئے ہیں بن کے چارہ گر دردِ نہاں کی خیر ہو

زورِ نظر کے سامنے بندِ نقاب کچھ نہیں
اُٹھ گئی پھر مری نظر حسنِ بتاں کی خیر ہو

مصلحتوں نے ولولے چھین لئے ہیں سب شکیلؔ
اہلِ زباں ہیں کم سخن، زورِ بیاں کی خیر ہو

حفیظ بنارسی

غزل

یہ کیسی ہوائے غم و آزار چلی ہے
خود بادِ بہاری بھی شرربار چلی ہے

دیکھی ہی نہ تھی جس نے شکست آج تک اپنی
وہ چشمِ فسوں خیز بھی دل ہار چلی ہے

اب کوئی حدیثِ قد و گیسو نہیں سُنتا
دنیا میں وہ رسمِ رسن و دار چلی ہے

تکتے ہی نہیں رند مئے و جام کی جانب
کیا چال یہ تو نے نگہِ یار چلی ہے

وہ لوگ کہاں جائیں جو کافر ہیں نہ دیندار
پھر کشمکشِ کافر و دیندار چلی ہے

بات اور بھی کچھ مے کی مذمت کے علاوہ
یہ بات تو اے شیخ بہت بار چلی ہے

دیوانگیٔ شوق میں جو کرتے ہیں ہم لوگ
معیارِ خرد بن کے وہ گفتار چلی ہے

سازش نہ ہو کچھ دیر و حرم والوں کی اس بار
سُنتا ہوں کہ میخانے میں تلوار چلی ہے

کب یاد کیا ہم کو حفیظؔ اہلِ چمن نے
جب زیست سوئے وادیٔ پُرخار چلی -

اظہر سعید

غزلیں

سب کے ہوتے ہوئے بیگانہ رہے ہم سب سے
دل نے پھر کچھ نہیں چاہا تمھیں چاہا جب سے

صبح تک نغمۂ بیدار میں ڈھل جائے گی
یہ جو اک چیخ سی اٹھتی ہے سکوتِ شب سے

راز رکھا تھا جسے اہلِ خرد نے اب تک
کسی دیوانے نے وہ بات کبھی کہہ دی سب سے

قحطِ مے ہے تو لہو جام میں بھر کر چھلکاؤ
میکدہ شہرِ خموشاں ہے نہ جانے کب سے

بندگی اپنی طبیعت نہیں بنتی ورنہ
شیخ کچھ بیر نہیں ہم کو ترے مذہب سے

کیا کہیں حالِ دل و شورشِ غمہائے جہاں
اک دھواں ہے کہ جو لپٹا ہے چراغِ شب سے

زندگی مرگِ مسلسل ہے تو پھر جینے کا
ہم کوئی اور ہی سامان کریں گے اب سے

بہر قدم کہیں گرتے کہیں سنبھلتے ہیں
کشاں کشاں دلِ وحشی کے ساتھ چلتے ہیں

بس اب تمامِ شبِ انتظار کیا کہیئے
چراغ بجھ گئے سینے کے داغ جلتے ہیں

یہ بے دلی کہ نہیں دل میں یادِ جاناں بھی
ہم اپنی فرصتِ حاصل پہ ہاتھ ملتے ہیں

پڑا ہے وقت یہ دل پر کہ چھوڑ بیٹھے ساتھ
وہ اشک جو مرے خونِ جگر پہ پلتے ہیں

خدا نہ کردہ وہ کیوں دشمنِ وفا کہلائیں
ہماری بھول تھی لو وضعِ غم بدلتے ہیں

خرابِ دیر و حرم تھے کبھی سکوں کے لئے
جو لوگ اب ترے کوچے سے کم نکلتے ہیں

یہ پاسِ راہ روی ہے کہ راہِ ہستی میں
ملے نہ دوست تو دشمن کے ساتھ چلتے ہیں

کرشن موہن

غزل

گرمِ نوا تھے اب سرد ہوئے ہم، سورج ڈوب رہا ہے
شعلہ شعلہ، شبنم شبنم، سورج ڈوب رہا ہے

دِن کا اُجالا مدّھم مدّھم، سورج ڈوب رہا ہے
رات میں ہو جائے گا مدغم سورج ڈوب رہا ہے

سوز بھی کم کم ساز بھی کم کم، سورج ڈوب رہا ہے
آج عجب ہے دل کا عالم سورج ڈوب رہا ہے

بیت چلی ہیں میت مِلن کی، دِن کی اُجلی گھڑیاں
اُبھرے گا اب برہا کا غم سورج ڈوب رہا ہے

یہ جو سمندر کے اندر ہیں مچلی مچلی لہریں
چاند کے دل کے ہیں پیچ و خم سورج ڈوب رہا ہے

دیو سمے کا ہنستے ہنستے دیکھے بھوگی کا دَم
روگی کا غم، جوگی کا رم سورج ڈوب رہا ہے

کیفِ حاصل، سوزِ حرماں، کوئی آ کر دیکھے
جذباتِ دل کا زیر و بم سورج ڈوب رہا ہے

ارمانوں کی شام ہوئی ہے، گھوم رہا ہوں تنہا
خستہ ماندہ زار و بیدم سورج ڈوب رہا ہے

آس اُداس ہوئی جاتی ہے، گُونج رہا ہے ہر سو
شام کے دل کا مدّھم سرگم سورج ڈوب رہا ہے

کتنا غمگیں اور حسیں بھی رُوپ انوپ ہے اُس کا
میرے شوق اور سوچ کا سنگم سورج ڈوب رہا ہے

شام کے گھونگھٹ میں شرمیلی اور سوچوں میں ڈوبی
دھوپ کا درپن رُوپ انوپم، سورج ڈوب رہا ہے

سلیمان اریب

دو غزلیں

جو پاکر بھی کچھ نہیں کھوتے وہ روتے ہیں اس دنیا میں
آنسو ہوں دامن پہ کسی کے ہم دھوتے ہیں اس دنیا میں

اندھوں کی بستی میں کب سے آئینے میں بیچ رہا ہوں
مجھ جیسے بھی عقل کے اندھے کم ہوتے ہیں اس دنیا میں

خواب اگر جھوٹے ہوں تو تعبیریں سچّی ہوتی ہیں!
میری نیند اُڑانے والے کب سوتے ہیں اس دنیا میں

جب وہ ملے تھے، زخم ہنسے تھے، پات ہرے تھے، پھول کھلے تھے
کتنی راہیں آئیں بھی نہیں ہم روتے ہیں اس دنیا میں

کانٹوں کی برساتیں پاکر ہم نے تو گل بانٹے لیکن!
فصل خوشی کی کاٹنے والے غم بوتے ہیں اس دنیا میں

صدیوں کی تہذیب کے خالق قبریں اپنی چھوڑ گئے ہیں
اور اُن کی قبروں کی مٹی ہم ڈھوتے ہیں اس دنیا میں

بھیس کیا کیا نہ زمانے میں بنائے ہم نے
ایک چہرے پہ کئی چہرے لگائے ہم نے

اس تمنّا میں کہ اس راہ سے تو گزرے گا
دیپ ہر راہ میں ہر رات جلائے ہم نے

دل سے نکلی نہ خراشِ غمِ ایّام کی دھوپ!
تیرے ناخن سے کئی چاند بنائے ہم نے

دامنِ یار پہ حق اپنا جتایا نہ کبھی
اشک اُمڈے بھی تو پلکوں میں چھپائے ہم نے

خود ہوئے غرق زمانے کو بھی غرقاب کیا
ایک آنسو سے وہ طوفان اُٹھائے ہم نے

جن کو ہر دور میں عشّاق نے اپنایا ہے
بے وفائی کے وہ پہلو بھی دکھائے ہم نے

تیرے پہلو سے بھی پہنچے نہ ترے پہلو تک
فاصلے قرب کے گو لاکھ گھٹائے ہم نے

چہرے کتبے سہی، کتبوں کی عبارت پہ نہ جا
ابھی لفظوں سے کہاں پردے اُٹھائے ہم نے

شعر کہنے سے نہ محبوب، نہ دنیا ہی ملی
عمر بھر شعر کہے شعر سنائے ہم نے

شہریار

دو غزلیں

کب ہوا دنیا میں ایسا حادثہ
معتقد ہے بادِ صرصر کی صبا
دھند کی زد میں ہے خوابوں کا افق
دیکھیے دکھلائیں آنکھیں اور کیا
ڈھل گئی کب عارضوں کی چاندنی
کھل گئی کب گرم سانسوں کی گھٹا
کھو گئے سارے مسافر یاد کے
ہو گیا ویران دل کا راستہ
بجھ گیا آخر چراغِ آرزو
وار کاری تھا ہوا کے ہاتھ کا
ساعتوں کے پیچ و خم کے بعد بھی
قرب کا انجام دوری ہی رہا
زندگی کے نام سے واقف تو ہوں
یہ نہیں ہے یاد کب اس سے ملا

بنیادِ جہاں میں کجی کیوں ہے
ہر شے میں کسی کی کمی کیوں ہے
کیوں چہرۂ خار شگفتہ ہے
اور شاخِ گلاب جھکی کیوں ہے
وہ وصل کا دن کیوں چھوٹا تھا
یہ ہجر کی رات بڑی کیوں ہے
جس بات سے دل میں ہلچل ہے
وہ بات لبوں پہ رکی کیوں ہے
جب چلے گئے سب دیوانے
یہ دل کی بستی بسی کیوں ہے
مت دیکھ کہ کون ہے پروانہ
یہ سوچ کہ شمع جلی کیوں ہے
نہ تھے خواب تو آنسو ہی ہوتے
مرا کاسۂ چشم تہی کیوں ہے

وارث کرمانی

دردآشنا نگاہ

وہ دردآشنا نگاہ میری سمت کیا اُٹھی بیاضِ صبح کی کرن سوادِ شام تک گئی
ستارہ بجھ کے ذہن میں چراغ سے جلا گیا بہار ڈھل کے شعر میں لبِ کلام تک گئی
جسے حرام کر دیا تھا محتسب کے قہر نے تری نظر سے پھر وہی شراب جام تک گئی
جہاں کسی کی بخشش و کرم کا ذکر آ گیا تو بات رفتہ رفتہ بڑھ کے تیرے نام تک گئی
جسے بھی اوجِ فکر میں تلاش کہکشاں ہوئی نگاہ تیرے قصرِ مرمریں کے بام تک گئی
تری وفا کا سلسلہ گلی گلی، نگر نگر تری عظیم سلطنت دلِ عوام تک گئی
تجھے بشر کی دوستی خلیل و خضر سے ملی تری حرارتِ عمل اُسی مقام تک گئی
تری نگاہِ مہرباں علاجِ دردمندیاں ترے کرم کی داستاں قبولِ عام تک گئی
معلّمِ خرد نما، مصنفِ گراں بہا تری حدیث دل کشا حدِ دوام تک گئی
طراوتِ رگِ قلم نے کیا چمن کھلائے ہیں ذکاوتِ دل و نظر کس اہتمام تک گئی
خیال، دردِ عاشقاں کے ہر جواز تک گیا نگاہ، حُسنِ مہ وشاں کے ہر پیام تک گئی
ضمانتِ نشاطِ جاں میں دوستوں کا ذکر کیا بشارتِ سکونِ دل ترے غلام تک گئی
تجھے یہ فکر کم نہیں کہ تیرا مدح خواں ہوں میں غزل یہ ہند سے اُٹھی تو روم و شام تک گئی
مرے سخن میں نغمہ خواں، چہ لکھنؤ چہ اصفہاں وہی بہارِ بے خزاں مرے مشام تک گئی
ہزار مطربِ جواں مرے حضور کف زناں ہزار روحِ چنگ و دف مرے کلام تک گئی
کہیں نگار صف بہ صف مری جناب میں رہے کہیں بہارِ گل بہ کف مرے سلام تک گئی

ستم کشانِ دہر کی دعا دلوں کے ہجوم میں
مری دعا بھی تیرے ساتھ چند گام تک گئی

ممتاز مرزا

دو غزلیں

شامِ فراق بزم سجانے کو آگئی
پھر اُن کی یاد شمع جلانے کو آگئی

اُن کے بغیر پھول کھلاتی تو کیا نسیم
اکثر چمن میں آگ لگانے کو آگئی

دشتِ طلب میں دل پہ جو گزری نہ پوچھیے
ٹھنڈی ہوا تھی نیند ددانے کو آگئی

اُٹھ کر تمھارے در سے بھٹکتے کہاں کہاں
اچھا ہوا کہ موت بلانے کو آگئی

جب بھی کیا ہے جشنِ چراغاں بہار نے
بادِ خزاں چراغ بجھانے کو آگئی

اِس درجہ آشیاں کو خرابی سے ربط تھا
بنتے ہی موجِ برق جلانے کو آگئی

ممتاز بزمِ شعر کہاں اور میں کہاں
اک غم کی داستان سنانے کو آگئی

وہ کبھی سامنے جو آئے ہیں
اشک پلکوں پہ تھرتھرائے ہیں

دُور پھر بھی ہوئی نہ تاریکی
دل نے لاکھوں دیے جلائے ہیں

پھر دلِ لالہ داغ داغ ہے آج
پھر صبا کے پیام آئے ہیں

ہار گوندھے ہیں پھر اُمیدوں نے
شوق نے پھر دیے جلائے ہیں

پھر جنوں در بدر ہے آوارہ
پھر خرد نے فریب کھائے ہیں

رہگزر ہے نہ کوئی منزل ہے
ہاں مگر منزلوں کے سائے ہیں

ہم نے ٹھکرا دیے ہیں دیر و حرم
جب ترے راستے میں آئے ہیں

ہائے مجبوریاں محبت کی
ہر قدم پر فریب کھائے ہیں

اپنا سرمایۂ حیات ہی کیا
کچھ لرزتے ہوئے سے سائے ہیں

شمیم حنفی

دو غزلیں

وہ شاخ ہوں جو رہی بے نیازِ برگ و ثمر
بہت عجیب رہا میری آگہی کا سفر

سمٹ چکا ہوں اک احساسِ بے دلی کی طرح
حیات میرے لئے پھر رہی ہے خاک بسر

ہر ایک سانس نے پامال کر دیا ہے مجھے
میں آدمی ہوں کہ چنگیزیوں کی راہ گذر

سُنا ہے آج لہو آسماں سے برسے گا
ہوائے سبز میں تحلیل ہو چکے پتّھر

تمام شہر پریشاں ہے نیند کی خاطر
یہ کون رات گئے چیختا ہے سڑکوں پر

کیسی منزل ہے کہ سورج ہیں مگر سائے نہیں
پتّھروں میں ڈوب کر بھی لوگ گھبرائے نہیں

ہر طرف اک زرد صحرا، ہر طرف اک پیاس ہے
ہم تمھاری بزم سے اُٹھ کر کبھی گھبرائے نہیں

اس پہ ناخوش ہیں کہ ہم نے اُن کی صورت دیکھ لی
خود کو عریاں دیکھ کر جو لوگ شرمائے نہیں

جنگلوں کی رات کیوں آواز دیتی ہے ہمیں
ہم ابھی زندانِ بے خوابی سے اُکتائے نہیں

شمس الرحمٰن فاروقی

غزل

موسمِ سنگ و رنگ سے ربطِ شرار کس کو تھا
لمحہ بہ لمحہ جل گئی، دردِ بہار کس کو تھا

شمس و نجوم بے کراں، ہفت فلک نبرد گاہ
روشنیوں کی دوڑ میں پائے فرار کس کو تھا

چشمِ شفق تھی خوں نشیں چہرۂ شب تھا تیغِ تیز
خواب پڑے تھے تار تار، صبر و قرار کس کو تھا

سایۂ ہر شجر میں تھا رینگتے لمحوں کا ہجوم
خامِ خیالِ تیزیٔ لیل و نہار کس کو تھا

سدرۂ آسماں کے پار جال بچھے تھے ہر طرف
کس نے کیا ہمیں اسیر شوقِ شکار کس کو تھا

آج سے پہلے ہم سبھی سمجھے تھے اس کو برگِ گل
تجربۂ جلالتِ روئے نگار کس کو تھا

سایۂ ابلقِ شجر گھات میں چشم نیم وا
پاؤں جہاں تھے جم گئے ہوشِ فرار کس کو تھا

مظفر حنفی

دو غزلیں

دل کی دھڑکن بھی سر پٹکتی ہے
آج تو سانس تک اٹکتی ہے
درد نے آنکھ پھیر لی ہم سے
بے حسی بے طرح کھٹکتی ہے
کون کھینچے مراد کی صورت
جستجو بیسر کیوں پٹکتی ہے
ڈھول پیٹیں گے حضرتِ اخلاق
ناچ گھر میں حیا مٹکتی ہے
زندگی ہے کہ موت، پہچانو
ایک پرچھائیں سی بھٹکتی ہے
ٹوٹتے ہیں نجوم کے موتی
رات زلفیں اگر جھٹکتی ہے
عافیت ہے خفا مظفّر سے
وہ کہاں اس طرف پھٹکتی ہے

چلتے رہیں گے پاؤں اگر اجتہاد سے
یہ راہ طے نہ ہوگی کسی سندباد سے
محفوظ وہ رہیں گے غلط انتقاد سے
جو مشورہ کریں گے غزلیاتِ شاد[1] سے
اب تو خوش آمدید کہے ملکۂ بہار
کانٹوں پہ چل رہا ہوں بڑے اعتماد سے
اب آشیاں جلے ہوں کہ چمکے ہوں ماہتاب
اک روشنی سی آئی ہے باغِ مراد سے
تکلیف وہ تھی سرد ہواؤں کی تیز دھار
لپٹی ہے رات ماہ لقاؤں کی یاد سے
چپٹی نہیں زمیں تو مظفّر ملے گا وہ
دوری گھٹا رہا ہوں سفر کے تضاد سے

---

[1] شاد عارفی

ناول

ہانگ کانگ کی حسینہ	کرشن چندر
مٹی کے صنم	کرشن چندر
زرگاؤں کی رانی	کرشن چندر
دل کی دنیا	عصمت چغتائی
ایک معمولی لڑکی	بلونت سنگھ
عورت اور آبشار	بلونت سنگھ
خوشبو کا خواب	اے حمید

(صرف اس ناول کی قیمت دو روپے)

شام اور لڑکی	اے حمید
لندن کی ایک رات	سجاد ظہیر
شہید	ملک راج آنند
خلش	امرتا پریتم
ناگ منی	امرتا پریتم
جگنو اور ستارے	جیلانی بانو
اُجلا آنچل	کرتار سنگھ دگل
بندگلی	ہنس راج رہبر
نیلی چاندنی	گلشن نندہ

ناول

محبت یا ہوس	ٹالسٹائی
ماں	پرل بک
قصۂ چار درویش	میرامّن دہلوی
بن بیاہی ماں	گورنش سنگھ

افسانے

جوگیا	راجندر سنگھ بیدی
پلنگ	اوپندر ناتھ اشک
ایک عورت ہزار جلوے	علی عباس حسینی
فرانس کے عظیم ناول	(اختصار)
روس کے عظیم ناول	(اختصار)
انگریزی کے عظیم ناول	(اختصار)

طنز و مزاح

کانچ کے ٹکڑے	کرشن چندر
فلمی قاعدہ	کرشن چندر
گستاخیاں	کنھیا لال کپور
کامریڈ شیخ چلی	کنھیا لال کپور
وارنٹ گرفتاری	فکر تونسوی

یہ کتاب صرف ایک روپیہ

طنز و مزاح

نئے شگوفے	شفیق الرحمٰن
ادبی لطیفے	مرتبہ:- نریش کمار شاد

شعر و شاعری

اردو کی بہترین غزلیں	مرتبہ:- پرکاش پنڈت
اردو کی بہترین رومانی نظمیں	مرتبہ:- پرکاش پنڈت
پاکستان کی اردو شاعری	مرتبہ:- پرکاش پنڈت
۱۹۶۶ء کی منتخب شاعری	مرتبہ:- پرکاش پنڈت
بہترین رباعیاں اور قطعے	مرتبہ پرکاش پنڈت
گیتانجلی (ٹیگور)	ترجمہ:- فراق گورکھپوری

سوانح

لال بہادر شاستری	مہا بیر ادھیکاری

سیاحت

پاکستان کا سفر	بلراج ساہنی

اخلاقیات

میری سُنو (خلیل جبران)	ترجمہ: سجاد ظہیر
انمول موتی (اقوال)	مرتبہ: مانس ہنس
کامیابی کے راز	سویٹ مارڈن

جنسیات

مرد و عورت	ڈاکٹر لکشمی نارائن
برتھ کنٹرول	ڈاکٹر لکشمی نارائن
جنسی مسائل	ڈاکٹر لکشمی نارائن
میاں بیوی کے جنسی تعلقات	ڈاکٹر لکشمی نارائن
جنسی تعلقات کے عجیب و غریب پہلو	ڈاکٹر لکشمی نارائن

ہند پاکٹ بکس پرائیویٹ لمیٹڈ

جی۔ ٹی۔ روڈ، شاہدرہ۔ دہلی - ۳۲

بِراج

خوب چلاؤ گلا پھاڑ دو سب
پنبہ در گوش ہے زیست
ہم بندھے بیٹھے ہیں خود اپنی ہی تاویلوں میں
زور سے بولے تو ناموسِ وفا جائے گی
لب ہلائے تو ہر اک کہنہ روایت، رشتے
سالہا سال کی تاریخ کے تابندہ سنہری اوراق
یوں بکھر جائیں گے، اک پُرزہ ملے گا نہ کہیں
خواجہ نے ایسی بہت باتیں اڑا رکھی ہیں
خود کو محصور کئے بیٹھا ہے اک گنبد میں
جیسے یہ شیشے کا انسان ہے بے روح و صدا
ہم مگر خواجہ نہیں، ڈر ہمیں کس بات کا ہو
ذرّہ جب ٹوٹا تھا، تخلیق ہوئی تھی یہ زمیں
پنبہ در گوش ہے زیست
سانس کی نالی کو اک دھونکنی سمجھو، چیخو

اتنا چلاؤ کہ اک شور سے بھر جائے فضا
گونج الفاظ کی کانوں میں دھواں سا بن جائے
اک دُھنی روئی سے بن جائیں عقائد سارے
فلسفے، مذہب و اخلاق، سیاست، ہر چیز
ایسے گتھ جائیں، ہر اک اپنی حقیقت کھو دے
ایسا اک شور بپا کر دو، کوئی بات بھی واضح نہ رہے
ذرہ جب ٹوٹا تھا تخلیقِ زمیں سے پہلے
ابتری پھیلی تھی، واضح نہ تھا کچھ بھی، ہر شے
اک دُھنی روئی کی مانند اُڑی پھرتی تھی
خود کو کم مایہ نہ سمجھو، اٹھو، توڑ دو یہ سکوت
پھر نئے دور کا آغاز ہو تاریکی سے

سبزۂ بیگانہ

حسب نسب ہے، نہ تاریخ و جائے پیدائش
کہاں سے آیا تھا، مذہب نہ ولدیت معلوم

مقامی چھوٹے سے خیراتی اسپتال میں وہ
کہیں سے لایا گیا تھا، وہاں ہے یہ مرقوم
مریض راتوں کو چلّاتا ہے ــــ "مرے اندر"
اسیر زخمی پرندہ ہے اک، نکالو اسے
گلو گرفتہ ہے، یہ حبس دم ہے، خائف ہے
ستم رسیدہ ہے، مظلوم ہے، بچالو اسے"
مریض چیختا ہے، درد سے کراہتا ہے
یہ دیت نام کبھی ڈومنکن، کبھی کشمیر
زرکثیر، سیہ قومیں، خام معدنیات
کثیف تیل کے چشمے، عوام، استحصال
زمیں کی موت، بہیمیت، فضائی جنگ، ستم
اجارہ داری، سبک گام، دلربا، اطفال
سرود و نغمہ، ادب، شعر، امن، بربادی
جنازہ عشق کا، دف کی صدائیں، مُردہ خیال
ترقی، علم کے گہوارے، روح کا مدفن
خدا کا قتل، عیاں زیرِ ناف زہرہ جمال

تمام رات یہ بے ربط باتیں کرتا ہے
مریض سخت پریشانی کا سبب ہے یہاں
غرض کہ جو تھا شکایت کا ایک دفتر تھا'
نتیجہ یہ ہے' اسی روز منتقل کر کے
اسے اک اور شفا خانے کو روانہ کیا
سُنا گیا ہے' وہاں نفسیات کے ماہر
طبیب حاذق و نباض' ڈاکٹر کتنے
طلب کئے گئے اور سب نے اتفاق کیا
یہ کوئی ذہنی مرض ہے' مریض نے شاید
کبھی پرندہ کوئی پالا ہوگا' لیکن وہ
عدم توجہی یا اتفاق سے یوں ہی
بچارہ مر گیا' اس موت کا اثر ہے یہ
عجیب چیز ہے تحتِ شعور انساں کا
یہ اور کچھ نہیں احساسِ جرم ہے جس نے
دل و دماغ پہ قبضہ کیا ہے اس درجہ
مریض قاتل و مجرم سمجھتا ہے خود کو

کسی کی رائے تھی پس ماندہ قوم کا اک فرد
مریض ہو گا اسی واسطے سیہ قومیں
غریب کے لئے اک ٹیبو بن گئیں افسوس
کوئی یہ کہتا تھا یہ اصل میں ہے حبِ وطن
مریض چاہتا ہے ہم کفیل ہوں اپنے
کسی بھی قوم کے آگے نہ ہاتھ پھیلائیں
یہیں پہ تیل کے چشمے ہیں وہ کریں دریافت
گماں کسی کو تھا، یہ شخص کوئی شاعر ہے
جو چاہتا تھا جہاں گردی میں گزارے وقت
حسین عورتیں مائل ہوں، لطف و عیش رہے
قلم کے زور سے شہرت ملے زمانے میں
زرِ کثیر بھی ہاتھ آئے اس بہانے سے
مگر غریب کی سب کوششیں گئیں ناکام
شکست پیہم و احساسِ نارسائی نے
یہ حال کر دیا، مجروح ہو گئے اعصاب
غرض کہ نکتہ رسی میں گزر گیا سب وقت

وہ چیختا ہی رہا، درد کی دوا نہ ملی
نشست بعد نشست اور معائنے شب و روز
انھیں میں وقت گزرتا گیا، شفا نہ ملی
ہر ایک شام وہاں سُرمہ در گلو آئی
جو اس کے واسطے گویا طبیب حاذق تھی
کسی نے پھر نہ سنی درد سے بھری آواز
کراہتا تھا جو خاموش ہو گیا وہ ساز
برس گزر گئے اس واقعے کو ماضی کی
اندھیری گود نے کب کا چھپا لیا اس کو
مگر سُنا ہے شفا خانے کے در و دیوار
وہ گرد و پیش، جہاں سے کبھی وہ گزرا تھا
خراب، بستیاں، جنگل، اُجاڑ راہگزار
اسی کی چیخ کو دہرائے جا رہے ہیں ابھی
"کوئی مداوا کرو ظالمو، مرے اندر
اسیر زخمی پرندہ ہے اک، نکالو اسے
گلو گرفتہ ہے یہ، حبس دم ہے، خائف ہے
ستم رسیدہ ہے، مظلوم ہے، بچا لو اسے"

انور عظیم

مولاں روڑ

— طویل افسانہ

فرانسیسی کونیاک ہو یا شمپین، حسینہ ہو یا زبان، دریائے سین پر کھیلتی ہوئی ہوائیں ہوں یا درختوں پہ جھکے ہوئے بادل۔ ہر چیز میں ایک جادو ہے۔ مانا۔ ایسا نہ ہوتا تو میرا نام مولاں روڑ کاہے کو پڑتا۔ یہی دیکھئے ناکہ میری کونسی ادا مولاں پرڈر والی ہے۔ لیکن ہوں میں مولاں روڑ۔ پلا بڑھا ہیں کے سرد گرم اور گرد و غبار میں، مگر نام اکسپورٹ ہوا سات سمندر پار سے۔ اب تو خیر سے برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن ہے۔ اور جوانی کے دن ہیں، جوانی کی راتیں۔ لیکن جب میں پیدا نہیں ہوا تھا، تو میں صرف کھنڈر تھا۔ کچھ ٹوٹی ہوئی دیواریں، اونٹ کے کوہان جیسے بھورے سرمئی ٹیلے کے ڈھیر اور بس۔ اس کھنڈر کا ناتا میرے پچھلے جنم سے ہے۔ کوئی مجھ سے عمر پوچھے تو میں یہی کہوں گا ناکہ بس ہندوستانی تقسیم کے بعد کی پیداوار ہوں یعنی نئی نسل ہوں۔ لیکن مجھ میں نہ غصہ ہے، نہ نفرت ہے نہ بیزاری۔ نہ میرے بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں، اور نہ دیکھنے میں لڑکی یا عورت نظر آتا ہوں۔ کوئی یہ نہیں دیکھے گا کہ اس چمکتی دمکتی عمر سے اُدھر بھی میں زندہ تھا۔ کھنڈر ہی سہی مگر تھا تو۔ انسان کی طرح میری عمر بھی دس، بیس، پچاس سال نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جس طرح انسان کی عمر دس، بیس، پچاس سال نہیں ہو سکتی، اسی طرح میری عمر کا اندازہ صرف صدیوں میں لگایا جا سکتا ہے۔ ایک عمر میں کئی کئی عمریں ہوتی ہیں۔ اور ایک زندگی میں کئی کئی زندگیاں۔

جی چاہتا ہے کوئی سنے اور میں سناؤں۔

جب میں کھنڈر تھا۔ درختوں میں گھرا ہوا، ویران، اداس اور خوف زدہ۔ میرے مٹے ہوئے در و دیوار پر دوب اُگ رہی تھی، جسے بکریاں چر جایا کرتی تھیں۔ دن کو کوئی میرے پاس پھٹکتا تک نہ تھا، البتہ رات کو میری قسمت جاگتی تھی، جب ستارے جاگتے تھے۔ چور اُچکے میرے دل کے اندھیرے میں بیٹھ کر سبز باغ دیکھتے اور دکھاتے تھے اور کبھی کبھی کوئی زمانے کا ستایا ہوا عاشق تانگے پر اپنی معشوقہ کو لے کر آ جاتا تھا۔ اور میری پناہ میں زمانے کے ظلم و ستم کی ساری کسر اس جان جہاں سے نکالا کرتا تھا۔ جسے وہ بھینچتا بھی تھا اور گالیاں بھی دیتا تھا۔

کوئی سنے تو میں سناؤں۔

اس بھیانک رات کی بات! بھورے کالے بادل گھر آئے تھے۔ اور یہاں، جہاں اب شہر کا سب سے

ماڈرن ریسٹورنٹ ہے، ایک عورت کا خون ہوا تھا۔ عورت ایک تھی اور مرد تین۔ سب نے دارو پی، کوئی کڑوی چیز تھی آگ جیسی جلتی ہوئی۔ ایک تیزابی دھواں سا اُٹھتا تھا۔ اور دماغ میں بھر جاتا تھا۔ عورت نے نہیں پی۔ وہ مٹھائی کھاتی رہی اور اندھیرے میں منہ بناتی رہی۔ اور شوخی بھی دکھاتی رہی۔ چوڑیاں چھنکتی رہیں۔ تھوڑی دیر میں فضا بدلنے لگی تینوں عورت کو اپنی اپنی طرف کھینچنے لگے۔ تھوڑی دیر تو یہ کھینچا تانی رہی۔ پھر تینوں آپس میں گتھ گئے۔ عورت بھاگی۔ تینوں اپنی لڑائی بھول گئے۔ اور عورت پر جھپٹے جیسے باز گوریا پر جھپٹتا ہے۔ چھرے نکل آئے اور اس عورت کی تکا بوٹی ہوگئی۔ جسم کے ٹکڑے ہوگئے۔ (روح کا حال تو اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے) عورت کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں۔ جو مٹھائی کھا رہی تھی اور اندھیرے میں دارو پیتے ہوئے مردوں کی بھاری بھاری سانس کی آواز سن رہی تھی۔

ہاں بالکل یہیں جہاں چھوٹی سی میز کے نیچے سرخ قالین پر خوبصورت سردارنی کے سینڈل کی نوک کیل کی طرح ہل رہی ہے۔ اگر کوئی دو تین فٹ فرش کھودے تو وہ ہڈیاں مل جائیں گی۔ ننگی میلی ہڈیاں۔ اور اب مجھے لگتا ہے وہی ہڈیاں زمین سے اُگ آئی ہیں۔ اور اس کرسی پر بیٹھ گئی ہیں۔ جہاں سردار تیجا سنگھ، سیمنٹ اور اینٹ کا ٹھیکیدار چار کورس کا کھانا کھا کر جماہیاں لے رہا ہے۔ اور کمر پر بلٹ ڈھیلی کر رہا ہے۔ ہڈیوں پر گوشت چڑھ گیا ہے۔ ضرورت سے زیادہ گوشت جلد پر سنہرا رنگ پھیل گیا ضرورت سے زیادہ سنہرا۔ آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں پپوٹے سوجے ہوئے ہیں ضرورت سے زیادہ سوجے ہوئے۔ ٹھوڑی ڈبل ہوگئی ہے۔ موٹی موٹی باہوں پر روئیں اُگ آئے ہیں۔ ضرورت سے زیادہ روئیں۔ ایک کلائی میں گھڑی چمک رہی ہے۔ فیروزی رنگ کا نائیلونی آنچل بار بار ڈھلک رہا ہے۔ اور تنگ بلاؤز ابلتے ہوئے سینوں کو یوں دبا رہا ہے کہ ہر شخص کی نظر اسکی موٹی تہہ دار کمر پر پڑ رہی ہے۔ سردارنی کے سینوں میں غضب کا تلاطم ہے، لیکن باقی جسم سرد ہے۔ رفریجریٹر میں رکھے ہوئے تربوز کی طرح سرد۔ وہ چار کورس کا کھا کر بھی بھوکی ہے۔ یہہ بھوک اس کے پیٹ سے شروع ہوتی ہے اور ناف سے بھی۔ وہ چاروں طرف دیکھ رہی ہے اور ہونٹ چاٹ رہی ہے۔ ہونٹوں کی سرخی اتنی گہری ہے کہ اسکی لالچی، پیاسی زبان بھی چاٹ چاٹ کر اُسے پھیکا نہیں کر سکتی۔

چھت کتنی نیچی ہے، 'کالی' پرچھائیاں جانور کی طرح لرز رہی ہیں۔ دیواروں پر رنگ دھبوں کی طرح پھیلے ہوئے ہیں۔ دھوپ چھاؤں کی طرح۔ ایسا ہے کہ عکس روشنی میں جذب ہوگیا ہے۔ اور روشنی عکس میں۔ ہر چند میز کے بعد دیواریں شطرنج کے مہروں کی طرح کھڑی ہوگئی ہیں۔ روشنی اور پرچھائیوں سے ایسا جھٹپٹا ہو رہا ہے کہ میز اور کرسیاں جاگ رہی ہیں اور عورتیں، مرد لڑکے، لڑکیاں سو رہے ہیں۔

سنجوگتا کنارے والی میز پر کونے میں بیٹھی ہے۔ سفید ڈوپٹہ گردن میں ہے، کرتا گھٹنوں پر کسا ہوا ہے۔ شلوار خوبصورت ٹانگوں سے چپکی ہوئی ہے۔ اسکی سفید چپلیں اس کے پیروں کو چھوڑ چکی ہیں اور ایرکنڈیشنڈ ریستوران

کی خنکی نرم قالین پر رینگ رہی ہے۔ اور اسکی تھکی ہوئی انگلیوں کو سہلا رہی ہے۔ اس کے پورے جسم میں گدگدی ہو رہی ہے۔ نجیت اپنے بھورے کوٹ کے بٹن بند کرتا ہے اور کھولتا ہے۔ کھولتا ہے اور بند کرتا ہے۔ اسکی جیب میں چار مینار سگریٹ کے دو پیکٹ ہیں۔ لیکن میز پر گولڈ فلیک کا پیکٹ ہے۔ وہ پوری شام تھرتھراتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ پر سگریٹ سلگاتا رہا ہے۔ اس کا ستا ہوا چہرہ زرد پڑ گیا ہے۔ اور اسکی آنکھوں سے دھواں نکل رہا ہے۔ وہ سوکھتی ہوئی زبان اپنے سوکھتے ہوئے ہونٹوں پر پھیرتا ہے۔ اور روہانسی آواز میں کہتا ہے۔

"کبھی کبھی میرا جی تڑپ اٹھتا ہے۔

"I so madly want to kiss you.

"Do you? what a crazy idea?

"May be!"

"یہ فضول ہے۔ ہر چیز فضول ہے! "Futile

(پاس کی میز سے ایک ٹھیکیدار کی فلسفیانہ آواز آتی ہے، But that's how the life is made")

"تم نہیں سمجھیں..... میرا مطلب ہے، میرے اندر جو ایک مرد ہے اور تمہارے اندر جو ایک عورت ہے"

اسکی زبان سوکھنے لگتی ہے اور اس سے کچھ کہا نہیں جاتا۔

"میں سمجھ گئی" سنجوگتا نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا لیتی ہے۔ خنکی اس کے ننگے پیروں کو گدگدا رہی ہے۔ "ہوگا! بیوقوف!"

"ستی کتھے جاندے او" دوسرے کونے سے آواز آتی ہے۔

سردار جی اور سردارنی بل ادا کر چکے ہیں، خلال کر چکے ہیں۔ ٹیپ کین میز پر رکھ چکے ہیں۔ فنگر باؤل میں نیبو کا ٹکڑا تیر رہا ہے۔ انھیں اب جانا ہے۔ انھیں کسی کا انتظار نہیں ہے۔ مگر بیٹھے ہیں اور نیم وا آنکھوں سے پورے مولاں روڈ کا، یعنی میرا، جائزہ لے رہے ہیں۔

مولاں روڈ کی چھت سے موسیقی کی پھواریں برس رہی ہیں۔

مشہور پینٹر رائے سب سے مدھم گوشے میں بیٹھ گیا ہے، جہاں ہری بیل بہت سے پتوں کا بوجھ سنبھالے ہوئے چھت کی طرف بڑھ رہی ہے۔ یہ بڑا بد مذاق شہر ہے، بیہودہ، گنوار۔ بس ایک چھوٹا سا کونا ہے جہاں — اگر میری پینٹنگ مہارانی نے خرید لی اور اگر نیویارک ______"

میں یہ سب دیکھتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، میں ان سب کے ساتھ جیتا اور مرتا ہوں۔ دن میں سو سو

بار ـــ یہ آتے ہیں، کچھ کھاتے ہیں، کچھ پیتے ہیں، چلے جاتے ہیں، مجھے بھول جاتے ہیں، لیکن میری روح آنکھوں کی روشنی کی طرح ان کے ساتھ جاتی ہے۔

اُتم سنگھ، جو میرا مالک ہے، بڑا روشن خیال آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے ایسے ریستوران صرف پیرس میں ہوتے ہیں۔ میں بھی یہی کہتا ہوں ـــ اور یہ لوگ بھی جو شاندار کپڑوں میں، بڑی بڑی خوبصورت کاروں میں، نوجوان لڑکے لڑکیاں جو ایک دوسرے سے چپکے ہوئے اسکوٹروں پر یہاں آتے ہیں۔ جن کے کپڑوں سے بڑی طرحداری اور چلنے اور بولنے کے انداز سے بڑی بے نیازی ٹپکتی ہے ـــ سب یہی کہتے ہیں۔

"ہائے abstract pattern جو سب کچھ ہونے پر بھی کچھ نہیں، جو کچھ نہیں ہے، پھر بھی سب کچھ ہے ـــ لڑکیاں خالی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتی ہیں اور ان کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔

میرے ناک نقشے میں وہ بات نہیں ہے، جو عام ریستورانوں میں ہوتی ہے۔ میرا انداز ترا تیکھا ہے۔ سب سے الگ۔ روشنی ہے تو ایسی کہ پرچھائیاں معلوم ہوں، میزیں، دیواریں، لکیریں، پردے، جھالر، ہر چیز کا اپنا انداز ہی الگ ہے۔ ہر چیز آڑی ترچھی ہے۔ اب اس میز کو دیکھو کونے میں، جہاں اس چھوٹی سی دیوار کا سایہ پڑ رہا ہے، جس پر پلاستر نہیں کیا گیا ہے۔ دیوار پر ایک سیاہ تختہ ہے، جس پر سرخ، ہرے اور پیلے رنگ ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہے ہیں۔ اور بیچ بیچ میں سیپیاں اور درخت کی چھال کے ٹکڑے لگے ہوئے ہیں۔ جو اس دھندلکے میں چڑیل کی آنکھیں معلوم ہوتے ہیں۔ دو دو تین تین میزوں کو الگ کرنے والی سیاہ اور سرخ دیواروں میں روزن بنے ہوئے ہیں۔ جن سے روشنی نہیں گذرتی لیکن نگاہیں گذرتی ہیں اور پراسرار پرچھائیوں کو دیکھتی ہیں، جو ایک دوسرے کے لئے اجنبی ہیں۔ لیکن جو ایک دوسرے کی تلاش میں ہیں۔ ایک دوسرے میں جذب ہو جانے کو بے قرار۔

روزنوں کے دونوں طرف دھندلکوں میں کیسے کیسے ہونٹ ہل رہے ہیں۔ کیسی کیسی آنکھیں کھل رہی ہیں، اور خوابوں کے بوجھ سے بند ہوتی جا رہی ہیں۔ کیسی کیسی باہیں ہیں۔ ٹھنڈی۔ دُبلی۔ بھری بھری۔ گوری اور گندمی باہیں ـــ روشنی کی طرح تیرتی ہوئی، مڑتی ہوئی باہیں، اور گردنیں، جھکی ہوئی بھی، تنی ہوئی بھی، جیسے اُن کے سامنے لہراتی ہوئی باہیں، باہیں نہ ہوں۔ تلواریں ہوں ـــ زلفیں کٹی ہوئی بھی ـــ بکھری ہوئی بھی، گھٹاؤں کی طرح اُمڈی ہوئی بھی، جو ذرا ذرا سی جنبش پر رات کی طرح پھیل جاتی ہیں، بکھر جاتی ہیں۔ نہ جانے نگاہوں اور دلوں کے کن اجالوں پر چھا جاتی ہیں۔

کونے میں باتھ روم کے پاس، جہاں ہری بھری بیلیں لٹک رہی ہیں، جہاں سُرخ میز کو تین طرف سے چھوٹی چھوٹی دیواروں نے آن گھیرا ہے۔ جہاں دھندلکے کو اندھیرے نے دبا دیا ہے۔ ذرا اُدھر بھی دیکھو، ـــ یہ ہونٹ ہیں ہونٹ۔ ان کا رنگ یاقوتی ہے لیکن کالے لگ رہے ہیں۔

"نہیں ڈارلنگ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ تم بڑے ریشنل آدمی ہو۔ سمجھو۔ اب میں اس زندگی سے تھک گئی ہوں۔ آگ بجھ رہی ہے۔ آگ بجھانا ہی ہے تو بھرے بازار میں کیوں بجھے۔ کسی جنگل میں۔ کسی غار میں، کسی ——"

ہونٹ ہل رہے ہیں۔ لگتا ہے دو باریک پتھر ٹکرا رہے ہیں اور چنگاریاں بکھر رہی ہیں۔

"میں اکیلا کیا کروں گا —— دس سال کا ساتھ کم نہیں ہوتا میری جان۔ دس سال میں تو انسان ......"

ہونٹ مسکراتے ہیں، لب اشک سے بھیگے ہوئے اداس ہونٹ، لرزتے ہوئے تشنہ، زہر پیتے ہوئے ہونٹ۔

"تم Sentimental بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ ٹہنی چٹخ گئی ہے، پتّے جھڑ چکے ہیں۔"

پتّے۔ پتّے۔ پتّے۔ تاش کے پتّے۔"

"ڈارلنگ وعدہ کرو۔ تم مجھے بھول جاؤ گے، تم اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ خوش رہو گے۔ ڈارلنگ اب تم اڑتالیس کے ہو گئے۔ شام کو پنچھی گھونسلے میں لوٹ جاتے ہیں۔"

"اب تم سنی مینٹل ہو رہی ہو۔ تم اس جٹا دھاری ٹھیکیدار کا گھر بسانا چاہتی ہو، جو عورت اور سنترے میں کوئی فرق نہیں سمجھتا۔ جو..... "

"لیکن وہ اچھا آدمی ہے ڈارلنگ۔ اس نے اڑتالیس سال زندگی کے تنہائی میں گذار دیئے۔ اسکی نہ کوئی بیوی ہے اور نہ بچے۔"

"لیکن اس کے پاس سرکاری ٹھیکے کتنے ہیں —؟ جانتی ہو اس کا بینک بیلنس؟

"ڈارلنگ وہ بڑا بدقسمت انسان ہے۔"

"لیکن میں اس سے زیادہ بدقسمت ہوں۔"

ہونٹ مسکرا رہے ہیں، ہونٹ لرز رہے ہیں۔ گہرے دھندلکے میں ہونٹوں کے سوا اور کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

"تم بڑے سویٹ ہو۔"

"سویٹ۔ سویٹ۔ بتاؤ پڈنگ کھاؤ گی یا کیسٹرڈ؟"

"پڈنگ —— اور تم۔؟"

"میں بھی ——— ڈیئر!"

چٹکیاں بجتی ہیں۔ ٹھنڈے ہونٹ۔ ٹھنڈے ہونٹوں کو چھو کر لرز جاتے ہیں۔ مرد اور عورت، دونوں کے جسموں میں تھرتھری دوڑ جاتی ہے۔

ہری بیلوں سے آگے، اینٹوں کی سرخ دیوار کے پاس، جہاں سائے اتنے گہرے ہو گئے ہیں کہ آدمی کی صورت پہچانی نہیں جاتی، سرخ دروازہ کھلتا ہے، جس کے بیچوں بیچ زرد الو کی گول آنکھیں دھندلکے میں کبھی پھیلتی اور کبھی بند ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ مغربی اٹی کیٹ کا پتلہ، سیاہ سوٹ میں کھڑا اپنے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر پنسل دوڑا رہا ہے۔ وہ دروازے میں داخل ہونے والے ہر شخص کو جھک کر "ویل کم" کرتا ہے اور مختلف کونوں میں میزوں کی طرف بڑھنے کا اشارہ کرتا ہے۔ ہیولے داخل ہوتے ہیں اور مختلف کونوں میں کھو جاتے ہیں، بکھر جاتے ہیں، موسیقی کی طرح دھندلکے کی طرح۔

دروازہ کھلتا ہے۔ زرد الو کی آنکھ پھیل جاتی ہے۔ دھوپ کی شفاف سِل دروازے میں چمکتی ہے۔ میری آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ دھوپ کی شفاف سِل کو چیر کر ایک بڑا سا ہیولا میرے دل میں داخل ہوتا ہے اس کے پیچھے چند اور ہیولے داخل ہوتے ہیں۔ مغربی اٹی کیٹ کا پتلہ اس گروہ کو اس کونے کی طرف لے جاتا ہے، جہاں ایک سیاہ تختے پر موٹی موٹی سرخ لکیروں اور ٹوٹے پھوٹے زاویوں سے ایک عورت کے نقوش ابھارے گئے ہیں۔ ان نقوش کے بارے میں اکثر رائیں ٹکراتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ عورت نہیں ہے، بکری ہے، کوئی کہتا ہے، یہ نہ عورت ہے اور نہ بکری ——— یہ تو 'اسٹل لائف' ہے۔ اس کے بغل کے بال دیکھو، ناف کے نیچے دیکھو——— یہ کیا ہے عقل کے اندھے، کیا بلیسڈ ڈمبل ایسی ہوتی ہے؟"

یہ شخص جو ابھی ابھی، اپنے قافلے کے ساتھ آ کر بیٹھا ہے، بڑا انٹرنیشنل آدمی ہے۔ ایر انڈیا انٹرنیشنل کے مہاراجہ کی طرح۔ مونچھیں نہیں ہیں تو کیا ہوا۔ بڑا نام ہے اس کا۔ بہت بڑا لیکھک ہے۔ اس کا سگار دیکھو۔ اس کی عینک دیکھو، اس کا سر دیکھو، شیشم جیسا جسم دیکھو۔ اس کی ذہین آنکھیں دیکھو۔ اس کی آنکھوں میں چمکتی ہوئی محبت اور حلم دیکھو——— بڑی دراز قد، گدبے دار شخصیت ہے۔ یہاں بہت سے آتے ہیں، میں جانتا ہوں وہ کتنے پانی میں ہیں لیکن اس کی تھاہ تو میں بھی نہیں پا سکا۔ اپنے دشمن کو بھی گلاب کی کلی کی طرح شاخ سے توڑ کر اپنے کالر کے کاج میں سجا لیتا ہے۔ بہت ہی گہرا آدمی ہے۔ بہت ہی گہرا۔ اپنے بانکے اور ڈھیلے جسم کے ساتھ لندن اور پیرس کے ڈانس فلور پر ناچ چکا ہے۔ بڑا تجربہ کار آدمی ہے۔

گہرا آدمی، میز کی دوسری طرف بیٹھے ہوئے دوسرے گہرے آدمی سے کہتا ہے: "نمائش بڑی کامیاب رہی۔ میں پچھلے سال نمائشوں کے موسم میں، پیرس میں تھا۔ اتنی اچھی نمائش تو میں نے وہاں بھی نہیں دیکھی۔"

دوسرا گہرا آدمی، پہلے گہرے آدمی کی طرح گہرائی جانتا ہے۔ وہ اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرتا ہے، پھر اپنے پاس بیٹھی ہوئی لڑکی کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ پھر اپنے پائپ کا پورا کش اپنے سینے میں اتار لیتا ہے۔ جیسے اُس کے پائپ میں بہترین ولائتی تمباکو نہیں بلکہ سلگتے بیٹھے ہوئے، مسکراتے ہوئے پرسکون انسان کا دماغ بھرا ہوا ہے۔ وہ دھواں آہستہ آہستہ منھ سے اگلتا ہے اور کہتا ہے۔ "ایک کینوس بھی اورجنل نہیں تھا۔ ! Nothing Soulful"

وہ پھر لڑکی کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے اور اس کی کافی کے گلاس میں آئس کریم کو پگھلتے ہوئے دیکھتا ہے۔

پہلا گہرا آدمی اسی طرح مسکراتا ہے۔ اس کے ذہن میں اب تک جرنلسٹ کلب کی باتیں گونج رہی ہیں۔ آنکھوں میں بیئر کی بوتلیں تیر رہی ہیں ــــــ "امریکی سالے وہاں سے ہٹ کر نکلیں گے۔" "چینی بڑے بہادر ہیں تو تائیوان پر قبضہ کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میں ہی نہیں ساری دنیا اس کولڈ وار سے اکتا کر خودکشی کرے گی۔"

"And then you will See"!

"There will be nothing to see..."

"نہیں نہیں۔ سب یوں ہی چلتا رہے گا۔ بم بھی گرتا رہے گا۔ اور امن اور دوستی کی باتیں بھی ہوتی رہینگی۔"

گہرے آدمی کی نگاہیں، لڑکی کے دھندلے نقوش کو چوم رہی ہیں۔ "Charming" اس کے دانت سگار کو دبائے ہوئے ہیں۔ اور اسکی آواز سگار سے پھوٹتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

"میں کہتا ہوں رضی کا فن اورجنل ہے۔ اسکی نمائش ہونی چاہیئے۔"

دوسرا گہرا آدمی لڑکی کے شانوں پر ہاتھ پھیرتا ہے اور میز کے نیچے اُس کے پیر لڑکی کے پیروں کو تلاش کرتے ہیں۔ اور پہلے گہرے آدمی کے بڑے بڑے جوتوں سے ٹکرا جاتے ہیں۔ گہرا آدمی مسکراتا ہے۔

"فن میں اورجنلٹی کیا ہوتی ہے بھائی۔ اور اگر اس ترازو میں تمہارے ناول کو تولا جائے تو ـــ"

"یہ بڑا بھونڈا اکسپریشن ہے۔ ناول کو ترازو میں تولنا۔"

"ہاہاہا!"

لڑکی کی آنکھیں اٹھتی ہیں۔ پہلے گہرے آدمی کی نگاہیں بھنوروں کو ڈھونڈتی رہ جاتی ہیں۔

"تم ہمیشہ ایٹرنل ویلوز اور اورجنلٹی کی باتیں کرتے ہو لیکن...."

"میں تمہاری طرح نارکس وادی نہیں ہوں۔ میں کنول کا پھول ہوں، جو پانی میں رہ کر بھی پانی کے اوپر رہتا ہے۔"

لڑکی مسکراتی ہے، آئس کریم کھاتی ہے اور اس نوجوان کی طرف دیکھتی ہے جسے اپنے ڈیلی پیپر میں ناٹ

ڈیوٹی کے لئے بھاگتا ہے۔ لیکن وہ لڑکی کو ان دو گہرے آدمیوں کے پاس چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ کھلتے ہیں۔

"رجنی میں تمہیں گھر چھوڑتا ہوا پریس چلا جاؤں گا۔"

"تم جاؤ۔ ہم ابھی رجنی کے "ون مین شو" کے بارے میں باتیں کریں گے۔"

دوسرا گہرا آدمی پائپ چوستے ہوئے سوچتا ہے۔

"اگلے ناول میں رجنی کا بوہیمین کیرکٹر ابھاروں گا۔ عورتیں تو میں نے بہت دیکھی ہیں۔ مگر یہ عورت، یہ عورت، یہ عورت ———"

وہ اس کے شانے پر ہاتھ پھیرتا ہے۔ بوہیمین لڑکی اس کے پائپ کو نفرت سے دیکھتی ہے اور کہتی ہے۔

"مسٹر سنتوش آپ کا ہاتھ بہت بھاری ہے۔"

"یہی بات تمہارے پیروں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے"۔ گہرا آدمی ہنستا ہے۔

دنیا کے تمام بڑے بڑے آرٹسٹ صحت کے معاملے میں ——— یہ تو صرف بھوکے ہندوستان میں

"You have sense of humour really"

وہ اپنے بھاری ہاتھ سے لڑکی کے شانے کو سہلاتا ہے۔ پہلا گہرا آدمی، جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہوئی ہے، جمائی لیتا ہے اور دوسرے گہرے آدمی کی انگلیوں کو دیکھتا ہے، جو بوہیمین لڑکی کے سانولے شانے پر تیر رہی ہیں۔

"میں کہتا ہوں ہندوستانی میوزک کبھی آرکسٹرا کی سطح پر ——— نہیں نہیں میں چلتی ہوئی دھنوں کی بات نہیں کر رہا ہوں ——— پیانو، ہندوستانی موسیقی کا ساتھ نہیں دے سکتا ——— لیکن پیانو پر دوڑتی ہوئی انگلیاں . . . . ."

شانے پر دوڑتی ہوئی انگلیاں رک جاتی ہیں۔ میز کے نیچے ناول نگار کے پیر اپنے اگلے ناول کا پلاٹ تلاش کرتے رہتے ہیں اور پہلا گہرا آدمی اپنے سگار سمیت سکڑتا ہے۔ اچانک اس کا چہرہ پراسرار ہو جاتا ہے۔ جیسے پادری کا چہرہ جو منبر پر کھڑا ہو . . . .

"کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں بہت بڑا فراڈ ہوں۔"

لڑکی کی آنکھیں اس کی طرف اٹھتی ہیں۔ نشے میں آدمی کتنا سچا ہوتا ہے۔ "رتن بھائی" لڑکی کی آنکھیں کھلتی ہیں اور بھنور سے اڑ جاتے ہیں۔

"ہاں میں سچ کہتا ہوں۔ پچھلے تیس سال میں کیا لکھا ہے میں نے؟ لندن اور پیرس کی گپ ہانکنے کے سوا، مارکس اور گورکی کے اگلے ہوئے نوالے چبانے کے سوا . . . میں بڑا فراڈ ہوں ———"

"تم شراب پی کر ٹائیں بائیں شائیں بکنے لگتے ہو۔ تم نے نئے ہندوستان کے نئے کلچر کو ایک ڈائرکشن دیا ہے۔
میرا مطلب ہے.... سمت.... افق...."

"Roz! I'm a fraud"

"رجنی بس میں تو رتن بھائی کے اسی بھول پن پر جان دیتا ہوں"۔
"میں بھی" بوہیمین لڑکی کہتی ہے، جس کے بال کانوں اور پیشانی پر جھک آئے ہیں۔

"I like this old guy!"

ایک کونے میں تین چار مغربی ڈپلومیٹ دو تین سرکاری افسروں اور ٹھیکیداروں کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ ایک امریکی عورت، جو کسی پریس ایجنسی کی نمائندہ ہے، اپنے پرس سے ہاتھی دانت کا سگریٹ ہولڈر نکالتی ہے، اور سگریٹ سلگاتی ہے۔

فرانسیسی ڈپلومیٹ عجیب و غریب لہجے میں انگریزی بولتا ہے اور سگریٹ ہولڈر کی تعریف کرتا ہے۔ پھر اپنا سگریٹ کیس نکالتا ہے، جو اُسے کسی "ہارانی شنے دیا ہے۔ ڈپلومیٹ کے دانت سگریٹ نوشی کی وجہ سے پیلے پڑ گئے ہیں۔ اسکی عمر زیادہ نہیں ہے۔ لیکن آنکھوں کے گرد جھریاں پڑ گئی ہیں۔ جن سے چھن کر مسکراہٹ کی چمک آنکھوں میں تیرتی ہے۔ وہ امریکی جرنلسٹ کا ہاتھ دباتا ہے اور مسکراتا ہے۔

"زندگی کے تجربے بڑے عجیب ہوتے ہیں" وہ کہتا ہے اور عورت کی چالاک آنکھوں میں جھانکتا ہے، جن کی پلکوں کو میک اپ نے بہت بوجھل بنا دیا ہے۔ عورت کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ لیکن سُرخ دہکتے ہوئے ہونٹ ہنستے رہتے ہیں۔
یہ ڈپلومیٹ، جو دنیا کے بڑے بڑے نائٹ کلبوں سے آتے ہیں، بمبئی پر جان دیتے ہیں کیونکہ یہاں انھیں پیرس کی خوش مذاقی بھی ملتی ہے اور ایشیائی تہذیب کا اسرار بھی نظر آتا ہے۔

انھیں ہمارے یہاں کا کھانا بہت پسند ہے۔ کیونکہ ہمارا باورچی ہنگرین ہے۔ جو ۱۹۵۶ء میں بداپسٹ سے ویئنا بھاگ گیا تھا۔ یہ من چلا ہنگرین ویئنا سے برلن گیا، برلن سے پیرس اور پیرس سے یہاں آ گیا۔ انسان بھی عجیب تنکا ہے۔ ہوا میں اڑ کر کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ اس کا پکایا ہوا چکن گولاش اتنا مزیدار ہوتا ہے کہ یہ ڈپلومیٹ اپنے گھٹنوں پر نیپ کن بچھاتے ہی منھ سے رال ٹپکانے لگتا ہے۔ "Sweet! Isn't it?"

یہ ڈپلومیٹ کتنی بے نیازی سے، کتنی گہری اور خطرناک باتیں کرتے ہیں۔ کالی عینک والا شخص جو دو تین لفظوں میں ہر سوال کا جواب دے رہا ہے اور جس کی گردن کی رگیں منھ کھولتے ہی جونکوں کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ سوپ پیتے پیتے نیپ کن سے ہونٹ خشک کرتا ہے۔ اور میز پر گھونسہ مارتا ہے —— "کیونسٹ —— گیس —— بم —— عورت —— بچے —— ویت نام "Let them die! let them

die — the food is delicious —"

میز پر ایک رسالہ کھلا پڑا ہے جس کی تصویر میں ایک مردہ ویت نامی ماں کے سینے کو ننھا سا بچہ ٹٹول رہا ہے ———— !

ہمارا ہنگرین باورچی یہ باتیں نہیں سنتا — وہ اپنا سوپ اور گولاش پکانے میں لگا رہتا ہے۔ اُس کا چہرہ گول ہے۔ ٹماٹر کی طرح سُرخ۔ جب وہ پچھے میں گرم سوپ نکال کر چکھتا ہے تو اسکی آنکھیں بھی سُرخ ہو جاتی ہیں اس کے سر پر ترچھی سفید ٹوپی کبھی ایک طرف جھکتی ہے کبھی دوسری طرف — اور جب رات گہری ہو جاتی ہے سب یہاں سے چلے جاتے ہیں۔ ایرکنڈیشننگ مشین بند ہو جاتی ہے اور ہر طرف سے کھانے کی گرم خوشبو جھپٹتی ہے تو وہ اپنا سفید لباس اتار دیتا ہے۔ اور صرف بنیان اور انڈر ویر میں اوپر چھجے پر چلا جاتا ہے اور آنکھیں میچ کر دور کی روشن کھڑکیوں کو اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہے۔ خود ہی سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے۔

"آزادی آدمی کو کیا سے کیا بنا دیتی ہے — آزادی نے مجھے باورچی بنا دیا ہے"

پھر وہ گنگناتا ہے ———— "آزادی۔ آزادی — آزادی۔ چکن گولاش پکانے کی آزادی۔ چھجے پر سونے کی آزادی، گانا گانے کی آزادی"

وہ واقعی گانے لگتا ہے — اُس کی آواز میں بڑا سوز ہے۔ جب میری دیواروں کو اسکی آواز چھوتی ہے تو مجھے لگتا ہے کہ میں ایک جیل ہوں۔ رات مجھے تھپکیاں دے رہی ہے۔ لیکن میں جاگ رہا ہوں۔ کیونکہ پو پھٹنے سے پہلے میری دیواروں کے اس قیدی کو پھانسی کے پھندے میں لٹکا دیا جائے گا۔ رات، قیدی، پھانسی۔ اُس کی آواز سن کر چھجے کے نیچے شوفر، بیرے، سنتری وغیرہ مچھروں کو اڑاتے ہیں اور دانت پیس کر کہتے ہیں۔

"سالہ پاگل ہے۔ نہ جانے یہ ہنگرین کا بچہ سوتا کیوں نہیں!"

"ماں یاد آتی ہوگی!"

ہنگرین کو واقعی ماں یاد آتی ہے اور وہ گاتا ہے۔

رات، دھند۔ چاند۔

میرا شہر، میری ماں ———— خاموشی!

شہر کا دل، دریا، خاموش، رواں۔

دل، دل کی زنجیر، جھنکار!

برج کے اُجلے درخت، ہوا، دھند، چاند۔

ہونٹ، دھند، سانس، چاند ـــــ ہنگری کا چاند!
آگ پگھلتی ہوئی
سانس میں،
دھند، چاندنی اور پانی میں
گھلتی ہوئی
آگ!

بُڈاپسٹ کی ہواؤ
تم کہاں ہو؟

میں کہاں ہوں؟
میں بس اتنا جانتا ہوں
میں جہاں ہوں وہاں
نہ ماں ہے
اور نہ ٹکائی جیسی شراب،
جس میں نہ جانے کیسے کیسے ہونٹوں کی گہری
بالوں اور باہوں کی خوشبو
بسی ہوتی ہے۔
رات، دھند، چاند!

ہنگرین سو جاتا ہے اور خواب میں بڑبڑاتا ہے ـــــ
"آج میں چکن گولاش پکاتا ہوں۔ کل میں سانپ اور بچھو کا گولاش پکاؤں گا۔ کیونکہ میں آزاد ہوں، اپنے دریا، اپنی ہوا، اپنے گھنے درختوں سے دُور۔
"What a Silly Song!—"
میرے اندر صبح ہی سے شام ہے ـــ لیکن اب تو باہر بھی شام ہو چلی۔ اب جو دروازہ کھلتا ہے تو دھوپ

کی اس نہیں چکتی ۔ اب سرمئی دھندلکے میں چند سائے اندر آجاتے ہیں ۔ تھکے تھکے بھی، جولاں جولاں بھی، جسم بھی آتے ہیں اور روحیں بھی ۔ لچکتے ہوئے جسم، لڑکھڑاتے ہوئے جسم، ہمکتی ہوئی روحیں ۔ صراحی سے چھلکتی ہوئی گھبراتی ہوئی، بکھرتی روحیں ۔ ٹھنڈی فضا میں کیک، پیسٹری اور چائے، کافی کی خوشبو سی ہوئی ہے ۔ ٹرالی ٹرے، رنگین پلیٹیں، ہاٹ ڈاگ، مٹن ہمبرگر ۔ سموسے، پیٹیز، اورنج اسکواش، کوکا کولا ۔ گولڈن فوم ۔

"میں اسکی ایسی تیسی کر دوں گا ــــ یہ کیا اسٹائل ہے بادشاہو! لائٹ دینے میں بھی جان جاتی ہے ۔ لائٹ ہی نہیں ــ جس دیش میں لائٹ ہی نہیں ہوگی ــــ" ہری کپور اپنی اندر کی جیب میں نوٹوں کی گڈی کو انگلیوں سے چھوتا ہے ــــ

"ان سالوں کا ایرکنڈیشنڈ بھی جعلی ہے ۔"

ہری کپور کا سر بہت بڑا ہے اور بال کھڑے ہیں ۔ اسکی ٹیری لین کی قمیض کے نیچے سے میلا بنیان جھانک رہا ہے ۔ اس کے ہونٹ سیاہ ہیں اور آنکھیں بھوری، جن میں ہوس کی چنگاری جل رہی ہے ۔

" میں کہتا ہوں سردار تیجا سنگھ پھر چرکا دے گیا' پارٹنر ۔ ہم دیکھتے رہے اور چڑیاں چگ گئیں کھیت ۔ اس کا سمنٹ راکھ ہے راکھ ۔ اور سرکار اسی کو ٹھیکہ دیتی ہے ــــ" شرما منہ بگاڑ کر کہتا ہے اور ڈبی ہوئی ہتھیلیوں کو رگڑتا ہے ۔

اس بار نکل گیا بادشاہو، لیکن اگلے سال کہاں جائے گا ۔ بادشاہو ۔ جتنا کھانڈ ڈالو گے لسی اتنی ہی میٹھی ہوگی ۔ ان باتوں میں کیا رکھا ہے بادشاہو ۔ ادھر دیکھو ۔ اس کونے میں تمہارا لونڈا کیسا کھیل کھیل رہا ہے، اور پڑھاؤ اسکو کالج میں ــــ"

" بھیا کیا ہم نے کم کی ہے ہیرا پھیری اپنے زمانے میں ــ" ہری کپور اس کونے کی طرف نہیں دیکھتا، جہاں اس کا بیٹا سرگوشیوں میں باتیں کر رہا ہے ۔ لیکن اس کے ساتھی کی نظر اسی کونے پر جمی ہوئی ہے ــ وہ سوچ رہا ہے "باپ ہر یا بیٹا ۔ مال اچھا پھانستے ہیں دونوں ــــــ"

نوجوان کپور نے نہ تو اپنے باپ کو دیکھا ہے اور نہ اس کے پارٹنر کو ــــ وہ راگنی کے گلے میں پڑے ہوئے سفید ہار کو دیکھ رہا ہے ۔ جو بلاؤز کے بڑے سے گریبان کو چھو رہا ہے ۔ وہ بھی خاموش ہے اور راگنی بھی ــــ میز پر فرانسیسی مصنفہ دوبوا کی کتاب رکھی ہوئی ہے ۔ ہر طرف روشنی مدھم ہے ــ ایسپریسو کی مشین کھانستی ہوئی سنائی دیتی ہے ۔ ویٹر تیزی سے آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں ۔ موسیقی کی دھنیں بہت اداس ہیں ــ راگنی کتاب کے ٹائٹل کو دیکھ رہی ہے، جس پر ایک لڑکی کی ننگی تصویر ہے، جس کے کندھ

ہوئے بال شانوں پر جھول رہے ہیں۔ "میں نے آئینے میں اپنا ننگا جسم دیکھا ہے۔ میرا جسم ایسا نہیں ہے۔ کیا تمام فرانسیسی لڑکیوں کا جسم ایسا ہی ہوتا ہے۔ ترشے ہوئے چکنے کولھے، سڈول رانیں۔ دُبلی مگر پیاسی بانہیں۔ میرا جسم، — نہ یہ خم، نہ یہ اُبھار — بڑا بیزار سا۔ بڑا اوٹ پٹانگ سا جسم ہوتا ہے۔ ہندوستانی عورت کا۔ وہ بات ہوتی ہی نہیں۔ کیوں اُلورا کے مجسموں میں اور وینس دی ملو میں بڑا فرق ہے۔ ہندوستانی سینے بہت بھاری ہوتے ہیں۔ اور کولہے ان میں یہ Elegance، یہ تراش، یہ خم، یہ ابھار، یہ نرمی نہیں ہوتی۔ ایک سینے وہ ہوتے ہیں جو اپنا سب کچھ ظاہر کر دیتے ہیں۔ ایک وہ ہوتے ہیں جو راز کو اور گہرا کر دیتے ہیں۔ میرا دماغ بہت سیکسی ہو گیا ہے۔ اور میں بیمار ہوں۔ ! Nonsense میں نے کتابوں میں پڑھا ہے، ایسی عورتیں — کپور یونیورسٹی کا سب سے اچھا کھلاڑی ہے، اس کا جسم جتنا بھرا ہوا ہے، دماغ اتنا ہی خالی ہے۔ زندگی صرف سکس نہیں ہے۔ زندگی کو کچھ اور بھی چاہئیے۔ یہ ریکھا سے جلتا ہے، یہ مجھے بھی یہ سنا چکا ہے کہ یونیورسٹی کے لڑکے کہتے ہیں میں lesbian ہوں۔ لیکن یہ جھوٹ ہے۔ ریکھا میری دوست ہے اور وہ کپور پر مرتی ہے۔ وہ اس کے چہرے پر مرتی ہے۔ چہرہ تو واقعی اس کا "مارشل" والا ہے۔ جب کبھی میں مُولاں روڈ" میں اسے دیکھتی ہوں، مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں کسی ایسے فوجی کپتان کو دیکھ رہی ہوں جو سیدھا میدان جنگ سے بھاگا آ رہا ہے۔ جہاں اس کے سارے سپاہی کام آ چکے ہیں اور تمغے چھن چکے ہیں۔ چہرہ ستا ہوا، بالوں میں خاک سی اڑتی ہوئی اور آنکھوں میں غضب کی شکست اور انتقام کی ہوس۔ کس سے انتقام؟ کاہے کا انتقام؟ یہ میں اکثر اپنے آپ سے پوچھتا ہوں ——— کپور چپ ہے اور وہ سوچ رہا ہے کہ میں اسکی ٹانگ کے لمس کا جواب کیوں نہیں دے رہی ہوں۔ کڑھ رہا ہے۔ گدھا! اب ریکھا آتی ہی ہوگی کیسا خون کھولے گا اس کا۔ نظر اٹھا کر بھی تو نہیں دیکھتا یہ اس کی طرف۔ آج میں کپور سے کہہ دوں گی، تمہارے لئے میرے پاس ———

ریکھا سائے کی طرح آتی ہے۔ اسکی آواز کتنی بھاری اور سرگوشی سے بھری ہوتی ہے۔ قد، کتنا اونچا قد۔ لباس، کتنا چست لباس۔ بال کتنے گھنے بال، لمبے گھنے، آزاد، شہد۔ اسکی آنکھوں سے کیا شہد ٹپک رہا ہے۔ یہ شہد کس کے لئے ہے۔ ہونٹوں کا یہ خم کس کے لئے ہے۔ جسم کا یہ تھما تھما سا تلاطم کس کے لئے ہے۔ کپور اُٹھ کر میز کی دوسری طرف بیٹھ جاتا ہے۔ راگنی اسکی بھری بھری ران کو اپنی ران سے دباتی ہے۔ ریکھا حیرت سے اسکو دیکھتی ہے۔

"کپور آج خودکشی کرنے والا ہے" راگنی کہتی ہے۔

"کیوں ———" ریکھا ہنس کر کہنیاں میز پر رکھ دیتی ہے اور کپور کی طرف جھکتی ہے۔

"سچ؟" ———

کچھ ہونٹ چبانے لگتا ہے ——— "تم کیا پیوگی ؟"

"وہسکی"

"ایسپریسو" ؟

"یس ایسپریسو وہسکی۔ نیٹ۔ بلیک !" ریکھا آنکھیں بند کر لیتی ہے۔

خاموشی چھا جاتی ہے۔ راگنی ایسپریشو مشین کی روشن رگوں اور آنکھوں کو دیکھ رہی ہے۔ اس کے ہونٹ بھنچ رہے ہیں۔ پاس ہی سرخ میز کے گرد نوجوانوں کی دوسری ٹولی ہے۔ میز کے کونے پر کافی کی پیالی سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ ایک پتلا دبلا چہرہ، جو درخت کی چھال کی طرح خشک ہے، عینک لگائے بھاپ کو گھور رہا ہے اسکی آستینیں کہنیوں تک چڑھی ہوئی ہیں۔ وہ اپنے ہونٹ چوستا ہے۔ لیکن جب ہونٹ اپنی اصلی حالت پر آتے ہیں تو ان میں کوئی نمی نہیں پیدا ہوتی۔ زہریلے پھول کی کالی پنکھڑی کی طرح خشک ہونٹ تھرتھراتے ہیں۔

وہ پھر اپنے ہونٹ چوستا ہے۔ اسکی آنکھوں سے چنگاریاں نکل رہی ہیں۔

"ہا ہا ہا! جنس لوگ ہمیشہ اسی زبان میں بات کرتے ہیں"

"میں کہتا ہوں تم لوگ غلط جگہ پہ آگئے ہو۔ اس ایرکنڈیشنڈ ریستوران میں تو طاعون پھیلنا چاہیے۔ یہ ریاکاری کا گھونسلا ہے۔ ہر طرف سڑے ہوئے دل اور دماغ کی سڑاند اٹھ رہی ہے۔ تم لوگوں کو کولڈ اسٹور کی چیزیں پسند ہیں۔ صرف اس لئے کہ یہ چیزیں ٹھنڈی ہیں" وہ رکتا ہے، کافی کا ایک گھونٹ پیتا ہے۔

میں اس شخصیت سے نفرت کرتا ہوں کیونکہ وہ مجھ سے نفرت کرتا ہے۔ اس گدھے کو نہیں معلوم کہ کھوٹا سکہ گھوم گھام کر واپس آجاتا ہے۔

"تم لوگ مجھ سے جلتے ہو کیونکہ میں اس طرح لکھتا اور سوچتا ہوں جس طرح لوگ آج فرانس میں سوچ رہے ہیں۔ کیونکہ میری کہانیاں "Washington Patriot" میں چھپتی ہیں۔ کیونکہ میں تم سب کو مداری سمجھتا ہوں اور صاف صاف کہہ دیتا ہوں کہ میں اکیلا پیدا ہوا ہوں۔ اکیلا جیوں گا اور اکیلا مروں گا"

موٹے گالوں والا نوجوان جو کسی ریستوران کے مالک کا داماد ہے اور اپنے آدم بیزار دوست کی محبت میں گرفتار ہے، سر اٹھاتا ہے۔ دانت سے ناخن کترتا ہے۔ "بیٹا تم سمجھتے ہو۔ تم بڑے اوریجنل "اکیلے" ہو۔ اور سمجھتے ہو اکیلے صرف فرانس میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب غالب نے کہا تھا ـــــ رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو ـــ تو کیا۔۔۔۔"

"میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ میں تم نہیں ہوں اور تم ـــــ"

"خدا کی قسم اتنا بڑا انکشاف تو آج تک ہوا ہی نہیں تھا"

سب بھیڑوں کی طرح سر جھکا کر ہنستے ہیں۔ بڑے بے رحم ہیں یہ لوگ ——— یہ گروہ جب کبھی میری ٹھنڈی، گہری اور اندھیری آغوش میں آتا ہے۔ میری روح لرز جاتی ہے۔ کیونکہ یہ سب مجھے بالکل اجنبی لگتے ہیں۔ یہاں اس قسم کی باتیں کرنے والے نہیں آتے۔ جو صرف باتیں کرتے ہوں اور اپنے دماغ و دل کا سارا زہر باتوں میں انڈیل دیتے ہوں۔ یہاں تو ....

نوجوان کی آنکھیں اور پھیل جاتی ہیں۔ اور آواز رندھ جاتی ہے۔

"دیکھو اپنے چاروں طرف دیکھو ——— یہ لوگ جو میزوں کے گرد بیٹھے ہاٹ کافی، کولڈ کافی، فریش لیموں یا جنجر پی رہے ہیں۔ ذرا ان سب کو دیکھو۔ ان میں کچھ اپنی بیویوں کے ساتھ ہیں، کچھ دوسروں کی بیویوں کے ساتھ ہیں۔ کچھ عاشق ہیں۔ کچھ معشوق ہیں۔ لیکن ان میں کسی کو سوچنے کی عادت نہیں پڑی ہے۔ یہ انسان کو، اس دنیا کو، دل اور دماغ سے نہیں پہچانتے۔ اندھوں کی طرح ٹٹول کر دیکھتے ہیں۔ یہ سب ایک دوسرے کو محسوس نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ ٹٹول رہے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے کسی نے بھی اپنے آپ کو تلاش نہیں کیا ہے۔ اور جو لوگ ———"

گروہ پر جو سکتے کا عالم طاری ہو گیا تھا، یکایک ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے کسی کو چھینک آتی ہے اور سب ڈر جاتے ہیں۔ جیسے ہتھوڑے کی ضرب نے برف کی سل کے ٹکڑے کر دیئے ہوں۔

مجھے وہ چکنا چکنا سا ڈپلومیٹ اچھا لگتا ہے۔ جو ہمیشہ "محفوظ" گوشے میں بیٹھتا ہے۔ اس شخص نے ہمیشہ زندگی میں محفوظ جگہ تلاش کی ہے۔ جب اس کے ملک میں خانہ جنگی پھیلی ہوئی تھی تو وہ لاطینی امریکہ کے دورے پر تھا۔ اور غیر ملکوں کو یقین دلا رہا تھا کہ اس کے ہم وطن آزادی کی قیمت ادا کرنے کے لئے کس طرح خاک و خون ہو رہے ہیں، کس طرح بچوں کو سنگینوں پر اٹھایا جا رہا ہے۔ اور عورتوں کے ساتھ عام شاہراہوں پر زنا کیا جا رہا ہے۔

اس کا چہرہ گول ہے۔ چکنا، جیسے اس پر پہلے پالش کی گئی ہو اور اس کے بعد استری۔ اس کی معشوقہ جو اپنے ہندوستانی روائتی گھر، تابڑ توڑ بچوں، وزارتی افسروں کی خوشامد میں دن رات لگے رہنے والے شوہر، رات دن سلیقے کا طعنہ دینے والی ساس اور گھر میں آنے والے ہر عاشق پر ڈورے ڈالنے والی نندوں سے بیزار ہے۔ اس وقت سب کچھ بھول کر میٹھی میٹھی ترچھی نظروں سے اس غیر ملکی ڈپلومیٹ کو دیکھ رہی ہے جس کی بین الاقوامی سرگرمیوں میں "اڈلٹری اور دیپاچری" ان مہروں کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے "شہ اور مات" کی بہت سی سیاسی چالیں طے ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی ایسا لگتا ہے کہ اس کا چہرہ سفید اسفنج کا بنا ہوا ہے، اور کوئی ان دیکھا ہاتھ اُسے آہستہ آہستہ دبا رہا ہے اور اس کے مساموں سے مسکراہٹ ٹپک رہی ہے۔ اگر اس کے چہرے کے نیچے بالٹی رکھ دی جائے تو منٹوں میں مسکراہٹ سے بھر جائے۔

"کبھی کبھی مجھے تمہارے شوہر پر بڑا رحم آتا ہے ——" وہ زبان سے تالو کو سہلاتا ہے۔

"After all he is such a wonderful man"

سکھی ہنستی ہے اور اپنے میک اپ کے بگڑنے کے اندیشے سے اپنی ہنسی کو ادھورا ہی چھوڑ دیتی ہے۔

"And you? You are so naughty"

یکایک اس کا چہرہ سنجیدہ ہوجاتا ہے ——— "جانتے ہو کبھی کبھی مجھے کیسا لگتا ہے؟ تم میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لو تو بتاؤں" ڈپلومیٹ اس کا نرم، چھوٹا، اور حیرت زدہ ہاتھ اپنے معاملہ فہم ہاتھ میں لے لیتا ہے، جو صبح سے امریکی، سیلونی، پاکستانی اور فرانسیسی ہاتھوں کے لمس سے بیزار ہو چکا ہے۔ یہ ہاتھ بھی کیا چیز ہوتے ہیں۔ کیسی کیسی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھوں کا نشہ چھلکاتے ہوئے کہتی ہے "کبھی کبھی مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں ایک بہت بڑے ریگستان میں ہوں، اکیلی۔ ریت کے ٹیلے ٹیلے میرا راستہ گھیرے ہوئے ہیں، آسمان اندھیرا ہے ——— دور کہیں ایک ستارا چمک رہا ہے۔ میں اس ستارے کی طرف اڑنا چاہتی ہوں۔ پیاس سے میری زبان سوکھی جارہی ہے ———"

محفوظ کرنے میں، محفوظ ہاتھوں کے محفوظ لمس سے بے قرار ہوکر ڈپلومیٹ ایک محفوظ سی نظر ان سایوں اور دھندلکوں پر دوڑاتا ہے۔ جن کی آوازیں ایک دوسرے سے ٹکرا کر پراسرار سرگوشی بن گئی ہیں۔ پھر اس کی عینک کے دبیز شیشے، جن کا رنگ ہلکا نیلا ہے، اس کے دوست کی بیوی کے ہونٹوں پر جم جاتے ہیں اور وہ دل ہی دل میں کہتا ہے۔

"بعض ہونٹ صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ ان کو ہونٹوں سے نہیں بلکہ دانتوں سے چبا جائے" وہ اپنے سگریٹ کی راکھ راکھ دان میں جھاڑتا ہے اور کہتا ہے "یہاں سے ہوسٹل چلیں گے"۔ دوست کی بیوی اس کی ہتھیلی کو دباتی ہے اور ترچھی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سپردگی کے انداز میں کہتی ہے۔ "بہت دیر ہوجائے گی۔ رات کو جب وہ گھر لوٹتے ہیں اور مجھے نہیں پاتے تو بہت touchy ہوجاتے ہیں ———"

پھر "نہیں نہیں" اور "ہاں ہاں" کے ملے جلے انداز میں کہتی ہے۔ "میں سسپنس برداشت نہیں کرسکتی ———"

ڈپلومیٹ دوست کا گول چہرہ زمین پر گرے ہوئے آئینے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے اور وہ کچھ سوچ کر کہتا ہے۔

"Right, I will finish my report tonight"

نوجوانوں کی میز پر گفتگو کا چڑچڑاپن اسی طرح قائم ہے۔

سوکھے چہرے والا نوجوان ادھ جلی سگریٹ سے دوسری سگریٹ جلاتا ہے اور اس گول چہرے والے ڈپلومیٹ کی طرف دیکھتا ہے، جو اپنے دوست کی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا ہے اور کہہ رہا ہے۔

"Please, for God's sake!"

"Rogue!" نوجوان جلدی جلدی سگریٹ کے کش لگاتا ہے۔ "میرا دم گھٹتا ہے یہاں ——— کیونکہ یہاں کی ہر چیز جھوٹی ہے ——— یہ دھندلکا ——— یہ پرچھائیاں، یہ آنکھیں، یہ ہونٹ اور باتیں ٹھیکیداروں کی باتیں، ڈپلومیٹ کی باتیں، طالب علموں کی باتیں، ان کی باتوں میں کیا رکھا ہے۔ آج فرانس کے لوگ اس طرح باتیں

نہیں کرتے۔ وہ چھپ کر کوئی کام نہیں کرتے۔ جس طرح وہ ڈپلومیٹ چھپ کر کسی عورت کی کمر میں ہاتھ ڈال رہا ہے۔"

"I hate his hand - I hate her waist"

وہ اور زور زور سے کش لیتا ہے۔

"تم پیاسے ہو۔ تمہارا دماغ اس قیدی کے دماغ کی طرح ہے جو کولہو میں جوت دیا گیا ہے۔ جب وہ پانی مانگتا ہے تو اس کے سامنے پانی کی ٹھنڈی صراحی لائی جاتی ہے اور توڑ دی جاتی ہے۔ صراحی ٹوٹ گئی ہے، پانی بہہ رہا ہے، اور تم چیخ رہے ہو، تم پیاسے ہو۔"

"پیاسا؟ کس چیز کا پیاسا ہوں میں گدھے؟"

"تم اس کمر کے پیاسے ہو، ان ہونٹوں کے، ان آنکھوں کے۔ ان سینوں ..... "

نوجوان کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں اور وہ کافی کی پیالی اٹھا لیتا ہے۔ کئی ہاتھ صلیبوں کی طرح اٹھتے ہیں۔ اور اس کے ہاتھ کو تھام لیتے ہیں۔

"یہاں نہیں۔ یہاں نہیں۔"

"نہیں ـــــ میں تو توڑ دوں گا۔"

"نہیں ـــــ یہ ہولان روڑ ہے۔ یہاں نہ پیالیاں توڑی جاتی ہیں نہ دل، نہ سر۔"

ہڈیوں کا ڈھانچہ جسے اس کے ساتھی "سسی فس" کہتے ہیں، پیچ و تاب کھاتا ہے۔ اٹھتا ہے اور لڑکھڑاتا ہوا دروازے سے باہر نکل جاتا ہے، دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ اور الو کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے چمکتی ہیں۔ اور پھر دھند لکے میں کھو جاتی ہیں۔

نوجوان کے ساتھی میز پر سر جھکائے بیٹھے رہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے۔

"نہ جانے یہ بھوت اپنی "میں" کی لاش کب تک اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرے گا۔"

"دیکھ لینا ـــــ یہ بھی اپنے دوسرے دوستوں کی طرح خودکشی کرے گا۔"

"نہیں وہ سچا آرٹسٹ ہے۔ سچے آرٹسٹ اتنے بے وقوف نہیں ہوتے۔"

میرا دل بھر آیا ہے ـــ نہ جانے کتنی باتیں سنتا رہتا ہوں دن رات۔ اور وہ تمام باتیں میرے کانوں میں لرز رہی ہیں۔ میرے دل میں دھڑک رہی ہیں۔ یہ سب اپنی اپنی "میں" کے کنویں "میں" بند ہیں۔ اور اپنے آپ کو پکار رہے ہیں۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ شاید ہی کبھی یہاں آتا ہے۔ وہ جب بھی یہاں آتا ہے، زخمی ہو کر جاتا ہے۔ اس کے دوست بڑے بے رحم ہیں۔ اپنے بارے میں اس کا احساس کانچ کے کمرے کی طرح ہے۔ وہ اپنے کانچ کے کمرے میں بیٹھ کر دوسروں کے کمروں پر پتھر برساتا ہے اور جب دوسرے پتھر برساتے ہیں تو بلبلا اٹھتا ہے۔ یہ زندگی کتنی عجیب ہے۔

محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!

نیچی دیوار کے پاس اونچی گردن والا ہپوکریٹس (بقراط) بیٹھا ہوا ہے۔ اسے اور کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ نہ اپنا معاملہ نپٹانے پر آمادہ ہے۔ "اور سب باتیں چھوڑ دیجئے بس اتنا سمجھئے کہ آپ کے ملک میں کلچر کا قحط ہے۔ اور کلچر کا تعلق، گہرا تعلق، یعنی جتنا گہرا تعلق آپ سے میرا ہے، اس سے کہیں زیادہ تعلق، کلچر کا اخبار سے ہے اور میں نے اپنی زندگی اخبار کے لئے تج دی ہے۔ یہی میرا اوڑھنا، بچھونا ہے۔ میں راہُن، بیمن، ٹیمس، والگا کے پانی کو گنگا کے پانی سے ملا دوں گا۔" اسکی اونچی گردن اور اونچی ہو گئی ہے اور ہونٹوں سے الفاظ اور آواز کے ساتھ جھاگ کی سفید پھواریں بھی پھوٹ رہی ہیں۔ "میں انٹرنیشنل آؤٹ لک کا آدمی ہوں۔ ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ مولوی بھی انٹرنیشنل ہو سکتا ہے۔ میری نظر دنیا کے فلسفے پر ہے۔ میں قرآن پی گیا۔ میں مارکس ازم پی گیا۔ کانٹ اور نیتشے کا فلسفہ پی گیا۔ میں اقبال کا مردِ مومن ہوں۔ گم جس میں ہے آفاق۔ آفاق! کتنا شاندار لفظ ہے۔ ذرا اسکی گونج سنیئے۔ میں زرتشت کی طرح ہوں، جو چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔

"Behold! I am weary of my wisdom, like a bee that has gathered to much honey —"

"اچھا تو اگر میں آپ کو دو ہزار روپے دے دوں تو کیا آپ اخبار نکال لیں گے۔ منافع کب سے آنا شروع ہو جائیگا؟"
زرتشت کے چہرے پر تلخی کے بادل سے تیرتے ہیں۔ "اخبار اور منافع" وہ چبا چبا کر دہراتا ہے اور ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے زیرِ لب کہتا ہے۔

"نیکی کر کنویں میں ڈال۔ اخبار نکالنا کچھ ایسا ہی دھندا ہے۔"

"جی؟"

"جی!"

دونوں خاموش ہو جاتے ہیں۔ بقراط کی گردن کی اونچائی کم ہو جاتی ہے۔

کتنے لوگ ہیں جو یہاں صرف تھکن مٹانے آتے ہیں۔ کولڈ کافی پیتے ہیں، کچھ اسنیکس کھاتے ہیں اور سب کچھ بھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ یہاں سودا کرنے آتے ہیں۔ یہ سودے طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ لاکھوں روپئے، پونڈ اور ڈالر کے سودے ہوتے ہیں۔ دلوں کے سودے ہوتے ہیں۔ حسن اور جوانی کے سودے ہوتے ہیں۔ اکثر خالی خولی امیدوں اور وعدوں کے سودے ہوتے ہیں۔ میرے اعصاب کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ جب میں دیکھتا ہوں کہ لوگ ایک دوسرے کے وعدوں کو شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتے ہیں۔ میرے پورے جسم میں جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے۔ جب کوئی عورت سب کچھ سمجھ کر بھی کچھ نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ وہ جانتی ہے کوئی لالچی یا چھچھورا چھوکیوں اس پر جھکا آ رہا ہے۔ وہ جانتی ہے اگلی منزل کیا

ہے اور اس نازک لمحے میں وہ تمتماتے ہوئے کھسیاتے ہوئے احمقانہ چہرے سے پوچھتی ہے۔

"کیوں آپ کا بڑا بیٹا امتحان میں پاس ہو گیا نا ——"؟

مگر یہ عورت اپنے عاشق پر یہی جتانا چاہتی ہے کہ میں تو ابھی جوان ہوں۔ بہت جوان اور تم ادھیڑ ہو۔ بلکہ ادھیڑ سے بھی گئے گذرے۔ اور تمہاری گردن میں مضبوط پٹا پڑا ہوا ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ یہاں کولڈ ڈرنک پینے کیوں آئی ہے۔ اور پھر یہی چھپا ہوا دنیا کیوں چنتی ہے، جہاں بوسوں اور ہاتھوں کے لمس کو ہری بیلیں اپنے خوابناک جال سے ڈھک لیتی ہیں۔

ان غیر ملکیوں کا قد کتنا اونچا ہے۔ سب اونٹ کی طرح اونچے، شانے ذرا جھکے ہوئے، گریبان بے پروائی سے چاک، چہرے پر بچکانہ بے فکری، اور آنکھوں میں کھلنڈرا پن، سیاحوں والا تجسس، نہ اجنبیت، نہ بوکھلاہٹ۔ جیسے یہ سب کچھ ان کا اپنا ہے، جھلملاہٹ، یہ فضا، یہ سرگوشیاں، آنکھوں کی گردش اور دلوں کی دھڑکن، ساری بیداری، ساری روشنی، سارا اندھیرا، ساری نیند —— جیسے یہ سب کچھ ان کا ہے۔ اُن کو کچھ جاننا نہیں، انھیں کچھ سیکھنا نہیں ایسے لوگ کہاں سے آتے ہیں۔ جنھیں کوئی چیز حیرت میں نہیں ڈالتی۔ کوئی چیز چونکاتی نہیں۔ یہ لوگ غیر ملکی ٹورسٹ کہلاتے ہیں۔ بڑے بے تکلف لوگ ہیں۔ سات سمندر پار سے آئے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں کیمرے ہیں۔ اسٹل، مووی کیمرے اور دُوربین —— یہ لوگ کیا دیکھنے آتے ہیں، کتنی دور تک دیکھنے آتے ہیں۔ ان کی دُوربین میں وہ بات نہیں جو میرے دل کی دُوربین میں ہے۔ اور یہی ایک بات ایسی ہے جس سے یہ بے خبر ہیں۔ اور مجھے ان کی یہ بے خبری پسند ہے۔ کیونکہ مجھے ہر وہ چیز پسند ہے جو اوروں کو احمق اور مجھے دُور اندیش ثابت کرتی ہے۔

"مجھے یہ جگہ صرف اس لئے پسند ہے کہ یہ دوسری جگہوں سے مختلف ہے۔ الگ، انوکھی اور پراسرار" کالی داڑھی اور کالے چہرے والا مصوّر، ہنگرین باورچی کا پکایا ہوا خریدار سوپ پیتے ہوئے کچھ فراری انداز میں کہتا ہے۔

"ہنگرین باورچی کتنا اچھا سوپ پکاتے ہیں۔"

"اور گولاش، چکن گولاش؟" ڈرامہ نگار دوست، جو کچھ ہی دنوں پہلے امریکہ کی سیاحی کر کے لوٹا ہے اپنے دلکش چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے اور پائپ سے ہتھیلی کو ٹھونکتے ہوئے کہتا ہے۔ "ہنگرین معزز قوم ہے لیکن یہ امریکی —— مائی گاڈ بدمذاقی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔"

"تم بڑے نمک حرام ہو۔ بیچاروں نے نہ جانے کتنے ڈالر تم پر بہا دیے اور تم ہو کہ ——" مصوّر رک جاتا ہے اور سوپ کا چمچہ ہونٹوں سے لگا لیتا ہے۔

"ایک بات سنو۔ میں ایک بہت بڑی تھیٹر تحریک چلانے والا ہوں۔"

"چلا بھی چکو۔"

"تم کیا پینٹ کر رہے ہو۔؟"

" Hollowness of man یعنی کھوکھلا انسان!"

" تم سیلف پورٹریٹ کے چکر سے کبھی نکلو گے بھی — ؟ "

" ہر Creative کام میں فن کار کا "سیلف" موجود ہوتا ہے۔ کیا تمہارے ڈراموں میں سیلف نہیں ہے —"

" میں مانتا ہوں — لیکن میں نے اب تک ڈرامہ لکھا کب ہے؟ میرا مطلب ہے Real Drama اسکی آواز پراسرار ہو جاتی ہے۔ " ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے تو ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا......"

" اقبال میں کامن سنس کی کمی تھی "

" اقبال کامن دلیتھ کا ممبر نہیں تھا "

" اچھا امریکہ میں اپنے تجربے کے بارے میں بتاؤ ——" مصوّر کی آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ اُس کے آگے سے سوپ کی گہری پلیٹ کھسکائی جاتی ہے۔ بیرا جھکتے ہوئے قاب سے چکن گولاش کے ٹکڑے نکال کر اسکی پلیٹ میں ڈالتا ہے۔ مصور سوچ رہا ہے ۔ " بڑا ایڈیٹ ہے۔ ابھی میں نے سوپ ختم نہیں کیا تھا اور پلیٹ اُٹھائے گیا —" وہ ڈرامہ نگار کو جھلائی ہوئی نظر سے دیکھتا ہے ۔ " کچھ مزیدار باتیں سناؤ "

" مزیدار باتیں ؟ تجربہ ؟ " ڈرامہ نگار دہراتا ہے ۔ " میرے تجربے تمہارے تجربوں سے مختلف ہیں۔"

" انسان مختلف ہوں گے تو ظاہر ہے تجربے بھی مختلف ہوں گے ۔ وہ آزاد افراد کا ملک ہے " وہ گولاش کا بڑا سا ٹکڑا کانٹے میں پھنساتا ہے اور کانٹے کو دھمکی کے انداز میں ہلاتا ہے۔

" میں ملک سے ملنے نہیں گیا تھا ۔ میں بھی چند افراد سے مل کر چلا آیا "

" لیکن امریکی قوم ——"

" امریکی قوم ؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو بھائی ۔ قوم ہوتی ہی نہیں امریکہ میں ۔ امریکہ تو آزاد افراد کا ملک ہے ۔ عرب میں اونٹ نہیں ہوتا اور امریکہ میں قوم نہیں ہوتی ۔ دونوں بڑے اچھے ہیں —"

مصور کھسیانی ہنسی ہنستا ہے ۔ ڈرامہ نگار کے جبڑے اور اُبھرنے لگتے ہیں ۔ آنکھوں سے عجیب سی بے اطمینانی جھلکنے لگتی ہے ۔ اور وہ کھانا کھاتے کھاتے بڑی بے زاری کے ساتھ سر دھنتا ہے ۔

ایک لڑکی ملی تھی ۔ آئرلش نسل کی تھی ۔ میرے ہی ہوٹل میں اس کا قیام تھا ۔ خوب صورت ووب صورت نہیں تھی ۔ جوان تھی ۔ جوانی میں تو کتیا بھی حسین لگتی ہے ۔ میں اسکو تھیٹر دیکھنے لے گیا ۔ ایک آدھ بار دریا دریا کی سیر ساتھ کی ۔ کافی فلرٹ کر چکا تو میں نے سوچا —— آمدم برسر مطلب ۔ لیکن اس نے میرا مطلب سمجھنے سے انکار کر دیا ۔ تم جانتے ہو

تمہاری طرح میں بھی گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکا ہوں۔ میں جانتا ہوں لڑکیاں ایسے موقع پر مطلب سمجھنے سے انکار کر دیتی ہیں۔ سومیں نے ... لیکن میں جانتا ہوں وہ لڑکی اتنی بے وقوف تھی ____ بالکل بتاشہ مار کہ ____ ہندوستانی لڑکیوں کی طرح رونے لگی۔ میں نے اسکو چاکلیٹ پیش کیا تب جا کر چپ ہوئی۔ اور مسکرائی۔ میں نے ہندوستانی فلم والا نسخہ استعمال کیا۔ جھٹ اسکو اپنی بہن بنالیا۔ اور جب میں نے اسکو بہن بنالیا تو وہ رات کو میرے کمرے میں آئی اور اس نے مجھے Rape کیا۔ میرے ضمیر پر عجب بوجھ ہے۔

مصور قہقہے مارتا ہے۔ اور نیپ کن سے منہ پونچھ لیتا ہے۔ "Really ?"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے ؟"

"اتنے کامن پلیس تجربے کے لئے امریکہ جانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو یہاں آئے دن ہوتا رہتا ہے" اس کے کندھے اچک رہے ہیں اور مارے ہنسی کے آنکھیں بھیگ رہی ہیں؟

"I can imagine your face while being raped"

"یہ میرا چہرہ نہیں، تمہارا چہرہ ہے۔ تم سلف پورٹریٹ بناؤ۔ مانگے کے چہرے سے کام نہیں چلتا۔ ہر فن کار کے Creative کام میں اس کا اپنا چہرہ ہوتا ہے"

"چہرہ نہیں دل"

"دل ایک پمپنگ مشین ہے جو پورے جسم میں خون دوڑاتی ہے"

"خفا نہ ہو ____ تم جانتے ہو، میں تم پر جان دیتا ہوں" مصور کے کندھے پھر اُچکنے لگتے ہیں۔ وہ پھر نیپ کن منہ پر رکھ لیتا ہے۔" میں تمہارا چہرہ دیکھ رہا ہوں، اور اس لڑکی کا بھی ____ اس آئرلش لڑکی کا ____"

"شٹ اپ ..... اس قسم کی کوئی آئرلش لڑکی نہیں تھی اور نہ اس قسم کا تجربہ ہوا۔ واحد یادگار تجربہ یہ ہے کہ مجھے ایک ریستوران سے صرف اس لئے نکال دیا گیا کہ میرا رنگ کالا ہے"

"سانولا"

"شٹ اپ ..... مذاق نہیں ہے۔ ایک کالی قوم کی عزت کا سوال ہے"

میری آنکھوں میں نیند ہے۔ مجھے جمائی آرہی ہے۔ مغربی تہذیب کے خوش لباس مہنگے بھی تھک گئے ہیں۔ جیسے جیسے رات بھیگتی ہے تھکن گہری ہوتی جاتی ہے۔ ڈرامہ نگار اور مصور ایک دوسرے کی ٹانگ لے لے کر تھک چکے ہیں۔ انھیں بل کا انتظار ہے۔ ڈراما نگار آنکھیں بند کئے پوچھتا ہے ____

"بائی دی وے، تمہاری معشوقہ کہاں ہے؟"

"کہیں ہوگی ——— بائی دی وے۔"

سیاح خوش ہیں۔ انہیں کھانا اچھا ملا ہے۔ شراب وہ باہر سے پی آئے ہیں۔ انہیں بیروں کی وردی بہت اچھی لگتی ہے جو راجپوتی سپاہیوں کا لباس ہے۔ اس لباس میں رانا پرتاپ نے اکبر کی فوجوں کے چھکے چھڑائے تھے۔

ان سیاحوں کا خیال یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو اپنی ان روائتوں کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ ان روائتوں میں مشرق کی روحانی طاقت چھپی ہوئی ہے ——— تیاگ اور سنیاس کا سارا فلسفہ ——— اگر یہ ملک بھی امریکہ کی طرح صنعتی ملک بن گیا تو بیروں سے رانا پرتاپ کا یہ لباس چھن جائے گا۔ عورتیں ساڑھی پہننا چھوڑ دینگی۔ سیتا اور دروپدی کی پاکی کے افسانے بھلا دیے جائیں گے۔ ان سے وقت کی یہ فراوانی چھن جائے گی۔ پھر گوتم بدھ کا یہ ملک بھی ستیہ اور اہنسا کے گیت اور بھائی چارے کے اپدیش سنے کے بجائے مشین کے پرزے اکسپورٹ کرنے لگے گا۔ پھر یہ امریکی اپنا اکسپورٹ مال لے کر کہاں کہاں مارے پھریں گے۔ پھر وہ لوگوں کو جلیبیاں کھاتے اور پلم برچھے سے لیس ہو کر چکن گولاش Serve کرتے کہاں دیکھیں گے۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں یہ سیاح۔ یہ جہانیاں جہاں گشت۔ مجھے نیند آ رہی ہے اور یہ غیرملکی ہیں کہ جا نہیں سکتے۔ دوسرے کونے میں شادی والی پارٹی۔ یہاں سے نکلنے کا نام نہیں لے رہی ہے۔ جی چاہتا ہے ان کے کان پکڑوں اور مارواڑی نوجوان سے کہوں۔ "بٹیا شادی کی راتیں مولاں روژ میں بیٹھ کر گولڈ کنٹرول کے قانون پر فضول باتیں کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ تم صرف پگھلتی ہوئی آئس کریم دیکھ رہے ہو اور یہ نہیں جانتے کہ گھر میں جلتی ہوئی شمع کی لو کتنی تیز ہے۔ عورت بھی پگھلتی ہے بھائی۔ عورت بھی۔ مارواڑی نوجوان کے سونے کے دانت بھی آئس کریم کھاتے کھاتے ٹھنڈے ہو گئے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُسے وقت کا احساس ہی نہیں۔ مدھم دھنیں در و دیوار سے کہہ رہی ہیں۔ رات بھیگ رہی ہے۔ رات بھیگ رہی ہے۔۔

کچن میں اب بھی پتیلیوں سے بھاپ اٹھ رہی ہے۔ ہندوستانی باورچی جس کا سر گنجا ہے مگر جس کے بازوؤں شانوں اور سینے پر گھنے بال ہیں اور پیشانی پر ان گنت شکنیں۔ گول ہرے پائے سے لگا بھاپ کی تہوں کو مٹتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ ہنگرین اسکی بجھی ہوئی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈ رہا ہے۔ اُسے معلوم ہے ہندوستانی باورچی اس سے بیزار ہے۔ لیکن اس وقت ہندوستانی باورچی یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا ہے۔ وہ اپنے آپ سے اتنا پوچھ رہا ہے "کیا چکن گولاش، روغن جوش، اور نرگسی کوفتوں سے زیادہ مزے دار ہوتا ہے؟ کیا میری پکائی ہوئی بٹیروں کا کوئی جواب ہے اس ہنگرین کے پاس؟ عجیب زمانہ ہے۔ سب ہی باہر کے مال پر جان دیتے ہیں۔ چکن گولاش ہو، فلم ہو یا لباس۔ ہر چیز باہر کی اچھی ہوتی ہے۔ بڑا نام ہے مولاں روژ کا ہنگرین جو کھانا پکاتا ہے یہاں۔ میں چلا جاؤں گا۔ گے لارڈ یا پارک یا اشوکا میں۔ کچن ہر جگہ پچھواڑے میں ہوتا ہے۔ کہیں کچن ٹھنڈا نہیں رہتا۔ ہر جگہ ایک ہی قسم کے مسالوں کی بو بسی ہوتی ہے۔ ہر جگہ وہی ہلدی،

پیاز، وہی ادرک، وہی دارچینی، وہی ..... ــــــ میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہنگرین کے بچے یہ لو ہین تجھے مبارک۔ یہ پرچھائیاں ــــــ یہ تیرتے ہوئے خواب، بند ہوتی ہوئی آنکھیں، بندر کے منہ کی طرح کھلے ہوئے منہ ریچھ کی طرح ہلتے ہوئے جسم، ــــــ یہ سب تجھے مبارک ہو۔"

میرا مالک اپنے خاص وقت پر آگیا ہے۔ اسکی آنکھیں نشے سے سوجی ہوئی ہیں۔ لمبے بال کانوں پر جھول رہے ہیں ٹیری لین کا سوٹ اس کے گورے چہرے پر عجیب سی دمک پیدا کر رہا ہے۔ اس کا بدن دن بدن زیادہ بھاری ہوتا جاتا ہے۔ جب وہ پیرس سے آیا تھا اور اس نے مجھے نئی زندگی بخشی تھی، تو اس کا بدن کتنا چھریرا تھا۔ آنکھوں میں کیسی ذہانت اور باتوں میں کیسی شوخی تھی، اب یہ سب کچھ نہیں ہے۔ یہ بڑا فکرمند آدمی ہے۔ بمبئی اور کلکتے کی شاخوں کی فکر اُسے گھن کی طرح کھائے جاتی ہے۔ اس کے دونوں بھائی اور پارٹنر بڑے عیاش نکلے۔ ایکٹرسوں کا چکر، فلمی دنیا کا چکر، اس طرح کی کوئی ذمہ داری نہیں ــــــ

بیوی بچوں کے لئے کتنا اچھا بنگلہ ہے نئی کالونی میں۔ ان کے لئے زندگی کی تمام سہولتیں ہیں۔ ایک نہیں دو کاریں ہیں۔ بنگلے کے لان میں جھولے اور گارڈز ہیں۔ بیوی ایک نہیں، دو دو کلب کی ممبر ہے، پورے وقت وہ گھر کا خیال کرتا ہے، اسے کہتے ہیں آئیڈیل وائف ــ شام، ہاں شام کی بات اور ہے۔ وہ تو بزنس کا گر ہے۔ مجبوری ہے۔ شراب پیتا ہے لیکن بہکتا نہیں۔ آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ہونٹ سوج جاتے ہیں اور آواز بھرا جاتی ہے تو اس میں اس کا کیا قصور ہے۔ اسکی زندگی کا بس ایک چھوٹا سا حصہ ہے، جو اس کا اپنا ہے۔ ایئر کنڈیشن ٹھنڈی ہو چکی ہے۔ مارواڑی گروپ پبلک سکٹر پر بحث کر کے کھسک چکا ہے۔ لیکن دو میزوں کے اوپر لٹکتے ہوئے پیلے اور سرخ شیڈ اب بھی روشن ہیں۔

میرا مالک پیچ و تاب کھا رہا ہے۔ اسکی کنپٹیاں سنسنا رہی ہیں۔ اب وہ لمحہ آگیا ہے، جب میرا کردار بدل جاتا ہے۔ جب میں ہرجائی نہیں رہتا۔ جب میں صرف اس کا ہو جاتا ہوں اپنے مالک کا ــــــ وہ ہوتا ہے اور اس کے پارٹنر کی بیوی ہوتی ہے۔ اس کا پارٹنر کلکتے میں ہے۔ لیکن اسکی بیوی میرے مالک کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ دونوں جب اوپر والے کمرے میں ــــــ میرے دل کے سناٹے میں رات گئے ملتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے سے ایک ہی سوال کرتے ہیں۔ " ہم دونوں ایک دوسرے کو شروع ہی سے کیوں نہ مل گئے ؟ " تھوڑی دیر کے بعد میرے مالک کو اپنی بیوی کی شروع شروع کی بات یاد آتی ہے۔ " اگر ہم ایک دوسرے کو نہ ملتے تو؟ " میرا مالک آنکھیں بند کر لیتا ہے، اور اپنے پارٹنر کی بیوی کے سینے میں منہ چھپا لیتا ہے، اور پوچھتا ہے۔

" یہ کب تک چلے گا ؟ کب تک ؟ "

اس سوال کا جواب میرے پاس بھی نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب صرف وقت دیگا۔ وقت ہی واحد دانا ہے جسکی جھولی میں ہر سوال کا جواب ہے۔ اور وقت خوب جانتا ہے کس سوال کا جواب کب دینا چاہیئے۔

میرا مالک کاؤنٹر کے پاس کھڑا ہو جاتا ہے۔ اسکی ٹانگیں لرزتی ہیں جس طرح طوفان میں درختوں کو جھرجھری آتی ہے۔
"یہ کب جائیں گے؟" منیجر کرسی سے اُٹھ جاتا ہے۔
"کیا میں ان سے کہہ دوں ۔ جائیے ۔" مالک کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ وہ دونوں کونوں کی طرف دیکھتا ہے ۔ جہاں شیڈ روشن ہیں اور تھکی ہوئی روشنی بکھیر رہے ہیں۔
ایک کونے میں سنجوگتا اور رنجیت ہیں۔ یہ دونوں آج تیسری بار آئے ہیں۔ میرے یہاں پناہ لینے ۔ دوسری طرف نوجوان فوجی افسر ہے۔ وہ اپنی وردی میں بڑا بانکا اور سجیلا نظر آرہا ہے ۔ اس کے بال گھنگھریالے ہیں۔ رنگ گندمی ہے' چہرے کے نقوش میں بڑا المناک سا تیکھا پن ہے۔
فوجی افسر تین گھنٹے سے بیٹھا لڑکی سے باتیں کر رہا ہے۔ لڑکی کا پتلا چہرہ بار بار رنگ بدل رہا ہے۔ اس دھند لکے میں بھی اسکے چہرے کی تھکن دیکھی جا سکتی ہے۔ ایک طرح کی شکست کا رنگ' سب کچھ کہہ بیٹھنے کی کیفیت ۔ بڑی بڑی پیاسی اور خوف زدہ آنکھیں۔ آنکھیں جتنی جلدی اُٹھتی ہیں۔ اتنی ہی جلدی جھک جاتی ہیں۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں جسم میں بار بار جھرجھری سی دوڑ جاتی ہے ۔ میں اس لڑکی کے بھنچے ہوئے ہونٹوں اور اس نوجوان افسر کی بکھری ہوئی آنکھوں سے بہت ڈر رہا ہوں۔ نہ جانے کیا ہونے والا ہے ۔ نہ جانے . . . .
دوسرے کونے میں شیڈ جلتا ہے اور بجھتا ہے' بجھتا ہے اور جلتا ہے۔
"رنجیت بس بہت ہو گیا۔ یہ ڈرامہ ختم کرو۔ صبح سے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ کیا یہ کافی نہیں ہے؟"
"تو کیا اب تم ملوگی نہیں؟" لگتا ہے رنجیت کے سینے میں بندوق کی گولی پیوست ہو گئی ہے۔
"ملوں گی کیوں نہیں؟" سنجوگتا کی تیوریاں چڑھ جاتی ہیں' وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہے ۔ "بھوکا! بیوقوف!" وہ پرس اٹھاتی ہے اور اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ وہ چند قدم دروازے کی طرف بڑھتی ہے اور پلٹ کر دیکھتی ہے۔ رنجیت زندگی میں پہلی بار سنجیدگی سے فیصلہ کر رہا ہے ۔ اس کا سر جھکا ہوا ہے ۔ وہ فیصلہ کر چکا ہے۔ ایک ہی لمحے کے اندر خیالوں کے کئی ریلے اُسے مخالف سمتوں میں بہالے جاتے ہیں۔ "یہ مجھ سے کھیل رہی ہے ۔ بلی چوہے سے کھیل رہی ہے۔ میں چوہا ہوں۔ سچ مچ چوہا ہوں۔"

"Rat poison is the best way out."

وہ اُٹھتا ہے اور آہستہ آہستہ سنجوگتا کے پیچھے پیچھے چلتا ہے۔ لیکن مولان روڈ میں لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ سنجوگتا اور مولان روڈ زندہ رہیں گے۔ مولان روڈ وہی ہوگا۔ سنجوگتا وہی ہوگی۔ ہاں سنجوگتا کے ساتھ کوئی اور ہوگا۔ اس پاس بیٹھے ہوئے ٹھیکیداروں کی بے ہودگیاں وہی ہوں گی ۔ انٹلکچول اسی طرح اپنی بڑائی ہانکیں گے۔ ڈپلومیٹ اسی طرح اپنا اُلّو سیدھا کرتے رہیں گے ۔ اور بین الاقوامی بیویوں کے کمر میں ہاتھ ڈالتے رہیں گے۔ نئی نئی فلموں پر بحثیں

ہوں گی۔ کسی کی آنکھوں کی تعریف ہوگی۔ کسی کے قد و قامت کا ذکر ہوگا۔ گلاس چھلکیں گے، آنکھیں چھلکیں گی۔ سب کچھ ہوگا۔ میں نہ ہوں گا۔ کتنی عجیب بات ہے کہ کل میں نہ ہوں گا۔ چاند ہوگا۔ آسمان ہوگا اور میں نہ ہوں گا۔ ریٹ پوائنٹ۔ کتنا عجیب انجام" دروازہ کھلتا ہے اور الّو کی آنکھیں اب دکھائی نہیں دیتیں۔ کیونکہ اب صرف کاؤنٹر کے پاس منیجر کے سر پر روشنی کا ایک چھوٹا سا دائرہ ہے یا دور کونے میں، ہری بیلوں سے پرے فوجی افسر کی میز پر۔

"تو کیا وہ سب جھوٹ تھا جو تم نے نینی تال میں کہا تھا؟"

"کیا کہا تھا میں نے؟" لڑکی کی نرم آواز خود لڑکی کو خوف زدہ کر دیتی ہے۔

"دیکھو آج کی رات بڑی خطرناک رات ہے۔ فیصلے کی رات ہے۔ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔ محاذ ——— محاذ ——— محاذ ———"

"تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟ جو کہو کہہ دوں؟"

"نہیں۔ نہیں — وہ کہو جو تمہارا دل کہتا ہے"

"تو ایک بار پھر دہراؤں جو کچھ میں تین گھنٹے سے کہتی آ رہی ہوں" لڑکی کی آنکھیں ستاروں بھرے آسمان کی طرح پھیل جاتی ہیں۔

"ہاں۔ آخری بار۔ رات بڑی خطرناک ہے۔ یہ زندگی اور موت کی رات ہے۔ میں محاذ پر جا رہا ہوں۔ میں موت سے نہیں ڈرتا۔ موت سے نہیں۔ تمہاری باتیں سننے کے بعد میں زندگی سے ڈر رہا ہوں۔ زندگی سے، اپنے آپ سے" فوجی افسر کا نوجوان چہرہ زرد ہے۔ اسکی آنکھیں بڑی خطرناک ہیں۔ خون کی پیاسی۔ محاذ پر جانے والی آنکھیں۔

"وہ سب جھوٹ نہیں تھا۔ لیکن فیلنگ بدل بھی سکتی ہے۔ یہ بات تم کیوں نہیں سمجھتے۔ میں تم کو خوش نہیں کر سکتی۔ میں نے کسی کو دھوکا نہیں دیا ہے۔ میں نے نینی تال میں سچ کہا تھا۔ اور اب اس وقت یہاں بھی سچ کہہ رہی ہوں"

"مجھے یاد ہے جھیل میں ستارے تیر رہے تھے، درختوں کے دھندلے سائے ہمیں بلا رہے تھے اور تم میرے کانوں میں کہہ رہی تھیں ——— "اگر ہم دونوں اس وقت ستاروں بھری جھیل میں ڈوب جائیں تو ...... میں نے تمہارے منھ پر ہاتھ رکھ دیا تھا، اور کہا تھا۔ ہم جئیں گے، اسی جھیل کی طرح ستاروں کی چھاؤں میں — کتنی رومانی باتیں تھیں۔ میں فوجی آدمی ہوں۔ لیکن مجھے بھی لگ رہا تھا کہ میں شاعر ہوں۔ میں گنگنا سکتا ہوں، گا سکتا ہوں"

"لیکن وہ سب ختم ہو چکا ہے" لڑکی زخمی پرندے کی طرح چاروں طرف دیکھتی ہے۔

"بھول جاؤ ـــــ نئی زندگی شروع کرو۔"

"نئی زندگی؟" نوجوان افسر دانت پیس کر کہتا ہے۔ "کیونکہ فیلنگ بدل گئی ہے"؟ لڑکی سرہلاتی ہے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی ہیں۔

دور کاؤنٹر کے پاس مالک بھر رہا ہے۔ اس کا ڈرائیور پارٹنر کی بیوی کو لیکر نہیں لوٹا ہے۔ وہ سوچتا ہے "فوجی افسر سے کہنا ہی پڑے گا۔ ساڑھے بارہ بج رہے ہیں ـــــ"

فوجی افسر اٹھتا ہے۔ "اچھا چلیں!" وہ کرسی ہٹاتا ہے۔ لڑکی کے لئے جھک کر راستہ بناتا ہے۔ لڑکی خوف زدہ اور محبت بھری آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھتی ہے۔ کوئی طاقت اُسے اُٹھنے سے روک رہی ہے۔ وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے دھندلی پرچھائیوں کو دیکھتی ہے۔ "میں نہیں جانتی، مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں اس سے نہیں تو کس سے محبت کرتی ہوں؟ یہ محاذ پر جا رہا ہے ـــــ بیچارا۔ محبت کا مارا شہید۔ کل میں ہوائی اڈے پر اس سے ملوں گی اور بتا دوں گی۔ سب بتا دوں گی۔ میں تیواری کے عشق میں گرفتار نہیں ہوں۔ میں لندن سے لوٹ کر آؤں گی تو۔ محاذ پر کچھ نہ ہو ـــــ کاش محاذ پر کچھ نہ ہو ـــــ"

فوجی افسر اب بھی سر جھکائے اُسے اُٹھنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ لڑکی اُٹھتی ہے۔ اس کا ترشا ہوا۔ گدرایا ہوا جسم دیکھ کر تو میرے دل کی بھی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ میں کھڑا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔ فوجی افسر کے دل کو۔ نینی تال کی جھیل اور ستاروں بھرے آسمان کو ـــــ

لڑکی فوجی افسر کے بازو کو چھوتے ہوئے اس سے آگے نکلتی ہے۔ اور چھوٹے چھوٹے قدموں سے آگے نکلتی ہے۔ فوجی افسر وہیں کھڑا ہے۔ وہ بڑے اطمینان سے خول سے ریوالور نکالتا ہے اور ایک، دو، تین ـــــ تین گولیاں، لڑکی کی گردن، شانے اور کمر میں ٹھنڈی کر دیتا ہے۔ تڑاخ، تڑاخ۔ تڑاخ ـــــ اور پھر سناٹا ـــــ

میں خاموش ہوں ـــــ میں سب دیکھ رہا ہوں۔ لڑکی تلملاتی ہے۔ مڑنا چاہتی ہے لیکن چکرا کر اسی کرسی پر گرتی ہے جس پر دوپہر کو سردارنی بیٹھی چار کورس کا کھانا کھا رہی تھی۔ جس کے سینڈل کی نوک کے نیچے ایک عورت کی ہڈیاں دفن ہیں۔ بس چند فیٹ نیچے ـــــ

مالک پیچھے ہٹتا ہے ـــــ آگے بڑھتا ہے، چکراتا ہے۔ منیجر دروازہ کھول کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ سارے بیرے اور کچن والے ریسپرسیپشن کے پاس کھڑے ہو جاتے ہیں۔ نہیں آتا تو صرف ہنگرین نہیں آتا ـــــ وہ ایسی تڑاخ تڑاخ بہت سن چکا ہے ـــــ یکایک مالک چیختا ہے۔

"روشنی! روشنی!"

کوئی سوئچ بورڈ کی طرف دوڑ رہا ہے ــ

اور میں سکتے اور اضطراب کے اس ایک لمحے میں دیکھتا ہوں نوجوان آہستہ آہستہ اپنا ریوالور اپنی کن پٹی پر رکھتا ہے جس کی نال سے اب تک دھواں نکل رہا ہے۔ میرا دل پکارتا ہے۔ اس دیوانے کو روکو! لیکن میں جانتا ہوں۔ یہ ہو کر رہے گا۔ میں آنکھیں پھاڑے دیکھتا رہ جاتا ہوں۔ تڑاخ۔!

میرا مالک اور سب اتنے خوف زدہ اور گھبرائے ہوئے ہیں کہ انھیں اس "تڑاخ" کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ سب لڑکی کی لاش پر جھکے ہوئے ہیں۔ لڑکی کی ہتھیلیاں کھلی ہوئی ہیں اور آنکھیں بھی۔ بالوں کے کانٹے فرش پر بکھر گئے ہیں۔ پرس مالک کے قدموں میں پڑا ہوا ہے۔ لڑکی کے ہونٹ مسکرا رہے ہیں۔ پوری شام میں پہلی بار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آئی ہے۔ یہ میں جانتا ہوں۔ اور کوئی نہیں جانتا۔

رات، پولس، گواہیاں، لاشیں، خون!

آسمان پر صبح کے ستارے جھلملا رہے ہیں۔ بیک یارڈ میں سارے بیرے، ڈرائیور، مستری، کاریگر جاگ رہے ہیں۔ سب چپ ہیں۔ رات کی طرح۔

دروازے پر پولس کا پہرہ ہے۔ اور اندر مالک آسیب کی طرح فرش پر بھٹک رہا ہے۔

"صاحب میں سارے میں ڈھونڈھ آیا۔ میم صاحب کہیں نہیں ہیں۔" ڈرائیور کانپ گیا۔

"Go to hell" مالک پیر پٹکتا ہے۔

آسمان سے ستاروں کی راکھ برس رہی ہے اور چھجے پر ہنگرین گا رہا ہے:

میں نے بہت دیکھا ہے خون،

دلوں کا، محبتوں کا، خوابوں کا،

ایک دل اور سہی،

ایک محبت اور سہی،

ایک خواب اور سہی

کیفی اعظمی

پانچ نظمیں

آوارہ سجدے

اک یہی سوزِ نہاں کُل مرا سرمایہ ہے
دوستو میں کسے یہ سوزِ نہاں نذر کروں
کوئی قاتل سرِ مقتل نظر آتا ہی نہیں
کس کو دل نذر کروں اور کسے جاں نذر کروں
تم بھی محبوب مرے تم بھی ہو دلدار مرے
آشنا مجھ سے مگر تم بھی نہیں تم بھی نہیں
ختم ہے تم پہ مسیحا نفسی چارہ گری
محرمِ دردِ جگر تم بھی نہیں تم بھی نہیں

اپنی لاش آپ اٹھانا کوئی آسان نہیں
دست و بازو مرے ناکارہ ہوئے جاتے ہیں
جن سے ہر دور میں چمکی ہے تمھاری دہلیز
آج سجدے وہی آوارہ ہوئے جاتے ہیں

دور منزل تھی مگر ایسی بھی کچھ دور نہ تھی
لئے پھرتی رہی رستے ہی میں وحشت مجھکو
ایک زخم ایسا نہ کھایا کہ بہار آجاتی
دار تک لیکے گیا شوقِ شہادت مجھ کو

راہ میں ٹوٹ گئے پاؤں تو معلوم ہوا
جز مرے اور مرا راہنما کوئی نہیں
ایک کے بعد خدا ایک چلا آتا تھا
کہہ دیا عقل نے تنگ آکے خدا کوئی نہیں

دوپہر

یہ جیت ہار تو اس دور کا مقدر ہے

یہ دور جو کہ پرانا نہیں نیا بھی نہیں
یہ دور جو کہ سزا بھی نہیں جزا بھی نہیں
یہ دور جس کا بظاہر کوئی خدا بھی نہیں

تمہاری جیت اہم ہے نہ میری ہار اہم
کہ ابتدا ابھی نہیں ہے یہ انتہا بھی نہیں
شروع معرکۂ جاں ابھی ہوا بھی نہیں
شروع ہو تو یہ ہنگام فیصلہ بھی نہیں

پیامِ زیرِ لب اب تک ہے صورِ اسرافیل
سنا کسی نے کسی نے ابھی سنا بھی نہیں
کیا کسی نے کسی نے یقیں کیا بھی نہیں
اٹھا زمیں سے کوئی اور کوئی اٹھا بھی نہیں

قدم قدم پہ دیئے ہیں وہ رہزنوں نے فریب
کہ اب نگاہ میں توقیرِ رہنما بھی نہیں
اسے سمجھتے ہیں منزل جو راستہ بھی نہیں
وہاں لگاتے ہیں ڈیرا جہاں وفا بھی نہیں

یہ کارواں ہے تو انجامِ کارواں معلوم
کہ اجنبی بھی نہیں کوئی آشنا بھی نہیں
کسی سے خوش بھی نہیں ہے کوئی خفا بھی نہیں
کسی کا حال کوئی مڑ کے پوچھتا بھی نہیں

تضاد

کوئی دیتا ہے درِ دل پہ مسلسل آواز
اور پھر اپنی ہی آواز سے گھبراتا ہے
اپنے بدلے ہوئے انداز کا احساس نہیں
میرے بہکے ہوئے انداز سے گھبراتا ہے
ساز اٹھایا ہے کہ موسم کا تقاضا تھا یہی
کانپتا ہاتھ مگر ساز سے گھبراتا ہے
راز کو ہے کسی ہمراز کی مدت سے تلاش
اور دل صحبتِ ہمراز سے گھبراتا ہے
شوق یہ ہے کہ اڑے وہ تو زمیں ساتھ اڑے
حوصلہ یہ ہے کہ پرواز سے گھبراتا ہے
تیری تقدیر میں آسائشِ انجام نہیں
لے کے تو شورشِ آغاز سے گھبراتا ہے
کبھی آگے کبھی پیچھے کوئی رفتار ہے یہ
ہم کو رفتار کا آہنگ بدلنا ہوگا
ذہن کے واسطے سانچے تو نہ ڈھالے گی حیات
ذہن کو آپ ہی ہر سانچے میں ڈھلنا ہوگا

یہ بھی جلنا کوئی جلنا ہے کہ شعلہ نہ دھواں
اب جلا دیں گے زمانے کو جو جلنا ہوگا
راستے گھوم کے سب جاتے ہیں منزل کی طرف
ہم کسی رُخ سے چلیں ساتھ ہی چلنا ہوگا

عادت

مدّتوں میں اک اندھے کنویں میں اسیر
سر پٹکتا رہا، گڑگڑاتا رہا
روشنی چاہیئے
چاندنی چاہیئے
زندگی چاہیئے
روشنی پیار کی
چاندنی یار کی
زندگی دار کی
اپنی آواز سنتا رہا رات دن
رفتہ رفتہ یقیں دل کو آتا رہا

سونے سنسار میں
بے وفا یار میں
دامنِ دار میں
روشنی بھی نہیں
چاندنی بھی نہیں
زندگی بھی نہیں
زندگی ایک رات
آدمی بے ثبات
واہمہ کائنات
لوگ کوتاہ قد
شہر شہرِ حسد
گاؤں اُن سے بھی بد
اور اندھیروں نے جب بیس ڈالا مجھے
پھر اچانک کنویں نے اچھالا مجھے
اپنے سینے سے باہر نکالا مجھے

سیکڑوں مصر تھے سامنے
سیکڑوں اسکے بازار تھے
ایک بوڑھی زلیخا نہیں
جانے کتنے خریدار تھے
بڑھتا جاتا تھا یوسف کا دل
لوگ بکنے کو تیار تھے
کھل گئے مہ جبینوں کے سر
ریشمی چادریں ہٹ گئیں
پلکیں جھپکیں نہ نظریں جھکیں
مرمریں انگلیاں کٹ گئیں
ہاتھ دامن تک آیا کوئی
دھجیاں دور تک بٹ گئیں
میں نے ڈر کے لگا دی کنوئیں میں چھلانگ
پھر پٹکنے لگا سر اسی درد سے
پھر اسی کرب سے گڑگڑانے لگا
روشنی چاہیئے
چاندنی چاہیئے۔ زندگی چاہیئے۔

مسیحا

میں نے تنہا کبھی اس کو دیکھا نہیں
پھر بھی جب اس کو دیکھا وہ تنہا ملا
جیسے صحرا میں چشمہ کہیں
یا سمندر میں مینارِ نور
یا کوئی فکر اوہام میں
فکر صدیوں اکیلی اکیلی رہی
ذہن صدیوں اکیلا اکیلا ملا
اور اکیلا اکیلا بھٹکتا رہا
ہر نئے ہر پرانے زمانے میں وہ
بے زباں تیرگی میں کبھی
اور کبھی چیختی دھوپ میں
چاندنی میں کبھی خواب کی
اس کی تقدیر تھی اک مسلسل تلاش
خود کو ڈھونڈھا کیا ہر فسانے میں وہ
جن تقاضوں نے اس کو دیا تھا جنم

ان کی آغوش میں پھر سمایا نہ وہ
خون میں وید گونجے ہوئے
اور جبیں پر فروزاں اذاں
اور سینے پہ رقصاں صلیب
بے جھجک سب کے قابو میں آتا گیا
اور کسی کے بھی قابو میں آیا نہ وہ
بوجھ سے اپنے اس کی کمر جھک گئی
قد مگر اور کچھ اور بڑھتا رہا
خیر و شر کی کوئی جنگ ہو
زندگی کا ہو کوئی جہاد
یا کوئی معرکۂ عشق کا
وہ ہمیشہ ہوا سب سے پہلے شہید
سب سے پہلے وہ سولی پہ چڑھتا رہا
ہاتھ میں اس کے کیا تھا جو دیتا ہمیں
صرف اک کیل اسی کیل کا اک نشاں
نشۂ مے کوئی چیز ہے

اک گھڑی دو گھڑی ایک رات
اور حاصل وہی دردِ سر
اس نے زنداں میں لیکن پیا تھا جو زہر
اٹھ کے سینے سے بیٹھا نہ اس کا دھواں

افسانے

راجندر سنگھ بیدی

جنازہ کہاں ہے

کہیں سے سسکیوں کی آواز آرہی ہے۔ کہیں کوئی رو رہا ہے اور میں گھبرا کر جاگ اُٹھتا ہوں...

اس وقت صُبح کے ساڑھے تین بجے ہیں...

— نہیں تو۔ میرا لڑکا تو سو رہا ہے۔ شاید... میں اُس کے بیڈ روم میں جا کر اندھیرے میں اپنا کان اُس کے منہ کے پاس لے جاتا ہوں۔ وہ سو رہا ہے، مزے کی نیند۔ پھر یہ کس کے رونے، کس کے سسکیاں لینے کی آواز ہے؟ ایسی ہی ایک آواز بلکہ آوازیں میں نے برسوں پہلے سنی تھیں۔ وہ دن، وہ قہر کا عالم، آپ کو بھی یاد ہوگا، جب دن کو سورج ڈوب گیا تھا اور سر چار سو سے ہائے ہائے کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ جب گاندھی جی کا قتل ہوا تھا۔

یہ آواز۔ کہیں خفتی، میری بیوی کی تو نہیں؟ نہیں، اُس کی آواز کیسے ہو سکتی ہے یہ؟ وہ تو یہاں ممبئی سے ہزار میل دور پنجاب کے کسی گاؤں میں بیٹھی ہے۔ اپنے بھائی کے پاس۔ ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے یہ اُسی کی آواز ہو جو زمان و مکان کی وسعتوں کو چیرتی پھاڑتی ہوئی میری سائیکی میں چلی آئی ہو، کیونکہ میں نے قریب قریب اُسے چھوڑ رکھا ہے۔ میں کیا کرتا؟ وہ بہت زیادہ بکواس کرنے لگی تھی اور سوال سے پہلے ہی جواب دینے لگتی تھی۔ اس لئے میں نے اُس کا نام خفتی رکھ دیا تھا۔ حالانکہ وہ دُلاری ہے، ایک سیدھی سادی گھریلو عورت۔ لیکن کیا آج کی عورت کے لئے صرف گھریلو ہونا کافی ہے؟

گھریلو عورت!... گھریلو عورت وہی ہوتی ہے نا جو گھر ہی میں رہے۔ میاں کے لئے روٹیاں پکائے۔ سفر سے اُس کی واپسی پہ اُس کے بوٹ کے تسمے کھولے، اُس کا بستر بچھائے اور اشارہ پاتے ہی اُس پہ چلی آئے۔ نتیجہ؟ — بچے، پھر اور بچے۔ لیکن باہر کی ہوا اُسے نہ لگنے پائے، جس سے پھپھوندی لگ جائے۔ جب اسے اور کوئی دکھائی ہی نہیں دیتا تو کیا وہ دیواروں سے لڑے گی، دروازوں سے ٹکرائے گی؟ کچھ دن کے بعد یوں معلوم ہوگا، جیسے آپ نے عورت سمجھ کر شادی کی تھی، وہ چھچھوندر نکلی۔ آج کی بیوی... جانے کیا ڈر بیٹھ گیا ہے اُس کے دل میں کہ وہ دنیا کی ہر بگڑی بات کے لئے خود کو دوشی سمجھنے لگی ہے، ورنہ ہر بات میں وہ یوں مداخلت پر اُتر آئے؟ اور اب جبکہ عاجز آکر میں نے اُس سے کنارہ کشی کر لی ہے تو وہ گاؤں میں بیٹھ کر اپنی یا میری جان کو رو رہی ہے

کیوں نہ روئے؟ ہم مرد بھی تو ہر بار کسی تازہ عورت کے پیچھے بھاگنے لگتے ہیں۔ تازہ۔ جیسے وہ عورت نہیں ٹھنڈی ہے۔ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں؟ شاید اس لئے کہ بچپن ہی سے ہم نے تجربہ پہ لیکچر سُنے ہیں اور جب شادی ہوئی تو بیوی کے ساتھ پیار کرنے پر کانپنے ہیں۔۔۔ خیر، میں بھی اِس تازہ عورت کے ساتھ راس رچاکر اُس کے بارے میں اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں نہ کیا یہ بیوی کے فرائض انجام دے سکتی ہے، تو اندر سے ایک مسکت جواب آتا ہے۔ نہیں۔ تو پھر؟ اگر میری بیوی کو اتنا ہی دُکھ ہے تو وہ مجھے لکھتی کیوں نہیں؟ شاید وہ دنیا کی ہر بیوی کی طرح سمجھتی ہے کہ ایک دن میں جھک مار کے آؤں گا اور اُس کے پاؤں پڑکر اُسے منا کے لے جاؤں گا۔ عجیب بھونڈا اعتماد ہے اُسے میری محبت پہ۔۔ جیسے اس دنیا میں نہ کوئی کلب ہے، نہ سینما تماشہ، نہ ہوٹل، نہ قحبہ خانہ، نہیں، شاید مجھ سے خلاصی پاکر وہ خوش ہو، ہنستی ہو، ہو سکتا ہے میں نے اُسے نہیں، اُسی نے مجھے چھوڑدیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا رونا دھونا میرا وہم ہو اور یا پھر خواہش ہو میری ہی۔۔۔

ارے! کہیں میں خود تو نہیں رو رہا؟ یہ جنھیں میں سانسیں سمجھ رہا ہوں، کہیں میری اپنی ہی سسکیاں تو نہیں؟ شاید۔ کیا بے ہودگی ہے۔ معلوم ہوتا ہے میں خبط الحواسی کا مریض ہوگیا ہوں۔۔۔

عجیب جذبے ہیں، عجیب خواہشیں اور اُن سے زیادہ عجیب ڈر۔ مثلاً کل ہی شام میں نے چند البیلوں کے ساتھ کوکا وا، چینی ریستوران میں کھانا کھایا۔ ہم اپنے سیٹلمنٹ آفس کے کچھ دوست، پرتگیز چرچ کے ہمائے تلے، ایک موٹی، گوانی، عورت کے گھر میں ملے جو چوری کی شراب بیچتی تھی۔ اس نے ہمیں بڑی تیز مسیرا پلائی اور میرے دوست نندلال کے ہاتھ کچھ سمگل کی ہوئی گھڑیاں بیچ دیں۔ میں نے صرف ایک سگریٹ لائٹر خریدا۔ وہ تو نندلال کو ایسا سونا بھی بیچ دیتی۔ مگر اس غریب کے پاس صرف پانسو روپیئے تھے جو آج دفتر میں ایک بیوہ بڑھیا کا کیس "ٹھیک" کرنے کے سلسلے میں اُس نے اینٹھے تھے۔ بہرحال میرا سے رُخصت ہوکر ہم نے اپنے ایک گجراتی دوست سے کار مانگی جو اس نے کسی سفارت خانے کی معرفت امپورٹ کی تھی۔ اگر وہ کسی کے نام پر گاڑی خرید سکتا تھا، تو کیا ہم اُس کے نام پہ اسے چلا بھی نہ سکتے تھے؟ چنانچہ ہم سب بے کار دوست اُس گجراتی کی کالی چمکیلی گاڑی میں بیٹھ کر چلے۔ راستے بھر ہمیں ایک پل کے لئے بھی محسوس نہ ہوا کہ وہ گاڑی ہماری اپنی نہیں ہے۔ کوکا وا پہنچے تو اندر داخل ہوتے ہی سب سے پہلے بیرے نے مجھے سلام کیا، جس سے ایک عجیب سی گدگدی میرے اندر پیدا ہوئی۔ کیونکہ میں سلام لینے کا نہیں، دینے کا عادی تھا۔ کھانے میں ہم نے شارک فن ملے ہوئے کیکڑے کا سوپ پیا، جس سے مردمی بڑھتی ہے۔ پھر بھُنے ہوئے چاولوں کے ساتھ، ہم نے کھٹی میٹھی جھینگا مچھلی کھائی اور دوسرا بہت کچھ الّم غلّم۔ اس پہ نندلال نے نوڈل کا آرڈر دے دیا۔ ہم سب کا پیٹ پھٹ رہا تھا، اُس پہ بھی اُس نے نوڈل کیوں منگوا لئے؟ اب ہمارے سامنے وہ نوڈل بے شمار کینچوؤں کی طرح پڑے تھے اور ہم انھیں کھا نہ سکتے تھے۔ لیکن نندلال کو ایک عجیب طرح کی تسلی تھی۔ یہ گھر پہنچ کر ہماری سمجھ میں آیا، کہ ہم نے اس قدر

پیٹ کیوں ٹٹولنا؟ اتنا چھوٹا کیوں چھوڑا؟ بات یہ تھی، صبح میں نے، نندلال نے اور دوسرے میرے سب دوستوں نے، بہار میں اور یو پی کے کچھ ضلعوں میں سوکھے کی خبریں پڑھی تھیں اور وہ تصویر بھی دیکھی تھی، جس میں ایک ڈھانچ سالڑکا کھڑا، کسی پیڑ کی چھال کھا رہا تھا۔ اسی بھوک کے خیال نے شاید ہمارے دماغ میں کوئی اونٹ کا سا کوہان پیدا کر دیا، جسے ہم نے مفتوں کے کھانے سے بھر لیا۔

یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ خفتی جانے سے دو دن پہلے مجھ سے لڑی تھی۔ ہمارا جس بات پہ جھگڑا ہوا۔ وہ ایک نہایت نضول سی چیز تھی۔ مٹی کا تیل، جو گھر میں چولہا جلانے یا خودکشی کے کام آتا ہے۔ خفتی بکے جا رہی تھی۔ تیل کی، ایک بوند نہیں ہے۔ پھر مجھے مت کہنا، کھانا نہیں پکا۔ میں نے کہا۔ میں نہیں کہوں گا۔ بھوکا مر جاؤں گا پر تمھیں نہیں کہوں گا۔ مجھ سے تیل کے کیو میں کھڑا نہیں ہوا جاتا۔ میں در اصل عورت کے اس جذبے سے فائدہ اٹھا رہا تھا جس سے وہ مرد کو کبھی بھوکا نہیں دیکھ سکتی۔ وہ لڑے گی، جھگڑے گی، گالیاں دے گی لیکن پھر کیسے بھی، کہیں سے بھی بندوبست کر کے آپ کا پیٹ بھرے گی۔ پھر گالیاں دے گی، پھر دہی کرے گی اس میں اچنبھے کی کوئی بات نہیں۔ مرد جب بچہ ہوتا ہے تو وہ اسے اپنی چھاتی سے دودھ پلاتی ہے، بڑا ہوتا ہے تو اس کے لئے روٹیاں پکاتی ہے، اُس کی ہر بھوک کا سامان کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کسی کے گھر میں جائیں تو یہ عورت ہی ہے جو سب سے پہلے پوچھے گی۔ آپ کیا کھائیں گے؟ کیا پئیں گے؟ بعض وقت تو پوچھے گی بھی نہیں اور گھر میں جو سب سے اچھی چیز ہے، آپ کے سامنے لا رکھے گی۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ وہ آپ پر کوئی احسان کر رہی ہے۔ کھا کر اپنی بھوک مٹا کر اُلٹا آپ اُس پہ احسان کر رہے ہیں . .

چنانچہ اُس دن میں مٹی کا تیل نہیں لایا۔ لیکن گھر لوٹا تو خوب پیٹ بھر کر کھانا کھایا۔ صبح جب میں دفتر جانے کے لئے نکلا تو میرے ہاتھ میں اخبار تھا۔ جسے میں آج کل کے حالات جاننے کے لئے کم اور اجابت کے لئے زیادہ استعمال کرتا ہوں۔ ہاں، اخبار ساتھ لے جائے بغیر مجھے ٹھیک سے باتھ روم نہیں ہوتا نا۔ اُس دن کے اخبار میں سیاسی خبروں کے ساتھ معمول کے قتل، دھوکا دہی اور ریل کے ایکسی ڈنٹ وغیرہ کی خبریں چھپی تھیں۔ ریل کے ایکسی ڈنٹ تو خیر ریل کا مگاروں اور سیاسی پارٹیوں کے ڈسپلن کی وجہ سے روز ہوتے ہیں۔ مگر ایک بات جو مجھے خدائی قہر سے بھی زیادہ لگی، وہ بمبئی میں پانی کا قحط تھی۔

پانی کا قحط؟ جی ہاں، یہ بیسویں صدی کے ہندوستان کا ایک بہت بڑا معجزہ ہے ورنہ ہم نے اپنی تاریخ میں ابھی غلّے کے قحط تک ہی ترقّی کی تھی۔ بمبئی کے چاروں طرف سمندر ہی سمندر اور یہاں پانی کا کال، ہمیں فیثا غورث کے اس آدمی کی یاد دلاتا تھا جو نچلے ہونٹ تک پانی میں ڈوبا ہوا ہے۔ لیکن جب پینے کے لئے اپنا منھ نیچے کرتا ہے تو ساتھ ہی پانی کی سطح بھی نیچی ہو جاتی ہے اور وہ پانی میں پیاسا مر جاتا ہے۔ ایک ہی دن پہلے میں نے کیو میں کھڑے ہونے اور مٹی کا تیل لانے سے انکار کیا تھا۔ لیکن اب جبکہ میں نے خفتی کو بتایا کہ کچھ دیش بھگت

بمبئی سے اُتری لوگوں کو پانی نہ ہونے کی وجہ سے نکال رہے ہیں، تو وہ مجھ پر برس پڑی، جیسے میرا قصور تھا اس میں... پھر وہ اپنے آپ، خود کو گالیاں دینے لگی، جیسے میں نے اس پہ کوئی بہت بڑا الزام لگا دیا۔ اس میں الزام کی کیا بات تھی؟ زندگی خود ایک الزام ہے بھائی، ایک بہت بڑی تہمت جو مرد پہ کم اور عورت پہ کچھ زیادہ ہی لگائی گئی ہے۔ پھر اتنے بڑے ملک، اُس کے اتنے بڑے کلچر، فلسفے، پُرانی تاریخ کے وارث ہونا ہے تو یہ قیمت تو دینا ہی پڑے گی۔ نہیں دینا تو جائیے امریکا، جہاں کی اصلی تاریخ ہی تین سو سال پُرانی ہے۔ کیسے وہ پاگل کی طرح سے دوڑ رہے ہیں، مادّی ترقی کی پیرا ڈیگراؤنڈ پہ۔ آخر روحانی ترقی بھی تو کوئی چیز ہے.....

ہم جائیں گے تو کہاں جائیں گے؟ — خُفتی رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ اُنیس برس ہوئے ہم خوشاب، پنجاب سے نکلے، اپنے پیروں کی مرجادا، ان کی سمپتی چھوڑ کر، راستے میں مرے، کٹے۔ کنویں ہماری لاشوں سے پٹے، پر چلتے رہے۔ بجز ایک ہی طرف تھی کہ بھارت کی شسّش شاملا، اس کی ہری بھری گود میں جائیں گے تو سب دُکھ دلدّر دور ہو جائیں گے۔ یہاں آئے تو صرف جوتے کھائے، بھگوڑے کہلائے کچھ کھانے کو نہیں، ہر چیز کو آگ لگی ہے۔ آج ایک چیز کے دام پندرہ پیسے ہیں تو دس ہی دن میں پچاس ہو جاتے ہیں۔ چادر چھوٹی، مانس لمبا، آدھا ڈھانپنے پہ بھی پورا ننگا۔ تم ہی مجھے یہاں لے آئے۔ بمبئی میں بجنس بہت ہے۔ اب کرو بجنس۔ میں تو ہوں ہی بھاگوں جلی، جو ایک تمھارے ساتھ چلی، وہ جے اس سروپ نکھا کے دیس میں بسا کیا۔ اپنی ناک تو کٹے ہی کٹے۔ ہم نے یہاں اتنا پسینہ لگایا۔ خون پسینہ بہایا اور کھارکی سی کھادر، کھاری جمین کو لاہور کی انارکلی بنا دیا اور اب اِدھر کے گھاٹی لوگ بولتے ہیں۔ مومبئی کنئے ہی؟ ہم جی۔ تم پنجابی سندھی لوگ جاؤ۔ اب ہم کدھر جائیں؟ بولو؟ اپنا بھارت دیس کدھر ہے، بولو جی...؟

میں کیا بولتا؟ بنگال ہے تو بنگالیوں کا۔ گجرات گجراتیوں کا، دکھن دکھنیوں کا، ہمارا تو کچھ بھی نہیں۔ ہم تو تیرتی ہوئی آبادی کہلانے لگے۔ کچھ دیر بعد اُڑتی ہوئی کہلائیں گے۔ میں اخبار ہاتھ میں لئے دفتر جانے کے لئے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ باہر چالی کے میدان میں نل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ مٹی میں ملا ہوا ایک قطرہ ٹپکتا ہے۔ میں سوچتا ہوں، کہیں مٹی کا تیل ہی نہ ہو۔ لیکن نہیں وہ پانی ہے۔ نل اپنی سانس روک کر سوں سوں کرنے لگتا ہے۔ اس کے نیچے لوسٹی گھی کا ایک خالی ٹین رکھا ہے اور اس کے بعد لائن میں کچھ نہیں تو پچاس ساٹھ مٹکے، بالٹیاں، ٹھلیاں پڑی ہیں۔ اور کچھ نہیں تو پتھر ہی پڑے ہیں جو کسی کی باری کی نشانی ہیں۔ ان کے مالک یا مالکنیں آئیں گی تو برتن آگے پیچھے ہو جانے سے ایک دوسرے کے بال نوچیں گی۔ لڑتی ہوئی چھچھوندریں معلوم ہوں گی — خُفتیاں، سب کی سب...

اس سنسار کا سارا سوندریہ انسان کے کارن ہے اور جب انسان نہ ہو تو اس کی چیزیں کتنی بھیانک معلوم ہوتی ہیں۔ آپ نے کسی مرنے والی کی پیشواز دیکھی ہے؟ میں نے دیکھی ہے۔ یہ ہندو مسلم فسادات کے

بعد کی بات ہے۔ میں ان دنوں جمّوں میں تھا اور ایسے ہی چلتے ہوئے توسی دریا کے کنارے جا نکلا۔ وہاں بریتے میں ایک ڈھانچ پڑا تھا۔ جس کا کچھ حصہ تو ریت میں تھا اور کچھ باہر۔ ڈھانچ دیکھنے سے کیا پتہ چلتا ہے کہ وہ مرد کا ہے یا عورت کا۔ ایک عام آدمی کو پیلوس PELVIS دیکھنے سے اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن صاحب! اس ڈھانچ کی ٹانگوں کے ساتھ پشواز کے چیتھڑے چپکے ہوئے تھے اور ایک بازو کی ہڈی پہ چوڑیاں تھیں جو آب و ہوا اور باد و باراں سے کالی پڑ چکی تھیں۔ میں وہاں سے بھاگ نکلا۔ جیسا کہ میں حقیقت کو دیکھ کر ہمیشہ کرتا ہوں۔ لیکن بھارت دیس ہی اتنا بڑا ہے کہ جہاں سے بھاگیں وہ بھارت اور جہاں پہنچیں وہ بھی بھارت۔ اور پھر بھارت کہیں بھی نہیں ..... ہاں، تو میں ان برتنوں کی بات کر رہا تھا..... وہ برتن موجود اور برتن والیاں غائب! نل میں پانی شاید دو بجے چھوٹتا تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب منظر انگڑائی لے کر جاگے گا اور بھرپور ہو جائے گا۔ جھگڑے ہوں گے، مار پٹائی ہوگی اور پھر جا کے کہیں خون پانی ہوگا۔ جو بھی ہوگا اچھا ہی ہوگا کیونکہ اس مردہ ہول سے وہ زندہ ہول اچھا۔ وہ خالی برتن جن کے منھ کھلے تھے اور کنارے تڑے مڑے، ٹوٹے ہوئے، جیسے محبت کی پے در پے ضربوں سے کسی چھنال کے ہونٹ..... میں اخبار ہاتھ میں لئے وہاں سے بھی بھاگ نکلا۔

بس کا کیو خاصا لمبا تھا اور دفتر سے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ اس پر بھی کیو میں لگے بغیر چارہ نہ تھا۔ ڈر کے کارن وہ کیو مجھے ایک بہت بڑا اژدہا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں، ڈر اور اژدہے میں کیا فرق ہے؟ انسان کے من میں دو ہی تو چیزیں ہیں۔ ڈر اور امید۔ اندھیرا اور روشنی۔ اس لئے ڈر کی مورت ہمارے مذہبی پیشواؤں نے اژدہے کی بنائی ہے، جو منھ پھاڑے، بڑے بڑے دانت نکالے، اپنے چار پاؤں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہم پہ رینگ آتا ہے۔ کیونکہ ہم گنہگار ہیں۔ زندگی کے گناہ سے آلودہ اگر ہم اژدہے کے کھلے ہوئے منھ، اس کے بڑے بڑے دانتوں اور آگ برساتی ہوئی آنکھوں سے بچ بھی جائیں تو اس کی دم کی مار سے کہاں بچ سکتے ہیں جو کوریا سے لے کر چین، جاپان اور بیچ میں ہندوستان سے لے کر لنکا تک پھیلی ہوئی ہے! لیکن یہ کیو ایک عجیب اجگر تھا جو سرکتا ہی نہ تھا اور ہم جہاں کے تہاں کھڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا۔ حالات کی جادوگرنی نے انسان کو مکھی بنایا اور دیوار پہ لگا دیا۔ پھر کیو تھوڑا سا ہلا جیسے مرے ہوئے سانپ کی بھی دُم ایکا ایکی کسی بدنی اضطرار سے اپنے آپ ہل جاتی ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ ساکت ہو گیا، کیونکہ بس نہیں آئی تھی۔ ایسے میں اخبار کا وہ حصہ بہت کام میں آتا ہے جس میں کوئی سکینڈل چھپی ہوتی ہے اور ایک ادیب کی تحریر کے ساتھ تقریباً ننگی لڑکی کی تصویر۔ میں ان ننگی لڑکی میں اتنا غرق ہو گیا کہ کوئی ہوش ہی نہ رہا۔ جبھی سامنے سے آواز آئی۔

ٹمین کہاں ہے؟

ایں؟! — میں نے اخبار سے سر اٹھایا — ٹمین؟!

ہاں ہاں ۔ ٹین، کنستر، کنستر...
— کبھی مجھے پتہ چلا میں مٹی کے تیل والے کیو میں لگ گیا ہوں۔ شاید غنی کی بات میرے دماغ کے کسی کونے میں رہ گئی، جیسے کوئی مصرعہ شاعر کے دماغ میں رہ جاتا ہے۔ کبھی میرے ساتھ والے نے نہ معلوم مجھ سے کیوں پوچھا۔ "آپ شادی شدہ ہیں؟"۔ "جی ہاں، جی نہیں"۔... میں نے جواب دیا، میں مرت شدہ ہوں۔ اور پھر دکاندار سے کچھ ایسی ہی مہمل بکتے ہوئے میں وہاں سے بھاگا اور بس کے کیو میں جا لگا، جو تیل کی دوکان کے برابر ہی تھا۔

دفتر سے اور بھی دیر ہو جانے کی وجہ سے اب مجھ سے اخبار بھی نہ اُٹھایا جا رہا تھا۔ میں نے ایک نظر پھر اس کے آخری صفحے پر ڈالنے کی کوشش کی۔ میری حیرانی کی کوئی حد نہ رہی۔ جب میں نے دیکھا، انہی چند لمحوں کے بیچ کسی نے اس ننگی لڑکی کو کپڑے پہنا دئے ہیں اور تصویر کے ساتھ چھپی ہوئی ادبی تحریر فحش معلوم ہو رہی ہے۔

میری پریشانی، میری حیرانی تو تھمتی ہی نہیں۔ دفتر میں سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کہا بھی تو صرف اتنا سا۔ گجن سنگھ، آج تم پھر لیٹ آئے؟

ایسے ہی، اسرانی صاحب۔ میں نے لنگ سی عذر داری کرتے ہوئے کہا۔ بات یہ ہے آج میں غلطی سے غلط کیو میں لگ گیا۔ ہی! اور ساتھ ہی میں دل میں سوچ رہا تھا کہ دو بار نفی کا استعمال مثبت ہو جاتا ہے!

"ہو جاتا ہے"۔ اسرانی نے کہا۔ "کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے"۔

"کیا ایسا ہو جاتا ہے؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"یہی۔ زندگی میں آدمی کبھی غلط کیو میں بھی لگ جاتا ہے"۔... اور پھر اسرانی نے اپنے آپ کو کسی فائل میں ڈبو دیا۔ اور میں اپنے ٹیبل پہ لوٹ آیا۔ کسی بیوہ کا کیس تھا۔ جسے ڈھونڈنے کے لئے میں نے پرانے ریکارڈوں کی سب خاک اپنے سر پہ ڈال لی تھی۔ بات یہ تھی کہ لنک فائلیں نہیں مل رہی تھیں۔ بیوہ کے کئی دیور جیٹھ تھے۔ جو ہندوستان بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ایک لینینی ڈرن کی چھاؤنی میں ٹھیکہ دار تھا، دوسرا کٹک میں کہیں سرٹیک رہا تھا اور ایک تو ہانڈی میں تھا۔ پھر ایسے ہی کئی بہنیں تھیں، جن میں سے ایک نے تیسرا شوہر کر لیا تھا۔ اور تینوں میں سے دو دو، تین تین بچے تھے۔ شاید چار بھی ہوں۔

مجھے اپنا آپ ایک ہاتھی لگا جو پہلے تو سونڈ سے سب مٹی، سب کوڑا کرکٹ اپنے بدن پر پھینک لیتا ہے اور ارلف ارلف کرتا ہوا پانی میں چلا جاتا ہے اور پھر ویسے ہی سونڈ کی مدد سے پانی کے فوارے کو اپنے بدن پہ چھوڑنے لگتا ہے۔ بیوہ کی مدد تو میرے لئے گنگا اشنان سے بھی زیادہ تھی۔ چنانچہ میں نے سب لنک فائلیں جانے کہاں کہاں سے ڈھونڈ نکالیں۔ کیس کے باقی کوئر سیدھے کئے اور اس کا کلیم خود جا کر کمشنر صاحب سے پاس کروا دیا۔ لیکن وہ بیوہ۔ صرف میرا شکریہ ادا کر کے چلتی بنی۔ بیوہ جو ہمیشہ مجھے ایکسا ئیٹ کرتی ہے۔ جاتے ہوئے اُس نے ایک مسکراہٹ

بھی تو میرے پلّے نہ ڈالی۔ شاید وہ مسکرا ہی نہ سکتی تھی، کیونکہ اُس کے ہونٹوں کے اردگرد کی رگیں اور پٹھے ایک مسلسل مصیبت میں جامد ہو چکے تھے اور ہمارا ہر روپ محبت نے اُس کے لئے محبت کے سے حسین و جمیل جذبے کو ایک بے ایک بے معنی سی گردان بنا دیا تھا...

جبھی مجھے سپرنٹنڈنٹ اسرانی کی ہمدردی سمجھ میں آئی۔ اس نے ریز میری بجائے نندلال کو دے دیا تھا جو بہت چالو آدمی تھا۔ نندلال اوپر سے جو کچھ بھی کماتا تھا اس میں آسرانی کی بھی پتّی تھی۔ میرا لیٹ آنا تو صرف ایک بہانہ تھا۔ پھر نندلال نے اسرانی سے خاندانی تعلق پیدا کر رکھا تھا اور مہینے میں دو تین بار وہ اپنی بیوی کے ساتھ اسرانی کے کنوارے کوارٹر میں جاتا تھا۔

سیٹلمنٹ آفس اچھا خاصا کبوتر خانہ تھا۔ اس میں زیادہ تر تو سندھی اور پنجابی ہی کام کرتے تھے، لیکن اب کچھ مدراسیوں نے آنا شروع کر دیا تھا اور آپ جانتے ہیں کہ ایک بار دفتر میں مدراسی آ جائیں تو پھر پورا دفتر مدراسیوں سے بھر جاتا ہے۔ مگر یہ تو بنگالیوں کے بارے میں بھی کہا جا سکتا ہے اور مراٹھوں کے بارے میں بھی۔ اس سلسلے میں پنجابی بہت اچھا ہے وہ ایک بار کسی دفتر میں آ جائے تو مجال ہے جو کسی اور پنجابی کو پاس بھی پھٹکنے دے، چاہے وہ کتنا ہی قابل ہو... دفتر میں آزادانہ ایک دوسرے کی ماں بہن ہوتی تھی اور ہر قومیت قوم بننے کے کرب میں مبتلا تھی۔

وہ دن بہت گندہ تھا۔ یا شاید مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کیونکہ اسرانی نے میری ترقی کے سب راستے روک دئے تھے اور میری بیوی بدصورت اور بوڑھی ہو گئی تھی اور مجھے مسکراہٹوں کو سکّے میں ڈھالنے کا فن نہ آتا تھا۔ دفتر میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ ہندو مسلم فسادات سے کہیں زیادہ تھا، قتل سے زیادہ تھا اور خون سے بھی زیادہ۔ بعض وقت تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، کسی چیز کسی جذبے کی ضرورت سے زیادہ نفی کرنا ہی اُسے قبول کرنا ہے۔ ہندو جتنا زیادہ اس دنیا کو مایا سمجھتا ہے، اُتنا ہی وہ پیسے کا پجاری ہے۔ ہندوستان میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اُس نے دولت کو ایک دیوی، لکشمی دیوی نہ بنا دیا ہو اور ایک گندے اور بھونڈے طریقے سے اُس کی پوجا نہ کی ہو۔ وہ پوجا میں اس کی پوجا کرتا ہے۔ دیوالی میں پوجا۔ دسہرے میں اپنی کار پہ صدبرگ کے ہار ڈالتا ہے جو دُنیا کا کوئی بشر نہیں ڈالتا کیسے مورتی پوجا اور پیسے کی پوجا آپس میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ بہرحال اپنے دیس میں ایک نیا ضمیر جاگا ہے، ایک نئے انتا کرن نے انگڑائی لی ہے۔

اور پیسہ ہے کہ دن بدن میلا ہوتا جا رہا ہے۔ کبھی جو نیا چھپا ہوا نوٹ ہاتھ آتا ہے تو اپنا آپ کتنا ستھرا اور کتنا صاف معلوم ہوتا ہے۔ یا شاید میرا اپنا من گندہ ہے۔ جب بھی میرے ہاتھ میں میلا اور چُڑ مُڑ سا نوٹ آتا ہے تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے، اِسے دق کے مریض نے چھوا ہے، یہ رنڈی کے کوٹھے سے آیا ہے۔ لیکن جب حوصلہ کر کے اسے ہاتھ میں لیتا ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے، میرے ہاتھ میں روپیہ نہیں، چھ آٹھ آنے ہیں، جنھیں میں چار آنے میں نکال دینا چاہتا ہوں۔

وہ تنخواہ کا دن تھا اور مجھے 'ریز' کی اُمید تھی۔ اُمید کیا، میری باری تھی۔ لیکن ... میں پیسے ہاتھ میں لئے ہوئے نکلا تو مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے میں عورت ہوں اور ابھی ابھی میری آبروریزی ہوئی ہے۔ میں نے اپنی مرضی اپنی خوشی اور محبت سے اپنے بدن کو پیار کرنے والے کے حوالے نہیں کیا۔ بلکہ کسی نے زبردستی میری عزت لوٹی ہے۔ بدن کی بات چھوڑ یئے، رُوح تک مکھی کا کیا ہوا۔ شاعر کے لفظوں میں ہم لوگ کوچہ و بازار کا مال ہو گئے۔ جو بھی نگاہ ہم پہ اُٹھتی ہے، خریدار کی طرح سے اُٹھتی ہے، ... رونا دل سے اُٹھتا ہے، مگر آنسو کہیں گلے میں پھنس کے رہ جاتے ہیں۔ اِرد گرد کے سب لوگ رنڈیاں ہیں، جو اپنے اپنے دھندے کے سلسلے میں گاہکوں کو پھنسا رہے ہیں۔ آنکھ مار رہے ہیں اور بیچ بیچ میں اپنے بدن کے وہ حصّے دکھاتے ہیں، جن سے مرد کے دماغ میں ایک محشر بپا ہو جاتا ہے۔

دفتر سے لوٹنے پر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بازار — پکاسو نے بنایا ہے۔ آرٹ نہ ہوتے ہوئے بھی کتنا بڑا آرٹ ہے اس میں، ہوٹل میں سٹیشنری دکھائی دے رہی ہے اور کہیں فولاد کی لیتھ پر کوئی حسینہ الارپو ناچ رہی ہے۔ پرائمری رنگوں میں وصال کسی رابطے سے نہیں۔ وہ دھبے سے ہیں ایسے ہی ایک دوسرے سے دست و گریباں۔ اگر آپ نے نیل کو نارنجی میں حل ہوتے نہیں دیکھا تو چلئے میں دکھاتا ہوں۔ غالباً آپ نے بمبئی میں، سمندر کے بیچ، حاجی علی کی حسین مسجد پر ستالیار لسکٹوں کا بڑا سا نیون سائن نہیں دیکھا جس نے خدا کو بسکٹ بنا دیا۔ وکٹوریہ والے کی وہ گالی نہیں سنی جو ٹھمری کے ریکارڈ ہے 'جمنا کے تیر' پہ سپر امپوز ہو رہی ہے۔ میری قمیص پر یہ گلکاری کسی حسینہ کی کشیدہ کاری نہیں، پان کی پیک ہے، جو کسی نے چلتی بس پر سے مجھ پر پھینکی ہے سڑک پر کیلے کے چھلکے اور ردّی کا غذ دیوالے کی دستاویزیں بنے اُڑتے پھر رہے ہیں۔ اور یہ کتاب جو آپ میرے ہاتھ میں دیکھ رہے ہیں گرما گرم نسخہ ہے جو سڑک کے کنارے والی اسٹال کا مالک میرے ہاتھ میں تھما گیا ہے۔ اِسے پڑھیے اور پھر آجا یئے ٹیگور، ٹالسٹائی اور چیخوف ....

اپنے جسمانی اور ذہنی افلاس کی وجہ سے میں بہت سی اِدھر اُدھر کی چیزیں خریدتا ہوں۔ میں پیسہ رکھ ہی نہیں سکتا نا۔ پیسہ وہی رکھتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو۔ اب میں لٹل ہٹ میں جاؤں گا اور ریتا کا ناچ دیکھوں گا، جو اپنے بدن پہ انجیر کا پتہّ، صرف انجیر کا پتہّ لٹکائے پھرتی ہے۔ ایک گلابی تاگے سے جو بدن کا ہم رنگ ہونے کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتا۔ نہیں نہیں، میں وہاں نہیں جاؤں گا۔ خفتی ناراض ہوگی۔ جب مجھے کیا پتہ تھا، وہ پھر بھی ناراض ہو جائیگی۔ اور پورے دیس کا الزام خود پہ لیتی ہوئی گاؤں جا کر اپنے بھائی کے پاس بیٹھ جائے گی اور پھر کبھی نہیں آئیگی۔ اور میں اپنی خفت کو چھپانے کے لئے سب سے کہتا پھرونگا، میں نے خفتی کو نکال دیا۔ بہت بک بک کرنے لگی تھی وہ ...

میں گھر تک پیدل جانے کی سوچتا ہوں۔ ایسے ہی اپنے آپ کو اذیّت دینے کے لیئے۔ جیسے لوگ اپنے چاروں طرف آگ جلا کر بیچ میں تپ کرنے بیٹھ جاتا؟ یا اپنے آپ کو زندہ درگور کر لیتا! خود کو اذیت دینے سے کون سا

کام ہے جو ہمارے ملک میں نہیں ہو سکتا۔ آپ آج سے کھانا چھوڑ دیجیے۔ دیکھیے کیسے گوسیتیا بند نہیں ہوتی ؟ ایک صوبے کے دو یا دو کا ایک نہیں بن جاتا۔ ؟ سرکش طالب علم بکری بنکر اپنے کلاس روم میں نہیں لوٹ جاتے ؟ چنانچہ اسی تپسیا کے عمل میں اپنے وجود سے نکلنے والی برقیات کی مدد سے، بھارت کا بھوشیہ سنوارتے ہوئے میں چلتا گیا۔ جبھی گرے رنگ کی مرسی ڈیز کار کا مجھے دھکا لگا اور میں بجلی کے ایک کھمبے سے جا ٹکرایا۔ اب برقی رویئں میرے بدن سے نکلنے کی بجائے اُلٹا میرے بدن میں گھس رہی تھیں۔ ہندوستان کا مستقبل ستیاناس ہو رہا تھا۔ میں فٹ پاتھ پہ جاگرا تھا، جو کہ میری اصلی جگہ تھی۔ خون نکلا تھا مگر تھوڑا سا۔ وہ زیادہ نکلنا چاہیئے تھا۔ فصد کچھ اور بھی کھلنا چاہیئے تھی۔ ہاں میری اذیت پسندی یہی چاہ رہی تھی اور اسی میں ملک اور قوم کا بھلا تھا۔ اس لئے میں تو نہ چاہتا تھا کہ کار کے مالک کو کچھ بھی کہا جائے لیکن لوگوں نے اُسے پکڑ لیا اور مارنے لگے۔ اب جو بھی آتا تھا اُسے ایک لگا کے چل دیتا تھا۔ یہ کوئی نہ پوچھ رہا تھا، قصور کس کا ہے ؟ حالانکہ قصور میرا تھا۔ سراسر میرا، جس نے اپنی اصلی جگہ کو چھوڑ کر سڑک پر چلنا شروع کر دیا تھا۔ لیکن لوگ ۔ جانے کہاں کی مار کہاں نکال رہے تھے ؟ وہ اندر سے کتنے ممنون نظر آ رہے تھے کہ میں نے انھیں ایک موقع دیا۔ وہ ہی نہیں، ایک طرف سے کوئی ٹوٹا پھوٹا بوڑھا پارسی چلا آیا، جس کے بدن میں رعشہ تھا۔ اُس نے بھی ایک ہاتھ سے اپنا دوسرا ہاتھ پکڑا اور اُس غریب امیر کے جڑ دیا۔ وہ مار رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ بہت، تمے آئیں شوں کریو ؟ ... بہت، تمے آئیں شوں کریو ؟ ...
جانے یہ کیسی نامردی تھی، جس کا وہ بدلہ لے رہا تھا ...

جبھی میری نظر کار کے مالک پر پڑی اور اپنے ماتھے پر سے خون پونچھتے ہوئے میں لپک کر کھڑا ہو گیا اور چلّانے لگا ... چھوڑ دو، چھوڑ دو، اسے ...

اب اس کے خون بہہ رہا تھا۔ غالباً اتنا ہی جتنا میرا بہا۔ بے شک کوئی تول کے دیکھ لیتا۔ سر پر سے خون بہنے سے اس کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں، جنھیں پونچھتے، کھوستے ہوئے اُس نے میری طرف اور میں نے اس کی طرف دیکھا۔

شانتی .... میں نے پکارا۔

شانتی لال نے کانپتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بولا۔ گجن ! مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ۔ اور پھر دہشت کے عالم میں وہ مجھ سے لپٹ گیا۔

لوگ حیران ہو رہے تھے۔ اور جو حیران نہیں تھے، مجھے ماں بہن کی گالیاں دینے لگے ...

تم کہاں، شانتی .... یہ کار ؟ ـــ

ہاں یار .... وہ ابھی تک ہانپ رہا تھا ...

یہ کس کی کار ہے ؟

میری

تم ؟...

میں سوچ رہا تھا، یہ آدمی جس نے میرے ساتھ فاقے کئے ہیں اور اندھیرے روڈ کے ایک گندے سے ہوٹل میں میرے ساتھ رہا ہے، کار کا مالک کیسے ہوگیا؟ لیکن جلد ہی بات میری سمجھ میں آگئی۔ وہ مرکز میں کسی ڈپٹی منسٹر کا بھانجا تھا۔

شانتی نے بہت منت کی کہ میں اس کی کار میں چلا آؤں لیکن میں نے صاف انکار کردیا۔ اسکی وجہ؟ ۔ یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں۔ شاید شانتی ڈر رہا تھا کہ میں پولیس میں رپورٹ کردوں گا۔ لیکن میں نے اسے یقین دلایا کہ میں ایسا نہیں کرسکتا۔ اس نے جیب سے دس روپے نکال کر پولیس کے دو کانسٹبلوں کو دیدیئے اور مجھے ٹاٹا کہہ کر چل دیا۔ قاعدے سے مجھے چاہیئے تھا، وہاں جاتا اور اینٹی ٹیٹانس انجکشن لیتا۔ لیکن میں تو چاہتا تھا، مجھے ٹیٹانس ہوجائے۔ خود کو بچانے کا جو فطری جذبہ انسان میں ہوتا ہے، میں اور میری قبیل کے ہندوستانی اس سے بہت آگے نکل چکے تھے..

سڑک پہ چوہے جا رہے تھے اور چھچھوندریں۔ کسی چوہے نے سوٹ پہن رکھا تھا اور چھچھوندر کا شٹا لگائے گھوم رہی تھی۔ ان میں سے کسی کے چہرے پہ رونق نہ تھی۔ کہیں خون کے آثار نہ تھے... اور میں سوچ رہا تھا، جب بمبئی میں پانی ختم ہوجائے گا تو یہ سب کیسے بھاگیں گے، ایک دوسرے پہ گرتے پڑتے، نوچتے، کاٹتے... چوہے!

جبھی میں بیریل کے علاقے میں جا پہنچا۔

بیس پچیس آدمی سر گرائے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک سست سی رفتار سے۔ ان کے چہروں پہ ماتم تھا۔ ضرور ان غریبوں کا کوئی مر گیا تھا۔ اور یہ اس ماتمی جلوس کا حصہ تھے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے کوئی ارتھی، کوئی جنازہ دکھائی نہ دیا۔ تھوڑا آگے، اُن سے کچھ ہی فاصلے پر تئیس چوبیس پچیس[25] آدمی اور بھی دکھائی دیئے جو ویسے ہی سر جھکائے ہوئے جا رہے تھے۔ ضرور وہ ان پہلے آدمیوں کا حصہ ہوں گے۔ ضرور ان کا کوئی بہت ہی محبوب بہت ہی چہیتا مر گیا ہوگا، ورنہ سوائے لیڈر کے ایک عام آدمی کے جنازے کے ساتھ بمبئی میں اتنے لوگ کہاں جمع ہوتے ہیں؟...

میں نے گھوم کر دیکھا، لیکن مجھے پھر کوئی جنازہ دکھائی نہ دیا۔

ہمت کرکے میں نے اُن میں سے ایک سے پوچھا... آپ لوگ... جنازہ کہاں ہے؟

جنازہ؟ اُس نے حیرانی سے کہا۔

ہاں ہاں۔ جنازہ، ارتھی!... کوئی مر گیا ہے نا؟

نہیں... اُس نے ہر قسم کے جذبے سے عاری بے رنگ سا چہرہ اوپر اٹھاتے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

... ہم لوگ مجور ہوتا.. مل سے آیا نا، کیا؟

میں اُسی طرف جا رہا تھا، لیکن معلوم ہوتا تھا، انہی لوگوں کے ساتھ جا رہا ہوں، جن کا جنازہ بھی غائب ہے....

خواجہ احمد عباس

ٹیری لین کی پتلون

شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑا ہوا صاحب اپنی نیلی کانچ کی آنکھوں سے منگو کو گھور رہا تھا۔
شیشے کی دیوار کے سامنے کھڑا ہوا منگو اپنی چمکیلی کالی آنکھوں سے صاحب کو گھور رہا تھا۔

صاحب کے سر پر سلیٹی رنگ کا "ٹوپ" تھا۔ (اور دل ہی دل میں منگو نے اپنے آپ کو ٹوکا: "ٹوپ"، نہیں "ہیٹ"، "ٹوپ تو گنوار بولتے ہیں") صاحب کے بدن پر چھوٹے چھوٹے چارخانوں کا کوٹ تھا۔ کوٹ کے کالر میں سے سفید قمیض اور کالی اور لال دھاریوں دار ٹائی جھانک رہی تھی۔ صاحب کی ٹانگیں نیلے رنگ کی پتلون میں تھیں۔ پتلون صاحب کے کولھوں پر کسی ہوئی تھی۔ اور نیچے کالے شیشے کی طرح چمکتے ہوئے جوتوں تک آتے آتے گائے کی دم کی طرح پتلی ہو گئی تھی۔ پتلون کا کپڑا بڑا چکسلا تھا۔ ملائم بھی ضرور ہوگا، منگو نے کانچ کی دیوار کو ناک لگاتے ہوئے سوچا۔

صاحب سے منگو کی کئی مہینے پرانی دوستی تھی۔ ہر روز منگو صاحب کو دیکھنے آتا تھا۔ مگر ان کے درمیان یہ کمبخت کانچ کی دیوار کھڑی تھی۔ جو ان کو ملنے نہیں دیتی تھی۔ صاحب شیشے کی دیوار کے اندر قید تھا۔ صاحب درزی کی دکان کے باہر نہیں آسکتا تھا۔ منگو درزی کی دکان کے اندر نہیں جاسکتا تھا۔ صاحب کے کاٹھ کے بدن میں جان نہیں تھی۔ منگو کے بدن میں جان تو تھی مگر اس کی جیب میں دام نہیں تھے۔ سو دونوں مجبور تھے۔

منگو نے شیشے کی دیوار کے باہر سے ہی صاحب کے قد کو ناپ کر سوچا۔ ہم دونوں برابر ہی ہونگے۔ صاحب کے کپڑے میرے بدن پر بھی فٹ آسکتے ہیں۔ "فٹ"! منگو نے سوچا، یہ چھوٹا سا انگریزی کا لفظ بولنے ہی میں نہیں سوچنے میں بھی کتنا اچھا لگتا ہے "فٹ"! جیسے بٹن دبا کر لگانے کی آواز "پچ"۔ جیسے اس کے پلاسٹک کے تھیلے میں لگے ہوئے زپ کو کھینچنے کی آواز۔ "زپ"! ویسے ہی "فٹ"! جیسے صاحب کی ٹانگوں سے چپکی ہوئی پتلون ——— فٹ! جیسے صاحب کی چھاتی اور کمر پر منڈھا ہوا کوٹ ——— فٹ! جیسے صاحب کے سر پر بیٹھا ہوا ہیٹ ——— فٹ!

وہ صاحب کو سر سے لے کر پیر تک ——— ہیٹ سے لے کر جوتوں تک ——— روز دیکھتا تھا۔ مگر اس کی نظر بار بار چمکیلے نیلے رنگ کی پتلون کی دہری پر جاتی تھی۔ جہاں کاغذ کی ایک پرچی لگی تھی جس پر انگریزی میں لکھا تھا "ٹیری لین کی پتلون۔ اسّی روپے"۔ اور جب وہ اس اسّی روپے والی ٹیری لین کی پتلون کا مقابلہ اپنی ٹانگوں پہ جھولتی

جو نئی میلی ڈھیلی ڈھالی خاکی ڈبل زین کی پتلون سے کرتا تھا (جو اس نے کئی مہینے ہوئے بارہ روپے میں "ریڈی میڈ" خریدی تھی۔ اور جو اس کے بدن پر بالکل "فٹ" نہیں تھی!) تو منگو کو ایسا لگتا تھا جیسے اس کی بیس سالہ زندگی کی ساری دوڑ دھوپ اسی ڈیری لین کی پتلون کو حاصل کرنے کے لیے کی تھی۔

منگو ہریانے کے ایک چھوٹے سے قصبے دھنک میں پیدا ہوا تھا۔ اس کو اپنا بچپن بہت کم یاد تھا۔ اس کی ماں تو منگو کے پیدا ہونے کے سال بھر بعد ہی مر گئی تھی لیکن اس کو تو یہ بھی یاد نہیں تھا کہ بچپن میں وہ کوئی کھیل بھی کھیلتا تھا یا نہیں یا اس کے بچپن کے ساتھ اور دوست کون تھے۔ شاید کوئی تھے ہی نہیں۔ لیکن اس کو اتنا ضرور یاد تھا کہ وہ کوئی پانچ برس کا تھا جب اس کے باپ نے اسے محلے کے میونسپل پرائمری اسکول میں داخل کرا دیا تھا۔ داخلہ آسانی سے نہیں ہوا تھا کئی بار اسے صبح سویرے اٹھ کر، منہ ہاتھ دھو کر گھر کی دھلی ہوئی دھوتی (جو اس کے باپ کی پرانی دھوتی میں سے پھاڑ کر بنائی گئی تھی) اور قمیض پہن کر پہلی پستک اور سلیٹ کو بغل میں دبا کر باپ کے ساتھ اسکول جانا پڑا تھا۔ تب جا کر ماسٹر جی نے رجسٹر میں اس کا نام لکھا تھا۔ مگر اگلے دن جب وہ اکیلا اسکول پہونچا تو اسکول کے چپراسی نے برآمدے میں پڑی ہوئی ایک پھٹی ہوئی چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "یہاں بیٹھ جا۔" اور منگو کی سمجھ میں نہیں آیا کہ جب دوسرے بچے اندر بنچوں اور ڈسکوں پر بیٹھے ہیں تو اس کو باہر برآمدے میں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ اور سو ساری کلاس کے ساتھ وہ بھی "ا، آ، ای، ای، او، او" "دو دونی چار، دو تیا چھ" چلا چلا کر یاد کرتا رہتا تھا۔ مگر اس کے چھوٹے سے سر میں ایک سوال شہد کی مکھی کی طرح بھن بھن کرتا رہتا۔ اور سب لڑکے اندر کمرے میں بنچوں پر بیٹھتے ہیں تو صرف مجھے ہی کیوں برآمدے میں گندی پھٹی چٹائی پر بیٹھنا پڑتا ہے؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ سوال کی زہریلی مکھی بھن بھناتی رہتی کبھی کبھی ڈنک بھی مارتی۔ مگر نہ جانے کیوں اسے یہ سوال زبان تک لاتے ہوئے ایسا عجیب ڈر لگتا تھا جیسا رات کے اندھیرے میں پرانے پیپل کے کھڑکھڑاتے ہوئے سائے میں بھوت سے ڈر لگتا ہے۔

پھر ایک دن کیا ہوا کہ اس کے باپ نے اسے معمول سے بھی سویرے سے جگا دیا۔ اور جب وہ اسکول پہونچا تو اس نے دیکھا ابھی ایک بھی بچہ نہیں آیا۔ تینوں کمرے اور ان کے سامنے کا برآمدہ خالی پڑے تھے۔ اس کی کلاس کے کمرے کے دروازے کھلے تھے۔ اندر بنچ اور ڈسک لائنوں میں لگے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا ایک بار جہاں اور لڑکے بیٹھتے ہیں وہاں بیٹھ کر تو دیکھوں ادھر ادھر دیکھ کر وہ دبے پاؤں کمرے کے اندر گیا۔ اور سب سے پچھلی لائن میں ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔ سامنے ڈسک رکھا ہوا تھا جس میں روشنائی بھری دواتیں لگی ہوئی تھیں۔ منگو نے ڈسک پر اپنی کتابیں اور تختی، سلیٹ، قلم، پنسلیں جا دیں۔ بنچ کے پیچھے لگی ہوئی لکڑی پر کمر ٹکا کر، بغلوں میں ہاتھ دبا کر بڑی شان سے بیٹھ گیا۔ اس نے سوچا "اگر ہر روز میں یہاں بیٹھ جاؤں تو کیا ہرج ہے؟"

اور شاید اس ان کہے سوال کے جواب میں چپراسی رام دین سر پر اپنا خاکی صافہ باندھتے ہوئے باہر کے دروازے سے کمرے میں داخل ہوا۔ اور منگو کو بنچ پر بیٹھا دیکھ کر چلا پڑا "ابے او تجھے یہاں بیٹھنے کو کس نے کہا ہے؟ اپنے ساتھ مجھے بھی پٹوائے گا۔"

عام طور سے رام دین منگو سے بڑی مہربانی سے پیش آتا تھا۔ ماسٹر جی کی طرح اس کے ہاتھوں پر قمچیاں نہیں مارتا تھا۔

سو منگو ڈر کے مارے ایک دم کھڑا نہیں ہو گیا۔ وہیں بیٹھا بیٹھا بولا " کاکا رام دین، میں یہاں کیوں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے چٹائی پر کیوں بیٹھنا پڑتا ہے؟ "

" اس لئے کہ تو اچھوت ہے "۔ رام دین نے جواب دیا۔ منگو کو " اچھوت " کے معنے نہیں معلوم تھے۔ مگر اسے یہ لفظ سنتے ہی اپنے آپ میں سے ایسی گھناؤنی بو آئی کہ وہ ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا اور جلدی جلدی اپنی کتابیں سمیٹ کر برآمدے میں جا بیٹھا مگر اس جلدی میں اس کی دھوتی کا سرا ڈسک میں لگی ایک کیل میں اٹک گیا۔ چرر سی آواز آئی اور منگو کی بائیں ٹانگ گھٹنے تک ننگی ہو گئی۔ پھٹی ہوئی دھوتی کو سنبھالتے ہوئے ابھی اس نے التی پالتی مار کر سامنے کتابیں رکھی ہی تھیں کہ رام دین نے اسکول کی گھنٹی بجائی شروع کی اور لڑکوں کی ٹولیاں بھاگ بھاگ کر اسکول میں آنے لگیں۔

لڑکے چھ کا پہاڑا یاد کرتے رہے " چھ اکن چھ۔ چھ دونی بارہ۔ چھ تیا اٹھارہ " مگر منگو کے دماغ میں زہریلی شہد کی مکھی بھن بھناتی رہی۔ " اچھوت۔ اچھوت۔ اچھوت۔ اچھوت! "

لڑکے چلاتے رہے " آج آم لا۔ کل کام پر جا۔ سچ بول۔ کم نہ تول۔ وہ تیرا بھائی ہے۔ تو اس کا بھائی ہے " مگر منگو کے کانوں میں سنائی دیتا رہا " تو بنچ پر نہ بیٹھ۔ تو اچھوت ہے۔ گندی چٹائی پر بیٹھ۔ تو اچھوت ہے۔ تو کسی کا بھائی نہیں ہے تو اچھوت ہے۔ "

ماسٹر جی پوچھتے رہے " ہاں تو بچو بتاؤ ریل کیا ہوتی ہے؟ سگریٹ کیا ہوتا ہے۔ ڈاکو کیا ہوتا ہے۔ "

اور منگو سنتا " ہاں تو بچو بتاؤ۔ اچھوت کیا ہوتا ہے؟ اچھوت کیا ہوتا ہے؟ اچھوت کیا ہوتا ہے؟ "

اور پھر ایک دم ماسٹر جی کی قمچی کی مار اس کی کمر پر پڑی۔ " ابے منگو جواب نہیں دیتا۔ کیا سور ہا ہے؟ چل کھڑا ہو جا۔ "

منگو گھبرا کر کھڑا ہوا تو دھوتی کا پھٹا ہوا پلو نیچے گر پڑا۔ اور اس کی بائیں ٹانگ گھٹنے تک سب کے سامنے ننگی ہو گئی۔ سب بچے کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ ایک اور قمچی کی مار منگو کی کمر پر پڑی اور اسے لگا جیسے ایک لمبی ڈنک والی بھڑ نے ایک دم سے کاٹ لیا ہو۔ ماسٹر جی نے چلا کر کہا۔ " پھر کبھی پھٹی دھوتی پہن کر آیا تو تجھے اسکول سے نکال دوں گا۔ "

سکول ختم ہونے کی گھنٹی بجی اور سب بچے ہنستے شور مچاتے باہر بھاگے تو منگو نے انہیں غور سے دیکھا۔ ان میں سے ہر ایک قمیض اور نیکر پہنے ہوئے تھا۔ کوئی خاکی نیکر کوئی نیلی نیکر۔ کسی کے پیروں میں موزے اور بوٹ تھے کسی کے پیروں میں چپل۔ مگر ننگے پاؤں کوئی نہیں تھا۔

سکول سے گھر جاتے ہوئے منگو نے سوچا " اچھوت وہ ہوتا ہے جو نیکر کے بجائے پھٹی ہوئی دھوتی پہنتا ہے اور ننگے پاؤں سکول جاتا ہے اس نے گھر پہنچتے ہی باپ سے کہا " بابا مجھے نیکر سلوا دو اور چپل دلوا دو۔ میں ننگے پاؤں اسکول نہیں جاؤں گا۔ "

تین دن کے بعد دو چھٹیوں کو جو مر کر تاسیلی کے عذر کی نیکر پہن کر سویرے سویرے سکول پہنچا اور رام دین سے پوچھا۔ " کاکا اب تو میں اندر بیٹھ سکتا ہوں نا! " اور رام دین نے چٹائی کی طرف اشارہ کر کے کہا " اپنی خیریت چاہتا ہے تو بیٹھ

جا اپنی جگہ بیٹھ کر بھی کرتی تو ہے تو اچھوت۔"

اس دن اس نے باپ سے پوچھا "بابا اچھوت کیا ہوتا ہے؟" باپ نے جو اس وقت سڑک پر جھاڑو دے کر آیا تھا جھاڑو کو کری پھینک کر جواب دیا۔ "اچھوت وہ ہوتا ہے جسے کوئی اونچی جات والا چھو نہیں سکتا۔"

"مگر کیوں نہیں چھو سکتا؟ ہم میں کوئی گندگی ہے کیا؟"

"ہاں بیٹا۔ لگی تو ہے۔ ہم لوگ کوڑا کرکٹ جو اٹھاتے ہیں۔ ٹٹی صاف کرتے ہیں۔ گندی نالیاں دھوتے ہیں سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہیں۔ اس لئے ہم اچھوت ہیں۔"

منگو نے اپنا فیصلہ سنا دیا "تو پھر میں تو یہ گندا کام نہیں کروں گا۔"

اور باپ نے حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا "تو نہیں کرے گا تو اور کریں گے۔ یہ کام تو کسی نہ کسی کو کرنا ہی ہے۔ اگر ہم یہ کام نہ کریں تو سڑکوں پر کوڑے کے ڈھیر لگ جائیں۔ ہر گھر میں ٹٹی اکٹھی ہو کر سڑاند آنے لگے۔ بیماریاں پھیل جائیں۔"

اس کا جواب منگو کے پاس نہیں تھا۔ مگر اس نے پھر کہا "میں تو کوئی اور کام کروں گا۔"

"تب ہی تو تجھے اسکول میں بھرتی کرایا ہے۔ چار جماعت پڑھ لے گا تو تجھے دلی بھیج دوں گا۔ وہاں کچھ نہیں تو چپراسی کی نوکری مل جائے گی۔"

اور منگو نے کہا "چپراسی نہیں میں بابو بنوں گا بابو۔"

منگو نے چار جماعتیں تو پڑھ لیں۔ مڈل اسکول میں بھی داخل ہو گیا۔ یہاں اس کو برآمدے میں چٹائی پر بیٹھنا نہیں پڑتا تھا۔ کلاس روم میں ہی بنچ اور ڈسک پر دوسرے لڑکوں کے ساتھ بیٹھتا تھا۔ منگو کو اس کے باپ نے بتایا تھا کہ دیش آزاد ہو گیا ہے اور مہاتما گاندھی جی مرنے سے پہلے سب کو کہہ گئے ہیں کہ اچھوتوں کو اچھوت نہ کہیں "ہریجن" کہیں اور ان سے چھوت چھات نہ برتیں۔ سرکار نے ایک نیا قانون بھی بنا دیا تھا کہ چھوت چھات بند ہو جائے۔ پر یہ قانون اسکول تک تو پہونچا تھا مگر ان کی بستی کے پاس جو اونچی جات والوں کا محلہ تھا اس کے کنوئیں تک نہیں پہونچا تھا۔ "اچھوت" "ہریجن" ہو گئے تھے۔ مگر اس کنوئیں سے پانی نہیں بھر سکتے تھے۔ مڈل اسکول میں بھی دو چار دن تو منگو بہت خوش رہا کہ اب وہ بھی کرسی میز پر بیٹھ کر پڑھ سکتا ہے۔ لیکن چند روز کے بعد اسے عجیب سا لگا کہ ان کے کمرے میں دو دو لڑکے ایک ایک ڈسک پر بیٹھتے ہیں لیکن منگو کے برابر والی جگہ ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اور برابر والے ڈسک پر دو کے بجائے تین لڑکے پھنس پھنسا کر بیٹھتے ہیں۔

منگو نے مڈل پاس کیا تو باپ نے سکول سے اٹھا لیا۔ ابھی وہ دلی جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ اس کا باپ ہیضے میں مر گیا۔ یتیم منگو کو اس کے رشتے دار میونسپلٹی میں بھنگی کی نوکری دلوانے کی سوچ رہے تھے کہ ان کی بستی کا ایک آدمی ادو بمبئی سے واپس آیا۔ وہ وہاں کسی مل میں کام کرتا تھا۔ ایک دن منگو کو وہ راستے میں مل گیا تو اس نے پوچھا "کیوں منگو بمبئی چلے گا؟"

سندر لدو نے اس کو بتایا کہ بمبئی میں وہ رگھو رام کہلاتا ہے۔ ایک مل میں کام کرتا ہے جس چال میں وہ رہتا ہے وہاں

ہر کوٹھری میں (جسے بمبئی کی بھاشا میں "کھولی" کہتے ہیں) بھانت بھانت جاتی کے لوگ رہتے ہیں۔ کسی میں برہمن تو کسی میں شتری تو کسی میں مسلمان تو کسی میں کرسچان۔ پارسی، سکھ، مدراسی، بنگالی اور تو اور رلدو عرف ریا رام بھی وہیں رہتا ہے اور کسی نے آج تک اس سے یہ نہیں پوچھا کہ تو چھوت ہے یا اچھوت۔ منگو بمبئی میں سب لوگ رات دن کام میں جٹے رہتے ہیں۔ کسی کو ٹائم ہی نہیں ہے ایسے سوال جواب کرنے کا۔"

پھر منگو نے پوچھا، "مگر کھانے پینے میں تو چھوت چھات ضرور ہوتی ہوگی۔"

اور رلدو نے کہا۔ "ارے بمبئی کے ایرانی ہوٹلوں میں سب دھرم اور جات کے لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ کوئی نہیں پوچھتا کیا دھرم ہے۔ کون جات ہو۔ بڑے شہر میں یہی تو مزا ہے۔ یہ چھوت چھات تو قصبوں دیہاتوں میں رہ گئی ہے۔"

رلدو واپس بمبئی گیا تو منگو بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔

پہلی بار وہ ریل میں بیٹھا تو اس کو ایسا لگا جیسے ریل نہیں چل رہی ساری دنیا پیچھے کو بھاگ رہی ہے۔ رہتک کا شہر وہاں کے مکان، ہریجنوں کی بستی کی جھونپڑیاں، کنواں جہاں منگو کے بھائی بند پانی نہیں بھر سکتے۔ مڈل اسکول، پرائمری اسکول۔ منگو نے سوچا۔ میری ساری پرانی زندگی پیچھے کو جا رہی ہے۔ صرف میں آگے جا رہا ہوں۔ آگے جہاں بمبئی نگر ہے۔ وہ شہر جہاں عمارتیں آسمان سے باتیں کرتی ہیں، جہاں رلدو ریا رام کہلاتا ہے۔ اور جہاں پہونچ کر منگو منگت سنگھ ہو جائے گا۔ "کوئی میری ذات بھی پوچھے گا تو کہہ دوں گا راجپوت ہوں"، اس نے سوچ رکھا تھا۔

اس ریل کے سفر نے نہ صرف منگو کو رہتک سے بمبئی پہونچا دیا بلکہ اس کی سمجھ بوجھ کو بھی کہیں سے کہیں پہونچا دیا۔

ریل سے زیادہ اہم منگو کو ریل کا پاخانہ لگا جہاں ایک زنجیر کو کھینچنے سے ہر قسم کی گندگی کو بہا دیا جاتا ہے۔ منگو کو ایسا محسوس ہوا کہ اس زنجیر کے ساتھ اس کا اور اس جیسے کروڑوں ہریجنوں کا مستقبل بندھا ہوا ہے۔ اپنے باپ کی بات یاد کر کے اس نے سوچا۔ آج بابا مجھ سے پوچھتے اگر ہم یہ نہیں کریں گے تو صفائی کا کام کون کرے گا؟ تو میں جواب دیتا۔ ایک پانی کی ٹنکی اور ایک لوہے کی زنجیر یہ کام کریگی اور ہمیں ہمیشہ کے لئے چھوت چھات سے آزاد کردیگی۔

بمبئی پہونچ کر رلدو نے کہا۔ "منگو پہلا کام یہ کر کہ دو چار شرٹ پینٹ خریدلے۔ کرافورڈ مارکیٹ میں سلے سلائے کپڑے بکتے ہیں۔" اگلے دن ہی منگو نے دو ریڈی میڈ قمیصیں خریدیں اور دو پتلونیں۔ ڈبل زین کی۔ ایک خاکی ایک نیلی۔ پہلے دن ہی اسے ایسے لگا جیسے وہ ایک دم صاحب لوگ جیسا ہو گیا۔ رلدو کا ایک جان پہچان والا ایک صابن بنانے والی کمپنی کے دفتر میں کام کرتا تھا۔ وہاں منگت سنگھ (یعنی منگو) کو چپراسی کی نوکری بھی مل گئی۔

منگو کو ایسا لگا کہ ایک شرٹ اور ایک پتلون نے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی۔ اب وہ ایرانی ہوٹل میں چائے پیتا۔ ایک مدراسی برہمن ہوٹل میں کھانا کھاتا۔ چوپاٹی پر راجستھانی چاٹ والوں سے چاٹ لے کر کھاتا۔ بوتل کو منہ لگا کر کوکاکولا پیتا۔ اور کوئی اس سے یہ نہ پوچھتا کیوں بے تو اچھوت تو نہیں ہے؟

پھر جیسے جیسے اس دفتر میں دن گذرنے لگے اس کو آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ شرٹ شرٹ میں اور پتلون پتلون میں بہت فرق ہوتا ہے۔ ایک اس کی ڈھیلی ڈھالی میلی ملگجی پتلون تھی جو ہفتے میں ایک بار دھلتی تھی۔ جس کی استری ایک دن کے بعد غائب ہو جاتی تھی۔ دوسری منیجر صاحب کی پتلون تھی جس کی استری اتنی نکیلی ہوتی تھی جیسے تلوار کی دھار، ایک رئیس بابو کی پتلون تھی جو نئے فیشن کے مطابق بندوق کے کندے کی طرح سڈول اور گاؤدم تھی یہاں تک کہ جوتے تک پہونچتے پہونچتے چوڑی دار پاجامے کی طرح پتلی اور تنگ ہو جاتی تھی۔ اور تو اور ایک چندر اسٹینو گرافر کی پتلون تھی جو چمکیلے اور ملائم کپڑے کی تھی اور ہمیشہ ایسی لگتی تھی جیسے ابھی لانڈری سے ڈرائی کلین ہو کر آئی ہو۔

ایک دن منگو نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا۔ تمہاری پتلون کی استری اتنے دنوں تک اتنی کڑک کیسے رہتی ہے؟ اور چندر نے بتایا کہ ایک نیا کپڑا ایجاد ہوا ہے جسے ٹیری لین کہتے ہیں۔ جسے گھر میں دھو سکتے ہیں۔ لانڈری بھیجنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور جس کی پتلون بغیر استری کئے بھی ایسی لگتی ہے جیسے ابھی دھوبی نے استری کر کے دی ہو اور پھر اپنے دفتر سے چرچ گیٹ ریلوے اسٹیشن تک پیدل جاتے ہوئے منگو حسب معمول راستے کی دکانوں میں سجے ہوئے سامان کو دیکھتا ہوا جا رہا تھا کہ اس کی ملاقات - صاحب سے ہو گئی۔ اور اس کو معلوم ہوا کہ ٹیری لین کی پتلون اسی روپے میں مل سکتی ہے۔

اس وقت تک منگو نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی تھی۔ لیکن اس نے سنا تھا کہ جب کسی کو کسی سے محبت ہوتی ہے تو سوتے جاگتے ہر وقت اسی کے بارے میں سوچتا ہے۔ تو پھر ضرور اسے ٹیری لین کی پتلون سے محبت ہی ہو گئی ہو گی ورنہ یہ کیا کہ رات کو سوتے ہوئے خواب میں بھی اسے وہی دکھائی دیتی۔ کبھی وہ دیکھتا کہ ایک لق و دق میدان ہے۔ جہاں ٹیری لین کی پتلون بن دھڑ کے آدمی کی طرح بھاگی چلی جا رہی ہے اور وہ اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ کبھی وہ پتلون ایک نیلے پروں والے پرندے کی طرح پھڑپھڑاتی ہوئی ہوا میں اڑ جاتی اور منگو اسے حسرت سے دیکھتا ہی رہ جاتا۔ کبھی پتلون ایک نخریلی لڑکی کی طرح منگو کو اپنی طرف بلاتی مگر جب وہ اس کے پاس جا کر اسے چھونے کی کوشش کرتا تو وہ ایک جنگلی ہرن کی طرح چھلانگیں لگاتی ہوئی دور بھاگ جاتی۔ اور سپنے کے زمین آسمان منگو پر ہنسنے لگتے۔ اور پھر اس کی آنکھ کھل جاتی۔ اور وہ لیٹا سوچتا رہتا کہ کہیں وہ پتلون بک تو نہیں گئی۔ اور سو وقت سے بھی پہلے ہی وہ دفتر کے لئے روانہ ہو جاتا مگر جب وہ درزی کی دوکان کے سامنے پہونچتا تو وہ دیکھتا کہ صاحب وہاں اسی طرح کھڑا اپنی کانچ کی نیلی نیلی آنکھوں سے اسے دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔ اس کے سر پر وہی ہیٹ ہے۔ اس کے بدن پر وہی چار خانے کا کوٹ اور وہی نیلی چمکیلی ٹیری لین کی پتلون ہے۔ اور پتلون پر وہی پرچی لگی ہوئی ہے جس پر لکھا ہوا ہے "ٹیری لین کی پتلون، قیمت اسی روپے"

اسی روپے! منگو نے سنا تھا کہ ان کے دفتر کا بڑا منیجر ایک دن میں اسی روپے کی شراب پی جاتا ہے۔ اسسٹنٹ منیجر مہینے میں اسی روپے کی سگریٹ پھونک دیتا ہے۔ مگر منگو کو تو مہنگائی الاؤنس ملا کر کل ملتے ہی تھے اسی روپے اس میں سے وہ بیس روپے مہینہ اس کھولی میں رہنے کا دیتا تھا۔ جہاں وہ اور رلدو اور ان جیسے دو اور زمین پر سوتے تھے۔

چال پرانی تھی۔ ایسا لگتا تھا اگلی برسات میں گر جائے گی کھولی اندھیری تھی۔ اتنی چھوٹی تھی کہ چار آدمی جب سوتے تھے تو اس طرح کہ ایک کی ٹانگیں دوسرے کے سر سے ٹکراتی تھیں۔ مگر کنوئیں سے پانی بھر کے لانا نہیں پڑتا تھا۔ کھولی کے ایک کونے میں موری تھی جہاں پانی کا نل لگا ہوا تھا۔ برامدے کے پرے کنارے پر دو پاخانے تھے۔ ان کی صفائی کے لئے ترکن بھنگی لوکرا جب ڈھونے نہیں آتے تھے۔ پانی کی ٹنکی لگی تھی اور اس میں ایک زنجیر۔ زنجیر کھینچتے ہی پانی کا ایک ریلا آتا تھا اور گندگی کو بہا کر لے جاتا تھا۔ اور منگو کو ایسا لگتا تھا وہ پانی کا ریلا ساتھ ہی اس گندگی کو بھی بہا کر لے جاتا ہے جو منگو کی ساری جاتی پر ہزاروں برس سے لگی ہوئی تھی۔ اڈرسواس کو چال میں صرف سونے کی جگہ کے بیس روپے مہینہ دینا منظور تھا مگر دس روپے مہینہ پر کسی جھونپڑی میں رہنا منظور نہیں تھا کیونکہ وہاں پاخانے میں پانی کی ٹنکی اور زنجیر لگی ہوئی نہیں تھی۔

سواسی روپے میں سے بیس روپے کرائے کے دیئے، ساڑھے سات روپے مہینے کا اس کا ریلوے پاس تھا۔ ڈیڑھ روپیہ روز کھانے پر بھی لگتا تھا۔ مشکل سے اتنا بچتا تھا کہ وہ مہینے میں ایک بار کوئی فلم دیکھ سکے۔ اب اسی روپے کی ٹیری لین کی پتلون خریدے تو کیسے خریدے؟ سواس نے پگھار ملتے ہی سیونگ بینک میں حساب کھول لیا۔ اور فیصلہ کر لیا کہ ہر مہینے بیس روپے مہینہ بچا کر اس میں ضرور ڈالے گا۔ سینما جانا اس نے بالکل بند کر دیا۔ دوپہر کے کھانے کے بجائے کبھی دو کیلے کبھی ڈبل روٹی کھا کر ایک پیالی چائے پی لیتا۔ دفتر سے کہیں کام پر جانے کے لئے بس کا کرایہ ملتا تو وہ پیدل جاتا آتا۔ اور کرائے کے پیسے بچا کر سیونگ بنک میں ڈال دیتا۔

ابھی بینک میں ساٹھ روپے ہی جمع ہوئے تھے کہ ٹیری لین کی پتلون خریدنا اور بھی ضروری ہو گیا۔ ان کے دفتر میں ایک نئی اسٹینو گرافر آئی تھی۔ مس کملا راٹھور۔ جو منگو کو بہت اچھی لگتی تھی۔ دبلی پتلی، سانولی، مگر اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور بہت خوبصورت تھیں۔ اور اس کے سینے پر پڑی ہوئی دو چوٹیاں (جن میں کبھی گلابی کبھی نیلے ربن بندھے ہوتے تھے) منگو کو بہت اچھی لگتی تھیں۔ کملا کی پتلی لمبی انگلیوں میں جادو تھا۔ وہ ٹائپ رائٹر پر بجلی کی رفتار سے چلتی تھیں۔ منگو جب بھی کام سے خالی ہوتا وہ اپنے اسٹول پر بیٹھا بیٹھا کملا کو ٹائپ کرتے دیکھا کرتا تھا۔ اس کا اسٹول جس کونے میں تھا وہ کملا کی ٹیبل سے دور نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی ہر روز منگو اسے دو چار انچ اور سرکا لیتا تھا۔ یہاں تک کہ اب وہ اپنی جگہ پر بیٹھا بیٹھا نہ صرف کملا کو دیکھ سکتا تھا بلکہ اس کی بھینی بھینی خوشبو کو بھی سونگھ سکتا تھا۔ جس میں لکس ٹائلٹ سوپ اور کسی پاؤڈر کے علاوہ جوانی کے پسینے کی گندھ بھی شامل تھی۔

ایک دن کملا نے "ٹائپ رائٹر کی مشین میں سے کاغذ نکالتے ہوئے گھنٹی بجائی تو منگو لپک کر اٹھا۔" یہ چٹھی اندر صاحب کو دے دو۔" کملا نے کاغذ پکڑاتے ہوئے منگو سے کہا۔ کاغذ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں گئے تو ان کی انگلیاں چھو گئیں۔ اور منگو کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے سارے بدن میں بجلی کا کرنٹ دوڑ گیا ہو۔

دفتر میں ایک بوڑھا ہیڈ چپراسی تھا جو اللہ دار کہلاتا تھا۔ ایک دن اس نے منگو کو الگ لے جا کر کہا "بیٹا منگت،

" یہ تیری نظر کدھر پھسل رہی ہے۔ بیٹا! تجھ سے عمر میں کم سے کم چھ برس بڑی ہے۔"
منگو نے سوچا۔ یہ بڈھا جوانی سے جلتا ہے۔ مجھے تو کملا اتنی بری نہیں لگتی۔ مجھ سے بڑی ہوتی تو اس کو دیکھ کر میرا دل کیوں دھڑ دھڑ کرنے لگتا ہے۔؟

پھر ایک دن جب دفتر کے سب لوگ لنچ کی چھٹی میں آس پاس کے چھوٹے موٹے ہوٹلوں میں گئے ہوئے تھے۔ منگو نے دیکھا کملا اپنی میز پر بیٹھی ایک کاغذ کے پیکٹ میں سے پوری بھاجی نکال کر کھا رہی ہے۔ منگو اپنے اسٹول پر بیٹھا ڈبل روٹی اور کیلے کھا رہا تھا اس نے کملا کی طرف دیکھ کر کہا "کیوں جی آپ کھانا گھر سے لاتی ہیں۔"

کملا نے کھاتے کھاتے سر کے اشارے سے ہاں کہا۔

" یہ کیلا کھائیں گی؟"

کملا پہلے تو ہچکچائی، پھر مسکرا کر اس نے کیلا لے لیا۔

"تم پوری کھاؤ گے۔"

" کھاؤں گا جی۔"

دو پوریوں پر بھاجی رکھتے ہوئے کملا نے پوچھا۔ "چھوت چھات کا خیال تو نہیں ہے؟" اور جب منگو نے سر ہلا کر نہیں کہا تو کملا بولی۔ "کون جات ہو؟" اس سوال کے لئے تو منگو تیار ہی رہتا تھا، کھٹ سے اس نے جواب دیا "راجپوت"

" بہت اچھا،" کملا نے جواب دیا "ہم بھی راجپوت ہیں۔ لو پوری کھاؤ۔"

ابھی کملا سے منگو کی بات چیت کا سلسلہ شروع ہی ہوا تھا کہ ایک دن اتوار کو رلدو منگو کو جوہو لے گیا "جوہو بڑی خوبصورت جگہ ہے،" رلدو نے کہا" اور پھر وہاں میرے سگے والے رہتے ہیں۔ کھانا بھی وہیں کھائیں گے۔"

منگو کو اتنے مہینے بمبئی رہتے ہو گئے تھے لیکن اس نے اب تک جوہو کی سیر نہیں کی تھی۔ دیکھا تو خوش ہو گیا۔ سمندر کا کنارہ نرم نرم ریت، اور نیچے اونچے ناریل کے پیڑ، بھیل پوری والوں کی دکانیں، رنگین ساڑھیاں، شلوار قمیص والیوں کے ہوا میں لہراتے ہوئے دوپٹے، منگو نے سوچا ایک دن کملا کو جوہو کی سیر کرانی چاہیئے۔

جوہو ہوٹل اور سن اینڈ سینڈ ہوٹل کے سامنے سے گذرتے ہوئے وہ سمندر کے کنارے کنارے جا رہے تھے کہ ناریلوں کے جھنڈ میں ایک دو منزل کی بلڈنگ نظر آئی۔ رلدو نے کہا۔ "وہاں ہمارے سگے والے رہتے ہیں۔"

پہلے تو منگو نے سوچا۔ "رلدو کے سگے والے رہتے تو ہیں بڑی خوبصورت جگہ تھی،" بلڈنگ بھی پکی تھی اور ان کی چال کی طرح پرانی اور بوسیدہ نہیں تھی مگر باہر ناریلوں کے جھنڈ میں تین بڑی بڑی موٹر ٹرکیں کھڑی تھیں۔ دو بند اور ایک کھلی ہوئی مگر تینوں میں سے بڑی بدبو آ رہی تھی۔ جیسے دنیا بھر کی گندگی ان ٹرکوں میں بھری ہوئی ہو۔ جب وہ ان کے پاس سے گذرے تو منگو نے دیکھا کہ کھلی ہوئی ٹرک گندے بدبودار کچرے سے بھری ہوئی ہے۔ ایک کالا سا دبلا سا آدمی میلا سا اوور آل پہنے اس

کے پاس کھڑا ہوا بیڑی پی رہا ہے۔

منگو نے پوچھا "یہاں کون رہتا ہے؟"

رلدو نے کہا۔ "یہاں ہم رہتے ہیں۔"

یہ بلڈنگ میونسپل کارپوریشن کی بنائی ہوئی تھی۔ پکّی بلڈنگ، ناریلوں کے جھنڈ میں سمندر کے کنارے بڑی خوبصورت جگہ۔ منگو کو رلدو نے بتایا کہ یہاں میونسپلٹی کے محکمۂ صفائی کے مزدور رہتے ہیں۔ یعنی بھنگی "ہمارے تمہارے جیسے ہریجن۔"

"مگر۔" منگو نے حیرت سے پوچھا "اب تو صفائی کا کام مشینوں سے ہوتا ہے۔ ہر گھر کے پاخانے میں گندگی بہانے کو پانی کی ٹنکی اور زنجیر لگی ہے اب تو یہ کام کوئی بھی کر سکتا ہے۔"

رلدو نے منگو کو ایسے دیکھا جیسے وہ اسے پاگل سمجھتا ہو۔ "منگو یہ کام ہمارے سوا اور کوئی نہیں کرتا اور کوئی نہیں کر سکتا گندے گٹروں کے اندر ہمارے سوا اور کون گھسے گا۔ سڑک کے کنارے پڑے مرے ہوئے چوہے کون اٹھائیگا، جھاڑو کون دیگا سارے شہر کے کوڑے کے ڈھیروں کو ٹرکوں میں ڈال کر کوڑی پر کون ڈالنے جائے گا ــــــــ سوائے اُن کے جن کے باپ دادا نے سیکڑوں برس سے یہی کام کیا ہے؟"

منگو نے کہا "پھر تو ہم وہیں کے وہیں ہیں سوائے اس کے کہ پہلے کوڑے کرکٹ کو ٹوکروں میں اٹھاتے تھے اب ٹرک میں بھر کر لے جاتے ہیں۔"

رلدو نے کہا "منگو بھیا یہ بھی کوئی چھوٹی بات نہیں ہے۔ تو نے کبھی کوڑے کا ٹوکرا نہیں اٹھایا اس لئے تو نہیں جانتا ٹرک چلانا کتنی بڑی بات ہے۔"

اتنی دیر میں وہ دبلا سوکھا سا آدمی جو میلا اور آل پہنے کھڑا تھا اس نے اپنی بیڑی زمین پر پھینکی، کود کر ٹرک میں چڑھا، دھڑ سے دروازہ بند کیا اور بڑے زور سے انجن کو اسٹارٹ کیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ گندگی سے بھرے ٹرک پر نہیں راجہ جی کے ہاتھی پر بیٹھا ہو۔

اب وہ بلڈنگ کے زینے پر چڑھ رہے تھے۔ منگو نے سوچا ہے یہ بھی بھنگیوں کی بستی مگر ہماری حصار والی جھونپڑیوں سے تو بہتر ہے۔ چھوٹے چھوٹے مگر صاف ستھرے کمرے تھے۔ رلدو نے بتایا، میونسپلٹی کرایہ بھی بہت کم لیتی ہے۔ صرف چھ روپے مہینہ۔ برآمدے میں رہنے والوں کے ٹنگے ہوئے گملوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ پھول شاید خوشبودار بھی تھے مگر نیچے کھڑے ہوئے ٹرک کی پھیلی ہوئی بدبو میں ان پھولوں کی خوشبو دبی ہوئی تھی۔

رلدو نے منگو کو اپنے سگے والے سے ملایا۔ مضارام کو دیکھ کر منگو کو اپنا باپ یاد آگیا۔ چہرے پر ویسے ہی زندگی بھر کی محنت کی گہری لکیریں پڑی ہوئی تھیں، اسی طرح بڑھاپے سے کمر جھکی ہوئی تھی۔ مضارام ایک کمرے میں اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہتا تھا۔ بیوی بازار گئی ہوئی تھی۔ بیٹی کونے میں بیٹھی ہوئی اسکول کا سبق یاد کر رہی تھی۔ "اری او منگتی، ادھر آ، مہمان

آئے ہیں، چائے بنا لے ،، لڑکی اپنی جگہ سے اٹھی تو منگو نے دیکھا پندرہ سولہ برس کی سانولی سی لڑکی ہے۔ گھر کا دھلا ہوا اسکول کی یونیفارم کا نیلا فراک پہنے ہوئے وہ بالکل بچی لگتی تھی۔

"رمی رلدو کا کا کو تو پہچانتی ہے نا اور یہ منگو بھی اپنے حصار کا ہی ہے اپنی برادری کا۔

منگتی نے دونوں کو ہاتھ جوڑ کر نمسکار کیا۔ اور منگو کی ہمت نہیں ہوئی کہ منسارام سے کہے "بمبئی میں میرا نام منگو نہیں ہے منگت سنگھ ہے۔ "کیونکہ پھر یہ بھی کہنا پڑتا۔" میں تمہاری برادری سے نہیں ہوں، منسا رام جی ،،

منگتی چائے بنانے کے لئے تیل کا چولہا جلا رہی تھی اور منسارام بیٹی کی تعریف کئے جا رہا تھا۔ "چھٹی کلاس میں پڑھتی ہے۔ بڑی ہوشیار ہے سب کے خط پتر یہی پڑھکر سناتی ہے۔ ہندی کی کتنی ہی کوتیائیں تو منہ زبانی یاد ہیں گھر کے کام کاج میں بھی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے اسکول کی ماسٹرنی تو کہتی ہے اسے میٹرک تک پڑھاؤ مگر رلدو بھیا تو ہی بتا چھوکری اتنا پڑھ لکھ کر کیا کریگی۔ اس کی ماں تو کہتی ہے اب کی دیوالی پر اس کے ہاتھ پیلے کر دوں ،،

اور یہ کہہ کر نہ جانے کیوں منسارام نے منگو کی طرف دیکھا اور منگو نے منگتی کی طرف اور منگتی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چائے کی پیالیاں آپ سے آپ کھنکنے لگیں اور پیالی منگو کو وہ پکڑاتے ہی بھاگ گئی۔

واپسی میں وہ بس اسٹینڈ پر پہونچے تو دیکھا بڑا لمبا کیو لگا ہوا ہے۔ اتوار کے دن جوہو پر بڑی بھیڑ ہوتی ہے اور شام ہوتے ہی سب شہر لوٹنے کی سوچتے ہیں۔

منگو نے کہا " رلدو کا کا، آج تو پھنس گئے۔ کم سے کم تین بسوں کے بعد اپنا نمبر آئے گا۔،،

اتنے میں بدبو کے ایک بھبکے کے ساتھ ایک کچرے کی ٹرک آکر بس اسٹینڈ کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ جس کو دیکھتے ہی کتنے ہی آدمیوں نے اپنی اپنی ناک بند کرلی۔ ایک میم صاحب نے سینٹ لگا رومال اپنی ناک کے آگے ہلانا شروع کردیا۔

"اے ڈرائیور، یہ کچرا گاڑی یہاں سے ہٹاؤ۔ ،،

ڈرائیور جو ایک ہٹا کٹا جوان تھا اور اوورآل کو اس شان سے پہنے تھا جیسے وہ ملٹری کی یونیفارم ہو۔ اپنے دانت چمکاتے ہوئے بولا " ارے تو اس کچرے کے ڈھیر کو تمہارا باپ اٹھائے گا یہاں سے ،،

اور جب تک کچرا انہیں بھرا گیا وہ ٹرک وہیں کھڑی رہی۔ اور میم صاحب کی ناک کے سامنے سینٹ بھرا رومال جھولتا رہا۔ یہاں تک کہ سینٹ ہوا میں اڑ گیا اور صرف کچرے کی بو رہ گئی۔

ٹرک اسٹارٹ کرتے ہوئے ڈرائیور نے رلدو سے پوچھا "کیوں کا کا کہو تو بریلی تک چھوڑ دوں ،،

رلدو نے منگو کی طرف دیکھا، منگو نے لمبے کیو کو دیکھا۔ پھر وہ دونوں ٹرک میں ڈرائیور کے برابر ہی بیٹھ گئے۔ ٹرک روانہ ہوگئی۔ اور تب میم صاحب رومال بیگ میں واپس رکھتے ہوئے بولیں "ان بھنگی لوگوں کا بھی کتنا دماغ ہوگیا ہے!،،

اگلے دن منگو دفتر جانے سے پہلے خوب صابن سے رگڑ کر نہایا، پھر دھولی کے دھلے کپڑے پہنے، مگر پھر بھی

جب وہ دفتر میں پہونچا اور کملا نے اس کی طرف مسکرا کر دھیرے سے کہا "ہیلو"، تو بڑی دیر تک وہ کملا کی ٹیبل سے دور ہی رہا کہ کہیں اب تک اس میں کچرا گاڑی کی بو تو نہیں سمائی ہوئی ہے۔ اور دل ہی دل میں وہ سوچتا رہا "اگر کبھی کملا نے وہ بدبو سونگھ لی تو پھر کبھی مجھ سے مسکرا کر بات نہیں کرے گی"۔

چندروز کے بعد رلدو نے پوچھا، "کیوں منگو، منگتی کیسی لگی؟"

"کون وہ منسارام جی کی چھوکری؟ ٹھیک ہی ہے!"

"منگو اور منگتی۔ تمہاری جوڑی اچھی رہے گی نا؟"

منگو کو ایسا لگا جیسے اسے کسی نے گالی دی ہو۔ "کاکا کیا بات کر رہے ہو؟"

"کیوں ہوا کیا؟ چھوکری جوان ہے، صورت شکل کی بری نہیں، چھ کلاس پڑھی بھی ہے......"

منگو کی زبان سے بے اختیار نکل گیا "مگر بیٹی تو بھنگی کی ہے؟"

رلدو کو پہلے تو ایسا لگا جیسے منگو نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا ہو۔ پھر وہ غصے کو پی کر بولا: "اور تو کس کا بیٹا ہے؟"

"کچھ بھی ہو کاکا، میں بھنگیوں میں بیاہ نہیں کروں گا۔" اور یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کھولی سے باہر نکل گیا۔

سیڑھیوں سے اترتا ہوا چال سے باہر آ گیا۔ نہ جانے کب تک سڑکوں پر گھومتا رہا۔ تھک کر ٹھیرا تو دیکھا شیشے کی دیوار کے پیچھے صاحب ٹیری لین کی پتلون پہنے کھڑا مسکرا رہا ہے، شاید اسے بلا رہا ہے، کچھ یاد دلا رہا ہے۔

منگو نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سیونگ بنک کی کتاب نکالی، اب اس کے حساب میں پچہتر روپے جمع ہو چکے تھے اس نے سوچا۔ "صرف پانچ روپے کی کسر ہے"۔

دوپہر کو دفتر کی سب میزیں خالی پڑی تھیں۔ صرف کملا اپنی جگہ بیٹھی تھی۔ منگو دفتر کی کینٹین سے چائے پی کر آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیالی تھی جو اس نے کملا کے سامنے رکھ دی۔

"تھینک یو"، کہہ کر کملا چائے پینے لگی تو منگو نے ایک اخبار جیب سے نکالا۔ اور کملا کی طرف دیکھے بغیر ہی بولا۔

"ناز میں آؤ پیار کریں لگی ہے۔"

"سنا ہے اچھی مزیدار فلم ہے"

"اس اتوار کو دیکھنے چلو گی؟"

"پتا جی سے پوچھنا ہوگا۔ اگر انہوں نے ہاں کہی تو جا سکتی ہوں"۔

"پھر پوچھ کر کل بتانا"

اگلے دن کملا نے منگو سے کہا۔ "اتوار کو میرے گھر آنا ہوگا"۔

"اور فلم دیکھنے نہیں چلوگی؟"

"پہلے پتا جی تم سے ملنا چاہتے ہیں۔"

"تو میں ساڑھے چار بجے آجاؤں گا۔ تمہارے پتا جی سے مل کر چھ بجے سنیما پہونچ سکتے ہیں۔"

اگلے دن منگو نے بینک سے پچھتر روپے نکال لئے۔ پندرہ روپے دفتر کے کیشیر سے اڈوانس لئے۔ کام ختم ہوتے ہی وہ چرچ گیٹ سٹریٹ کی طرف بھاگا۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے کھڑا صاحب اپنی نیلی کانچ کی آنکھوں سے اب بھی گھور رہا تھا۔

لیکن آج ان کے درمیان یہ شیشے کی دیوار نہیں رہے گی۔ منگو نے جیب میں ہاتھ ڈال کر کرارے نوٹوں کو چھوکر اطمینان کیا اور پھر دکان میں داخل ہوگیا۔

"مجھے ٹیری لین کی پتلون چاہئے۔"

"کپڑا پسند کر لیجئے۔"

"بس وہ چاہئے ریڈی میڈ جو صاحب پہنے ہوئے ہیں۔"

"صاحب ——— اوہ وہ ڈمی کو جو پہنائی ہوئی ہے۔ میں ابھی لاتا ہوں، آپ فٹنگ روم میں جائیے، ٹرائی کر لیجئے۔"

درزی پتلون لے آیا۔ پہننے سے پہلے منگو نے کپڑے کو چھو کر دیکھا۔ سچ مچ بڑا ملائم تھا۔ اپنی خاکی ڈبل زین کی پتلون اتار کر اس نے نئی پتلون پہن کر دیکھی۔ بالکل فٹ۔

جیسے بچہ، جیسے زپ، ویسے ہی فٹ!

جیبوں میں ہاتھ ڈالا تو چکنی سلک کے استر پر ہاتھ پھسل گئے۔ واہ واہ! اس نے سوچا کیا پتلون ہے۔

درزی نے کہا۔ "صاحب آئینے میں دیکھ لیجئے، ایسا لگتا ہے کہ آپ کے لئے ہی سلی ہے۔"

منگو نے آئینہ دیکھا تو وہاں حصار کے کھلتی داڑھے والے منگو کی بجائے ایک کالے بالوں، سانولی رنگت کا صاحب کھڑا تھا جس کی ٹانگوں میں نیلی ٹیری لین کی پتلون تھی۔ پتلون پر کاغذ کی پرچی لگی ہوئی تھی۔ ٹیری لین کی پتلون قیمت اسی روپیہ۔ اب مجھ میں اور صاحب میں فرق بھی کیا ہے؟

اس نے درزی سے کہا۔ "یہ لیجئے اسی روپے اور پتلون کو کاغذ میں لپیٹ دیجئے۔"

کاغذ کے تھیلے میں ٹیری لین کی پتلون لئے منگو باہر نکلا تو اسے ایسا لگا اتنی دیر میں دنیا ہی بدل گئی ہے۔ وہی چرچ گیٹ سٹریٹ ہے مگر آج چہل پہل ہی الگ ہے۔ ہر آدمی خوش دکھائی دیا۔ ہر عورت خوبصورت فلورا فاؤنٹین کے فوارے چل رہے تھے۔ دور سمندر کی طرف آسمان پر رنگ برنگے بادل چھائے ہوئے تھے اور

سڑکوں کی نیلی نیلی روشنیاں ایک ایک کر کے جلتی جا رہی تھیں اب وہ خود بھی تو بدل گیا تھا اب نہ وہ ایک بھنگی کا چھوکرا تھا جس کو اسکول میں سب سے الگ ٹاٹ پر بیٹھنا پڑتا تھا۔ نہ وہ ماڈرن سوپ کمپنی لیٹیڈ کے ہیڈ آفس کا آفس بوائے یعنی چپراسی تھا۔ اب وہ مسٹر منگت سنگھ تھا جس کے ہاتھ میں ایک بڑا موٹے کاغذ کا تھیلا تھا۔ جس پر ایک بہت بڑی درزی کی دکان کا نام اور پتہ چھپا ہوا تھا اور اس کاغذ کے تھیلے میں ایک ٹیری لین کی پتلون تھی۔

اس رات کو منگو کو کتنی ہی دیر نیند نہ آئی۔ وہ لیٹا لیٹا اپنی ٹیری لین کی پتلون کے بارے میں سوچتا رہا اس کے ساتھ شرٹ بھی بڑھیا ہونی چاہیئے۔ اور جوتا بھی نیا ہو تو اچھا ہے۔ پھر وہ یہ سب پہن کر کملا کے گھر جائے گا اس کے پتا سے ملے گا تو وہ بھی اس کے کپڑے دیکھ کر مان جائیں گے لڑکا ضرور کسی بڑے اونچے گھرانے کا ہے فوراً بیٹی کو اس کے ساتھ سنیما جانے کی اجازت دیدیں گے۔ پہلے دو چار مہینے وہ دونوں شام کو سنیما یا سیر کو اکھٹے جایا کریں گے۔ پھر ایک دن سارا اتوار جوہو پر گذاریں گے، سمندر کی لہروں میں ڈبکیاں لگائیں گے۔ ناریل پانی پئیں گے اور مسالے دار چاٹ کھائیں گے۔ اور شام کو جوہو ہوٹل یا سن اینڈ سینڈ میں چائے پئیں گے۔ پھر ٹیکسی لے کر واپس ہونگے اور راستے میں منگو کملا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہے گا۔ "کملا کیا تم میری ———— ؟"

مگر اس وقت تک وہ سوچکا تھا۔ اور خواب میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی ٹیری لین کی پتلون ایک نیلے رنگ کا ہوائی جہاز بن گئی ہے۔ اور وہ اس پر سوار ہو کر نیلے آسمان میں اڑتا ہوا کملا کے گھر کی طرف جا رہا ہے۔

اتوار کو ٹھیک ساڑھے چار بجے اپنے نئے بوٹ چرمراتا ہوا منگو کملا کے بتائے ہوئے پتہ پر پہونچ گیا دروازے پر کملا کے پتا کے نام کی تختی تھی۔ اور ساتھ میں گھنٹی بھی لگی تھی۔ کملا کے پتا جی نے خود دروازہ کھولا تو دیکھا ایک کسی قدر گھبرایا ہوا سا مگر اچھی صورت شکل کا بڑے صاف ستھرے کپڑے پہنے، نوجوان باہر کھڑا ہے۔

"جی وہ مجھے مس کملا نے ————"

"آؤ بھئی آؤ اندر آؤ۔ کملا نہا رہی ہے۔ تم ادھر بیٹھو۔"

چھوٹی سی فلیٹ تھی اور اس کا چھوٹا سا ڈرائنگ روم تھا۔ وہیں کملا کے پتا نے منگو کو بٹھایا۔

منگو اپنی نئی ٹیری لین کی پتلون کی سلوٹ کو سنبھالتے ہوئے کرسی پر بیٹھ گیا۔ کملا کے پتا جی غور سے اس کے منہ کو دیکھ رہے تھے۔ اور منگو سوچ رہا تھا یہ بڑے میاں میری ٹیری لین کی پتلون کی طرف کیوں نہیں دیکھتے۔

"کہو بھئی تمہارا نام کیا ہے ؟"

"جی منگت سنگھ"

"سنگھ تو تم بھی راجپوت ہو کیا ؟"

"جی ہاں ہم راجپوت ہی ہیں"

" چندر نبسی یا سورج بنسی "

منگو یہ سوال سن کر بوکھلا گیا۔ پھر بات بناتے ہوئے اس نے کہا " جی یہ سب تو پتا جی کو معلوم تھا۔ "

" تمہارے پتا جی گذر گئے ہیں کیا ؟ "

" جی ایک برس ہوئے ان کا دیہانت ہو گیا "

" بڑا افسوس ہے کیا کام کرتے تھے تمہارے پتا جی ؟ "

منگو نے اس سوال کا جواب پہلے سے سوچ رکھا تھا۔ جلدی سے بولا۔

" جی وہ میونسپل کمیٹی میں نوکر تھے۔ "

" تم کیا کرتے ہو ؟ "

" جی میں اسی دفتر میں کام کرتا ہوں جہاں کملا...... مس کملا جی "

" ہاں مگر کیا کام کرتے ہو؟ تم بھی سٹینو گرافر ہو ؟ "

" جی نہیں۔ سٹینو گرافر تو نہیں "......

" پھر کیا، معمولی کلرک ہو ؟ " کملا کے پتا جی کی آواز میں ایک عجیب سی برفیلی ٹھنڈک بڑھتی جا رہی تھی۔

" جی نہیں کلرک بھی نہیں ہوں۔ بات یہ ہے کہ میں ابھی ـــــــــ آفس بوائے ہوں "

" آفس بوائے ؟ یعنی چپراسی "

" جی یہی سمجھئے مگر ہمیں آفس بوائے ہی بولتے ہیں "

" تنخواہ کیا ملتی ہے ؟ "

" اسی روپے "، منگو نے جواب دیا۔ مگر اس کا جی چاہتا تھا کہے " بڑے میاں مجھے اسی روپے تنخواہ ملتی ہے تو کیا ہے میرا دل کتنا بڑا ہے یہ تو دیکھو۔ میری اسی روپے کی ٹیری لین کی پتلون کو غور سے دیکھو کسی بھی صاحب سے کم نہیں ہوں۔ آج اسی روپے ملتے ہیں تو کیا ہوا، کل دیکھو کتنی ترقی کرتا ہوں۔ "

" ہوں " ! کملا کے پتا نے برف سے بھی ٹھنڈی آواز میں کہا اور اٹھ کر اندر چلے گئے۔

تھوڑی دیر میں کملا اکیلی باہر آئی۔ نائلون کی نیلی ساڑھی پہنے، بالوں میں نیلے ربن لگائے بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ منگو کا جی چاہے کہے " کملا۔ دیکھو، تمہاری نیلی ساڑھی نیلے ربن کی طرح میری ٹیری لین کی پتلون بھی نیلی ہے" لیکن کملا کی آنکھوں کا سرمہ گالوں کے پاؤڈر پر پھیل رہا تھا اور گلابی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ابھی ابھی رو کر آنسو پونچھے ہیں۔

" سوری منگو "، وہ بولی۔ " پتا جی سینما جانے کو منع کر رہے ہیں۔ تم جاؤ۔ "

منگو دروازے سے باہر نکل رہا تھا کہ اندر سے کچھ سن کر ٹھٹھک گیا۔ اندر کملا کے ماتا پتا جھگڑ رہے تھے۔ اور ان کی آوازیں دروازے کے باہر بھی منگو کا پیچھا کرتی رہیں۔

ماں کہہ رہی تھی۔ "مجھے تو لڑکا ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ کپڑے بھی اچھے پہنے ہوئے ہے۔ مگر تمہیں تو کوئی پسند ہی نہیں آتا۔ چوبیس برس کی تو ہو گئی۔ عمر بھر کنواری بٹھائے رکھو گے کیا؟"

اور باپ کہہ رہا تھا "کنواری بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے۔ بس اسی روپے پانے والے چپراسی سے تو اپنی لڑکی نہیں بیاہ سکتا!"

سڑک پر نکل کر منگو نے پتلون کی ریشمی جیب میں ہاتھ ڈالا اور "آؤ پیار کریں" کے دونوں ٹکٹ نکال کر پھاڑ ڈالے۔

ابھی سٹیشن کی طرف جانے کے لئے سڑک پر مڑا ہی تھا کہ ایک بدبو کا بھبکا آیا اور ایک کچرے کی سڑک پاس سے گذر گئی۔ منگو نے سوچا اس نئی ٹیری لین کی پتلون کے باوجود میرے اندر کوئی بدبو سی ہوگی ہے کیونکہ کملا کے پتا نے اسے سونگھ کر مجھے باہر نکال دیا۔

سٹیشن پر چائے کی دکان پر کھڑے ہوئے اس نے سامنے لگے ہوئے قدآدم آئینے میں اپنے آپ کو غور سے دیکھا۔ بالکل صاحب لگتا ہوں۔ آسمانی رنگ کی دس روپے کی شرٹ۔ اسی روپے کی ٹیری لین کی پتلون مجھ میں کیا برائی نظر آئی۔

اسی روپے! اسی روپے کی پتلون! اسی روپے پگھار! جات پات کی گندگی کو تو زنجیر کھینچنے سے پانی کا ریلا بہا کر لے گیا۔ لیکن اس اسی روپے پگھار کے کلنک کو دھونے کے لئے کون سا گنگا جل دھو سکتا ہے؟

چائے پی کر پیالی واپس کرتے ہوئے اس نے سوچا بمبئی میں چائے دیتے وقت کوئی جات پات نہیں پوچھتا۔ لیکن بیٹی کو کسی چھوکرے کے ساتھ سینما بھیجنے سے پہلے جات پات بھی پوچھتے ہیں اور پگھار بھی۔

اگلے اتوار کو رسا تنا کر دز سے جو ہو بس میں جاتے ہوئے منگو نے دیکھا لیڈو سینما میں بھی "آؤ پیار کریں" چل رہی ہے۔

منسا رام نے منگو کو دیکھا تو اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ "آؤ بیٹا۔ بڑے دنوں کے بعد آئے ہو۔ منگتی کی ماں یہ اپنا منگو ہے۔ اسے منگتی مہمان آیا ہے ذرا چائے تو بنا لے۔"

"چائے رہنے دیجئے میں تو سینما جا رہا تھا۔ سوچا آپ لوگوں سے بھی پوچھ لوں۔ چلیں گے آپ؟" یہ کہہ کر اس نے ایک لہراتی ہوئی نظر منگتی کی طرف ڈالی۔

"بیٹا ہم بڈھے لوگ کیا سینما دیکھا جائیں گے۔"

"یہیں جوہو کے لیڈو میں بڑی اچھی فلم چل رہی ہے"
"پاس میں ہی ہے تو منگتی چلی جائے گی۔ اے منگتی جلدی سے کپڑے بدل لے۔"
منگو کمرے سے نکل کر باہر برآمدے میں آگیا۔ اندر منگتی کے ماں باپ کھسر پھسر کر رہے تھے۔
"........برادری والے کیا کہیں گے..."
"اری یہ نیا رجحان ہے۔ دیکھ رہے ہو چھوکرا شریف ہے۔ پھر اپنی برادری کا ہے"
"........اری سینما جا رہی ہے تو یہ نہیں وہ نئی والی ساڑھی پہن۔"
منگتی کپڑے بدل کر آئی تو منگو نے دیکھا کہ ساڑھی پہنتے ہی منگتی جوان ہوگئی ہے۔ ساڑھی سستی نقلی سلک کی تھی لیکن نیلی تھی اور منگتی کے گدرائے ہوئے جسم پر بڑی بھلی لگ رہی تھی۔
جوہو کی سڑک پر اور سمندر کے کنارے سینکڑوں نوجوان جوڑے چلے جا رہے تھے۔ لڑکے سوٹ پہنے تھے۔ پتلون قمیص پہنے تھے۔ کرتا پاجامہ پہنے تھے۔ لڑکیاں ساڑھیاں پہنے تھیں، شلوار قمیص، کرتا چوڑی دار پاجامہ پہنے تھیں۔ سب خوش تھے۔ ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے تھے۔
ان میں ایک سانولا سا نوجوان تھا جو نیلے رنگ کی ٹیری لین کی پتلون اور نئے چرمر کرتے ہوئے جوتے پہنے تھا اور اس کے ساتھ نیلی ساڑھی پہنے ایک شرمیلی سی سولہ سترہ سالہ لڑکی تھی جو بات کرتے بھی گھبرا رہی تھی۔
"کیوں جی"، اس نے دھیرے سے پوچھا "ہم کون سی فلم دیکھنے جا رہے ہیں"۔
منگو نے جواب دیا "آؤ پیار کریں"۔

رضیہ سجّاد ظہیر

ہمار جی چاہت ہے

گرمی سخت تھی، دروازے کھڑکیاں سب بند تھے، لڑکیاں جا چکی تھیں۔ پھر ایکدم سے تیز گانے کی آواز آنے لگی تو مجھے بڑی حیرانی ہوئی! صبح سے اس موقعہ کے انتظار میں تھی کہ یہ لوگ چلی جائیں گی تو تین گھنٹے کے لئے ٹرانسسٹر سے نجات مل جائے گی، اُن کے جانے کے بعد فوراً پلنگ پر آلتی پالتی ماری تھی، تختی جس میں کاغذ اُڑسا ہوا تھا وہ گود میں رکھی، روشنی جلائی، قلم اٹھایا ہی تھا کہ یہ گانا شروع ہو گیا۔ تجھے میں چاند کہتا تھا....

اتنی سخت کوفت ہونے لگی کہ کچھ کہنے کو نہیں۔ پھر ایسا محسوس ہوا کہ برآمدے میں کوئی چل پھر رہا ہے، پردہ ہٹا کے دیکھا تو نیلم تھی۔ اندر سے ہی پوچھا "نیلم، بھئی یہ کون اتنی زور سے گا رہا ہے۔"

اُس نے میری بات نہیں سمجھی۔ بولی "جی ہاں، بٹیا لوگ بچکر چلی گئیں تو آپ لکھیں گی نہ، اسی مارے آپ کے لئے چائے گرم کرنے آئے ہیں۔"

طبیعت اور جھنجھلا گئی۔ "ارے بھئی گانے کو پوچھ رہی ہوں یہ کون گا رہا ہے حلق پھاڑ کے"۔

اب وہ سمجھی "جی، گا تو کوئی نہیں رہا، وہ گوپال ہے ٹرانسسٹر بجا رہا ہے۔"

"ارے دفتر کے وقت پر ٹرانسسٹر بجا رہا ہے"۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

وہ چائے کی پیالی لئے اندر آ گئی "آج دوسرا سنیچر ہے بیگم صاحب، کچھ بابو لوگ نو بجے آئے تھے، پھر چلے گئے، مگر دفتر تو بند ہے"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے"۔ مجھے افسانے کے چکّر میں یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ آج دوسرا سنیچر ہے۔

"پر اتنی زور سے بجانے کی کیا ضرورت ہے۔ خود سُن رہا ہے یا سارے محلّے کو سُنا رہا ہے۔" میں نے عاجز ہو کے کہا۔

نیلم نے پیالی میرے پاس تپائی پر رکھ دی اور بولی۔ "فورتھ کلاس کا آدمی ہے بیگم صاحب، ایک ٹرانسسٹر مل گیا تو اِترا رہا ہے۔"

"فورتھ کلاس؟ وہ کیا ہوتا ہے؟" مجھے ذرا ہنسی آئی۔

"جی ہاں" نیلم نے میری معلومات میں اضافہ کیا۔ "وہ گورمنٹ میں اِن لوگ کو فورتھ کلاس کہتے ہیں نہ — چپراسی، چوکیدار، مالی، میٹ — احمد بھی تو فورتھ کلاس ہے۔" اس نے اپنے میاں کا نام لیا۔ میاں کا نام لینے میں وہ مجھ سے زیادہ ترقی پسند واقع ہوئی ہے۔ کھٹ سے لے لیتی ہے۔

میں نے عاجز آ کے قلم رکھ دیا، اُٹھی — پچھلا دروازہ ہماری بڑی کوٹھی کی طرف کھلتا ہے، کوٹھی میں ایک بڑا سا سرکاری دفتر کرایہ پر ہے۔ اسی میں گوپال کام کرتا ہے۔ سامنے والے برآمدے میں ایک چھوٹی سی دری بچھی تھی۔ دری پر صرف ٹرانسسٹر رکھا تھا۔ کچھ لوگ دری کے آس پاس زمین پر بیٹھے تھے۔ گوپال آدھا زمین پر آدھا دری پر تھا۔ کیونکہ اس کو ٹرانسسٹر جو چلانا تھا۔ ہر دس پانچ سکنڈ پر وہ سوئی گھما دیتا تھا.... لے لو اسپرو، جھوم جھوم ڈھلتی ....

ہماچل پردیش کی اس پوجنا میں..... نگاہیں ملا کر بدل جانے والے..... یو آر لسننگ ٹو..... چلو اک بار پھر سے..... ڈرگھٹنا..... اووو..... میرا قصور کیا ہے.... شکتی ملز پرووائیڈز فور یو..... کہ تم میری زندگی.

..... درد بدن کا ڈھاتا ہے......

ایک آدمی نے ہاتھ بڑھایا... "ای ٹِن پہ کون شہر آوت ہے ؟"

" ٹِن پر نا ہیں آوت ہے بھائی "۔ گوپال نے اس کا ہاتھ روک کر کہا " اور سوئی ٹِن سے چلت ہے۔"

" پر ای اُور جو رنا ہیں بجت ہے ؟ " ایک اور نے سوال کیا۔ جو نیلا مخمل پتلون اور بھوری بُش شرٹ پہنے تھا۔

" بہت جور اُو بجت ہے، ریڈیا۔ ای چھوٹا ہے نہ" ایک کمسن لڑکے نے رائے دی جو دن میں خس کی ٹٹیاں چھڑکتا تھا۔

" واہ جور کا ہے نہیں بجت ہے۔" گوپال کو اپنے ٹرانسسٹر کی ہتک بہت بُری لگی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے رفتار تیز کر دی کہ ساری کوٹھی گونجنے لگی۔ میں نے دھڑ سے دروازہ بند کیا، آنگن میں آئی، پچھلے دروازے پر دو خط اور ایک رسالہ پڑا دیکھا۔ ایک پوسٹ کارڈ جلدی میں تھا۔ اُلٹ کر دیکھا تو پتہ لکھا تھا گردھر گوپال۔ پیلی کوٹھی، پیلی سڑک، لکھنؤ "

میرا جی چاہا کہ پوسٹ کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گوپال کے نام سے نفرت محسوس ہو رہی تھی۔ اتنا اچھا لکھنے کا موڈ غارت کر دیا کم بخت نے۔

پھر کارڈ پر لکھے الفاظ میرے سامنے ناچنے لگے: تم جو لکھتے ہو کہ اب کی گھر کا خرچا نہیں بھیج سکو گے اور ہاتھ میں لٹکانے والا ریڈیا مول لے رہے ہو، سو ہماری یہ صلاح نہیں ہے، اب کی پالے کی کارن نہ ارہر ہوئی ہے نہ گوہوں نہ سرسوں، آم کے بور بھی آندھی سے آدھے جاتے رہے تو کیا کارن کہ تم باجہ بجاؤ اور یہاں بیج کے لئے بھی خرچا پورا نہ ہوئے۔ اسراف کا یہ کام نہیں کہ برادری میں ناک کٹ جائے اور وہ باجہ بجاتا پھرے، اس کا یہ کارن کہ تمھاری بُوا کے مرنے کا کھانا ابھی تک نہیں کیا گیا ہے، دودھوا آستا تھی، نہ بیٹی نہ بیٹا، تم کو ہی بیٹے کے سمان مانتی تھی۔" اس کے آگے کارڈ میں بہت کم جگہ رہ گئی تھی۔ لہٰذا اتنا باریک باریک لکھا تھا کہ مجھ سے پڑھا نہ گیا۔ پر جتنا بھی پڑھا گیا تھا۔ اُس سے کوفت اور بڑھ گئی تھی — اچھا تو یہ حضرت گھر کا خرچ کاٹ کاٹ کر یہ ٹرانسسٹر بجا رہے ہیں۔ اب تو ان کی خبر لینی ہی پڑے گی۔

خط کو بطور ثبوت لئے ہوئے پھر میں بڑے دروازے پر آ گئی۔ آواز دی " گوپال " ٹرانسسٹر اتنی زور سے بج رہا تھا کہ اُس نے میری آواز سُنی ہی نہیں۔ اور غصہ آنے لگا۔ زور سے پکارا۔ " گوپال"۔

کوئی جواب نہیں۔ صرف ٹرانسسٹر میں بجتے ہوئے

گانے کی تال پر جھومتی اُس کی پیٹھ دکھائی دے رہی تھی۔
میں اور زور سے چلائی "ارے گوپال سُنتا نہیں ہے"
کھٹ سے ٹرانسسٹر بند ہوگیا۔ سب سُننے والے ہڑبڑا کر دفتر کے کمروں میں گھس گئے۔ گوپال نے پیچھے مُڑ کر مجھے دیکھا دَن دَن دَن دَن ایریَل کو نیچا کیا اور اُسے اُٹھایا ہی چاہتا تھا کہ میں نے کہا "ارے گوپال، یہ تو نے کب خریدا؟ یہ ٹرانسسٹر ـــ دکھا ذرا"ـــــ

وہ ایسا کھِل اُٹھا جیسے اُس نے کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ دَن دَن دَن دَن پھر ایریَل اونچا کیا، بٹن دبایا، بجتا ہوا ٹرانسسٹر لئے نیچی سی دیوار کے پاس آ کھڑا ہوا۔ جو میرے گھر اور دفتر کے بیچ میں ہے۔ اور یوں میری طرف بڑھایا جیسے اپنی دُلہن کو منہ دکھائی کے لئے پیش کر رہا ہو۔ بڑی ادا سے شرما کے بولا "جھنکار ہے بیگم صاحب"

"کتنے کو لایا ہے رے؟" میں نے پوچھا۔

"دام تو سائٹ ساڑھے تین سو ہے پھر ہم کا تین سو میں مل گوا۔"

"اور تیری تنخواہ کتنی ہے؟" میں نے ذرا ڈپٹ کر پوچھا۔

وہ منہ پھیر کر ہنسنے لگا۔ تنخواہ تو اسّی رُوپے ہوئے دس روپیہ الونس سات مہنگائی۔ کچھ بابو لوگ انعام اکرام دیئے دیتے ہیں۔"

"تو تو نے اتنے میں اتنا جوڑ لیا کہ تین سو کا ٹرانسسٹر خرید لیا۔ ایں؟"

وہ ذرا سا جھینپ کر مسکرایا، پھر ٹرانسسٹر کو بڑے پیار سے سینے میں دبا کے بولا "ہمار بہت جی چاہت رہا بیگم صاحب، ہاتھ میں لئے کے گانا سُنے کا بنانے کی جی چاہت رہا......"

میں نے سوچا تھا کہ پوسٹ کارڈ اس کے منہ پر مار دوں گی کہ لے نالائق تو باجے بجا اور تیرا خاندان فاقے کرے۔ اپر کچھ اس بھولے پن سے، اس مسرت سے، اس سچائی سے اُس نے یہ بات کہی کہ میں گُم سُم کھڑی رہ گئی۔ اور پوسٹ کارڈ چُپ چاپ اُس کی طرف بڑھا دیا۔

شاید اُسے کچھ اندازہ تھا کہ اس میں کیا لکھا ہوگا کیونکہ وہ کارڈ لیتے ہی بھاگ گیا۔

میں نے دروازہ بند کر دیا۔ لیکن درازوں سے دیکھتی رہی۔ ایک بار اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھا، دروازہ بند ہونے سے غالباً اس کو اطمینان ہوگیا ہوگا کہ میں وہاں نہیں ہوں۔ ٹرانسسٹر کھڑکی پر رکھ کر وہ کارڈ پڑھنے لگا۔ میں درار سے جھانکتی رہی۔ کئی بار پڑھنے کے بعد اُس نے کارڈ بُش شرٹ کی جیب میں رکھ لیا۔ ٹرانسسٹر بند کر دیا اور دیوار سے پیٹھ لگا کے بیٹھ گیا۔ دو تین منٹ اسی طرح گُم سُم بیٹھے رہنے کے بعد اُس نے ہاتھ بڑھا کر ٹرانسسٹر کھڑکی سے اُتارا، دَن دن دن دن ایریَل اونچا کیا اور سوئی گھمانے لگا۔

تیسرے دن دوپہر کو سوتے میں مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے کہیں کوئی جھگڑا ہو رہا ہے اور کوئی رو رہا ہے لیکن میری نیند شاید زیادہ گہری تھی یا جھگڑا جلد ہی ختم ہوگیا۔ بہرحال مجھ پر اتنا اثر نہیں ہوا کہ اُٹھ بیٹھتی۔

شام کی چائے کے بعد حسب دستور ٹہلنے نکلی تو دو کلرک نما آدمی بھی دفتر سے نکل کر پیچھے پیچھے اِدھر ہی چلنے لگے۔ شہر کو جانے والی بس اسی سڑک کے نکڑ سے ملتی تھی۔

ایک بولا "مگر یار اتنا خفا ہونے کی بات تو نہیں تھی۔"

دوسرے نے کہا "بات کیوں نہیں تھی۔ جب سے اُس نے ٹرانسسٹر خریدا ہے، اپنے آپ کو نوکر ہی نہیں سمجھتا۔ ہر بات میں ہم لوگوں کی برابری کرتا ہے۔ دو کوڑی کا چوکیدار۔"

"پردو کوٹی کے چوکیدار نے کوئی میرا بابو سے بھیک مانگ کر تو خریدا نہیں تھا جو وہ کہنے لگے کہ جھکوا دوں گا"

"بھئی، تم کچھ جانتے بھی ہو، اس نے جھوٹ بول کر دفتر سے قرض لیا تھا کہ میری ماں بیمار ہے، مر رہی ہے ——— اور خرید لیا ٹرانسسٹر"

"نہیں، اُس کی کوئی بات جھوٹ نہیں ہے، اُس کی ماں تو بچپن ہی میں مر گئی تھی، میں جانتا ہوں، میرے ہی گاؤں کا ہے وہ، اُس کی بُوا نے اُس کو پالا تھا، اُسی کو ماں کہتا تھا۔ وہ مر بھی گئی۔ جس دن اطلاع آئی تھی وہ چٹھی میں نے ہی تو پڑھی تھی، پر اِس کو چھٹی ہی نہیں ملی کہ جاتا۔"

"مر گئی ہوگی، پر اِن بیٹا پر تو کوئی اثر ہے نہیں مزے میں باجہ بجاتے پھرتے ہیں۔ وہ بڈھا چوکیدار ہے نہ رام پرشاد، وہ کہتا تھا کہ یہاں رات کے گیارہ بجے تک ٹرانسسٹر بجتا ہے۔"

"کچھ بھی ہو، مجھے تو بڑا برا لگا، بے چارہ اتار دیا، آخر اس کا ٹرانسسٹر دفتر کے ایک کونے میں رکھا ہے تو بڑے بابو کا کیا جاتا ہے۔ وہاں کوٹھری میں وہ کہاں رکھے، کبھی چوری ووری ہو جائے تو ....."

"جب بچّو کے پاس رکھنے کا ٹھکانا نہیں تو خریدنے کو کیوں جی چاہتا ہے، کیوں شوق چرّاتا ہے۔"

پھر دونوں چپ چاپ چلتے رہے، یہاں تک کہ موڑ آگیا۔ وہ دونوں بس ملنے والی سڑک کی طرف مڑ گئے۔ میں گومتی کی طرف چلی۔ اچھا یہ بات ہے تو یہ گوپال پر اتنی ڈانٹ پڑ رہی تھی، اور وہ رو رہا تھا۔ ایکدم میرے ذہن میں اُس کی وہ بھولی صورت اور حسرت بھری آواز نہ آئی جب اُس نے کہا تھا "ہمار جی چاہت ہے، ہمار بنا لے جی چاہت ہے۔" اور پھر اُس شخص کی بات کہ جب رکھنے کی جگہ نہیں تو خریدنے کو کیوں جی چاہتا ہے۔ کیا آج تک کوئی اِس مسئلہ کو حل کر سکا ہے کہ جب انسان کا کسی چیز کو جی چاہتا ہے تو اسے یہ کیوں نہیں سوجھتی کہ وہ اس چیز کے لائق بھی ہے کہ نہیں، بس عقل بیچ کر وہ اپنے جی کی سی کرنے لگتا ہے، دُنیا کی ملامت، اپنوں میں رُسوائی، سماج میں بدنامی، خود اپنے لئے پریشانی، مصیبت — صرف اِس لئے کہ جی چاہتا ہے! جی چاہنے کی یہ داستان اتنی پرانی ہے جتنی حضرت آدم کی کہانی۔ پہلے تو اُن کا جی چاہا کہ ایک ساتھی ہو، سو بی بی حوّا کو پیدا کروایا، پھر جی چاہا تو کھٹ سے گیہوں کھا لیا، اچھے خاصے جنت میں رہتے تھے، بیٹھے بٹھائے یہ سارا جھنجھٹ کھڑا کروا دیا۔ پر کیا ہی عمدہ جھنجھٹ، بے مثال ہے بھائی ے واقعی اگر آدمی کا اُلٹی پلٹی چیزوں کے لئے جی نہ چاہا کرتا تو کہاں سے یہ ساری رونق آتی۔ فرشتوں میں رُسوائی ہوئی، خدا سے بُرے بنے، جنت سے نکالے گئے۔ اب یہاں رات دن سرکاری پیر پہیہ کرتے ہیں — پر جی میں جو ٹھانی تھی سو کر کے رہے! جی چاہنے کی یہ داستان بھی کتنی غمناک ہے، پر کیا ہی رنگین!

رات کو دفتر کے برآمدے میں روشنی نہیں ہوئی، لوگ ٹرانسسٹر سننے جمع نہیں ہوئے، غالباً سبھی بڑے بابو کے غصے سے سہم گئے تھے مگر گوپال اپنی بینچ پر سیدھا سیدھا لیٹا تھا، سینے پر ٹرانسسٹر رکھے وہ جگہ جگہ سوئی گھما رہا تھا۔ شکتی ملز پرووائیڈز فور یو..... محبت شہید ہوتی ہے .... لپٹن لاؤ جی ....، لاؤ جی لپٹن، ..... یہ آکاش وانی الٰہ آباد لکھنؤ.....

پھر ایک دن صبح ہی صبح پانچ بجے میں دروازے کھول رہی تھی کہ میں نے ایک بائیسکل دفتر کے دروازے میں گھستی دیکھی، اُس پر ایک سلیٹی شلوار اور کُرتا سوار تھا۔ کالی پگڑی لہرا رہی تھی، اوپر میلی، سنہری کلاہ تھی نیچے بھاری پشاوری چپلیں، ذرا سا اِدھر اُدھر جھانکنے کے بعد اُس نے بائیسکل موڑی اور نیلم کے کوارٹر کی طرف چلا گیا۔

شام کو میں نے بڑی سنجیدگی سے نیلم سے بات شروع کی "دیکھ نیلم، کتنی بار میں نے تجھکو منع کیا ہے کہ ان خان لوگوں سے قرضہ مت لیا کر، ایک کا چار جوڑتے ہیں، اور اُوپر سے ذلیل الگ کرتے ہیں، تجھ کو ضرورت پڑا کرے تو مجھ سے لے لیا کر —— دیکھ یہ ....."

اُس نے حیران ہو کر میرا منہ دیکھا "بیگم صاحب" ہمارے یہاں تو کسی نے خان سے قرضہ نہیں لیا ہے۔"

"پر وہ صبح صبح بائیسکل لئے تیرے کوارٹر کے سامنے کھڑا تھا میں نے خود دیکھا۔ تو اُس سے بات بھی کر رہی تھی"

وہ ہنسنے لگی" وہ تو ہم اُسے تڑی کر رہے تھے بیگم صاحب"

"کیا مطلب ؟" — میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ وہ گوپال کو ڈھونڈ رہا تھا، اُس نے ڈیڑھ سو روپیہ قرض لیا تھا نہ وہ ٹرانسسٹر لینے کے لئے"

"تو پھر کیا ہوا ؟"

"تو بیگم صاحب، خیریت گذری کہ وہ اُس وقت ہمارے کوارٹر میں بیٹھا تھا، بس ہمیں یہ سوجھی کہ فوراً اسے اندر کوٹھری میں کر کے احمد کے پلنگ پر لٹا کے چادر اُڑھا دی اور خان کو اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگا کے تڑی کر دیا۔"

"کیا تڑی کر دیا — وہ پھر آئے گا۔"

"جی ہاں آئے گا تو ضرور۔ اور آج بھی کیا کم گالیاں دے کے گیا ہے، یہی تو ہم نے بھی گوپال سے کہا کہ" بھیا تو فور کلاس کا آدمی، صاحب لوگوں کی طرح ٹرانسسٹر بجائے گا تو گالی کھائے گا ہی۔ اب دیکھئے پھر بجا رہا ہے ٹرانسسٹر۔"

میں نے نیلم کی طرف والی کھڑکی ذرا سی کھولی۔ باہر پڑی ہوئی جھلنگا چارپائی کے چاروں طرف محلے کے ڈھیروں بچے منہ کھولے کھڑے تھے۔ بیچ میں گوپال بیٹھا ٹرانسسٹر ہاتھ میں لٹکائے تھا جس پر گانے بج رہے تھے۔ اور گوپال کا جسم گانے کی تال پر آہستہ آہستہ جھوم رہا تھا۔

اسی رات کوئی دس بج چکے ہوں گے جو کہیں سے تار آیا۔ سب سو چکے تھے، میں نے اُٹھ کر تار لیا۔ دروازہ بند کر ہی رہی تھی کہ سامنے دفتر کے پھاٹک پر دو سائے دکھائی دئے — ایک اُونچا، چوڑا اور بھاری —— ایک چھوٹا، دُبلا پتلا - پھر بھاری سائے کی طرف سے ایک ہاتھ بڑھا اور دُبلے پتلے سائے کی گردن اُس کے پنجے میں آگئی۔ اور پھر گوپال کی دبی ہوئی بیچ "ارے بھیا، دئے دیں گے، دئے دیں گے"

نئیں تم کبھی ہمارا روپیہ نہیں دے گا، کبی نئیں دے گا، خو، چھپ جاتا ہے اَم کو دیکھ کے، خنزیر کا بچہ... اَم ابی یہ باجہ چھین لے گا۔ ابی ابی ....."

"کون ہے؟ کیا بات ہے ؟ یہ کون کوٹھی میں غل مچا رہا ہے۔" میں نے ایک آواز دی۔ حالانکہ ڈر کے

مجھے خود اپنی آواز کانپتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
ایکدم پنجہ الگ ہوگیا۔

گوپال کانپتا تھرتھراتا ہوا سا یہ ٹرانسسٹر کو سینے سے لگائے پیچھے ہٹنے لگا اور مجھے فوراً یہ خیال کہ اس وقت مجھے گوپال کو بچانا چاہیے۔ کیونکہ بات یہ ہے۔۔۔ کہ میں خود اپنے جی کے معاملے میں کافی بُزدل واقع ہوئی ہوں۔ اکثر میں نے اپنوں کی ملامت، دنیا کی رسوائی، سماج میں بدنامی اور خود کو پریشانی سے بچانے کے لئے اپنے جی کا خون کیا ہے۔ اسی لئے تو گوپال کے لئے میرے دل میں عزّت بڑھتی گئی تھی، ایک عجیب سا احساسِ کہتری مجھے اس کے سامنے محسوس ہوتا تھا — میں حاطے کی دیوار تک پہنچ گئی، ہاتھ بڑھا کر میں نے نیچی سی دیوار پر سے اُس کا ٹرانسسٹر میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور ذرا ڈپٹ کر بولی "دیکھو خان بھائی، یہ سرکاری نوکر ہے، کوئی چور بدمعاش نہیں ہے، ہم سبھی اس کو جانتے ہیں، تمہارا ردیہ لے کر بھاگ نہیں جائے گا۔"

خان بھائی نے ایک قہر کی نگاہ گوپال پر ڈالی، پھر مجھے اندھیرے میں جتنا بن سکا سر سے لیکر پاؤں تک گھورا، دیوار سے لگی سائیکل اُٹھائی اور چلا گیا۔ میں نے ٹرانسسٹر گوپال کی طرف بڑھایا، اُس نے ایکدم اُسے لے کے سینے سے لگا لیا اور فوراً اندر دفتر میں بھاگ گیا۔ اُس کے ہاتھ اس طرح کانپ رہے تھے جیسے شاید پرتھی راج کے ہاتھ کانپے ہونگے جب اُس نے اپنوں کی ملامت، دُنیا کی رُسوائی، سماج کی بدنامی اور اپنی پریشانی، کسی بات کی کچھ پرواہ نہ کر کے سنجوگتا کو اپنے سینے سے لگا کے تاریخ کی راہ پر اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑا دیا تھا۔

——— صرف اِس لئے کہ اُس کا جی چاہتا تھا۔

مہندر ناتھ

پاپ اور سزا

کھانڈیکر کو صرف اتنا یاد رہا کہ جب وہ تیزی سے قدم اُٹھاتا ہوا سڑک پار کرنے لگا تو اچانک ایک بھاری اور وزنی ٹرک کے نیچے آگیا تھا۔ اور اُس کی بائیں ٹانگ بُری طرح کچلی گئی تھی۔ اگر اس کا سر اِس ٹرک کے نیچے آجاتا تو وہ کب کا پرلوک سدھار جاتا۔ شاید ابھی اُس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ اس حادثے کے بعد جب اسے ہوش آیا۔ تو وہ جنرل وارڈ میں تھا۔ اُس کی بائیں ٹانگ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اُسے بتایا۔ جب زخم بھر جائیں گے تو اس کی ٹانگ پر پلاسٹر لگایا جائے گا اُس کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگا۔

اکیس دن تک وہ ہسپتال میں رہا۔ پلاسٹر لگوانے کے بعد وہ گھر آگیا۔ وہ ایک کھولی میں رہتا تھا۔ بیوی اور چار بچوں کے ساتھ۔ اِس کمرے میں وہ اکیلا نہ تھا۔ تین خاندان اور تھے۔ تینوں مراٹھی۔ کھانڈیکر دراصل پُونا کے ایک دُور افتادہ گاؤں سے آیا تھا۔ وہیں اُس نے شادی کی وہیں جُوتا گانٹھنے کا کام سیکھا۔ اُس کا باپ بھی یہی کام کرتا تھا۔ اور باپ نے مرنے سے پہلے سلائی کا سُوا، ہتھوڑی بیلیں، بُرش اور اِسی طرح اور دو چار چیزیں اُس کے حوالے کیں۔ یہی سرمایۂ حیات تھا۔ اُس کے باپ کا۔ ماں تو بچپن میں مر گئی تھی۔ اُس کی صورت سے بھی وہ ناآشنا تھا۔

گاؤں میں بہت کم لوگ جوتے پہنتے تھے۔ اکثر لوگ تو ننگے ہی گھوما کرتے تھے۔ مہنگائی اتنی بڑھ گئی تھی۔ کہ لوگ جُوتے خریدنے کی بجائے راشن خرید لیتے۔ شروع میں جتنا کماتا تھا۔ اُس سے گھر بار کا خرچا چل جاتا۔ جُونہی ایک بچّہ ہوا اُس کے اخراجات بھی بڑھے۔ جب دوسرا ہوا تو اِس گاؤں میں دو وقت کی روٹی کا ملنا مشکل ہوگیا۔ اِس لئے کھانڈیکر نے بمبئی کا رُخ کیا اور اِس بڑی تپھّروں والی بلڈنگ کے بڑے اندھیرے کمرے میں سات رُوپیہ ماہوار پر اِس چھوٹے سے پریوار کو رہنے سہنے اور کھانے پکانے کی جگہ مل گئی۔

یہاں آتے ہی اُس کی اچھّی خاصی آمدنی ہوگئی۔ اتنی آمدنی تو نہیں تھی کہ وہ کچھ بچا سکتا۔ پھر بھی اتنے رُوپے کما لیتا کہ پُورے خاندان کو دو وقت کا کھانا نصیب ہوجاتا۔ کھانڈیکر کام کاج کرنے میں کافی چیاق و چوبند تھا۔ اُسے یقین تھا کہ جب تک اُس کے بازوؤں میں طاقت ہے۔ وہ محنت مزدوری کر سکتا ہے۔ اور جب وہ بوڑھا ہوجائے گا۔ تو اُس کے بیٹے کمانے کے قابل

ہوجائیں گے۔ اِس حادثے سے پہلے وہ چار بچوں کا باپ تھا۔ پرماتما کی مہربانی صرف اتنی تھی کہ اُس کی بیوی نے چار لڑکے جنے تھے۔ اگر کوئی لڑکی ہوجاتی تو اُس کے جہیز کے لیئے رُوپے کہاں سے آتے۔ پرماتما بچوں کی بارش غریبوں پر زیادہ کرتا ہے امیروں پر کم۔ اِس لیئے غریبوں کو پرماتما پر زیادہ اعتماد رہتا ہے . . .

اِس حادثے نے اُسے کافی کمزور کردیا۔ ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے سے منع کر دیا تھا۔ گھر میں کوئی اور کمانے والا نہ تھا۔ اُس کی بیوی کو سوائے روٹی پکانے کے اور کوئی کام نہیں آتا تھا۔ بچاری کھانا بھی پکائے گھر کو بھی سنبھالے اور اب تو خاوند کی تیمارداری بھی کرنی پڑتی تھی۔ بیمار خاوند کو دوائیاں چاہئیں، اچھا کھانا.... گھر میں کوئی اور کمانے کے لائق نہ تھا۔ گھر میں جو تیس بتّیس رُوپے تھے وہ چند دنوں میں دوائیوں کی نذر ہوگئے۔ کم سے کم دو وقت کا کھانا تو ملنا چاہیئے۔ ورنہ انسان زندہ کیسے رہے؟ محض دو وقت کا کھانا کھانے کے لیئے اُس کی بیوی منوا نے فٹ پاتھ پر گلے سڑے پھل اور ترکاریاں بیچنی شروع کر دیں۔ منڈی میں جاکر وہ کچّے پکّے کیلے، ٹماٹر، بھنڈی، آلو اور توری خرید کر لاتی اور ایک گندا میلا سا کپڑا فٹ پاتھ پر بچھا کر اُن ترکاریوں اور کیلوں کو فروخت کرتی۔ راہگیروں کو کھانے اور پکانے کے لیئے سستے داموں چیزیں مل جاتیں۔ جو کچھ بچ جاتا منوا اُسے غنیمت سمجھتی۔ بے چاری اِن حالات میں اور کر بھی کیا سکتی تھی۔

اِس گندی کال کوٹھری میں رہ کر اِن چھ افراد کے کنبے کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ دُنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ ہندوستان کب آزاد ہوا؟ اُس کی تقسیم کب ہوئی۔ نہرو جی کب مرے۔ اور شاستری جی کی موت کیسے ہوئی اور نہرو جی کی بیٹی کیوں راج کر رہی ہے۔ دیس میں مہنگائی کیوں بڑھ گئی ہے۔ ہم اِس دیس میں کیوں پیدا ہوئے۔ کسی اور ملک میں پیدا ہوتے تو کیا ہوتا۔ کیا انسان اپنے ملک کی قسمت بدل سکتا ہے؟ کیا غریبوں کو دو وقت کا کھانا مل سکتا ہے؟ "سوشلسٹ پیٹرن آف سوسائٹی" کسے کہتے ہیں۔ ویل فیئر ریاست کا کیا مطلب ہے؟ کھانڈیکر نہ اخبار پڑھ سکتا تھا نہ اُس نے کبھی یہ پوچھنے کی کوشش کی کہ ان اخباروں میں کیا لکھا ہے اور اِن کے پڑھنے اور چھپنے سے کیا فائدہ ہے؟ وہ تو صرف یہ جانتا تھا۔ جس قسم کی زندگی وہ گزار رہا تھا وہ محض اُس کے پچھلے جنم کے کرموں کا نتیجہ تھی۔ اور جو پاپ اُس نے اس جنم میں کیئے ہیں اُس کی سزا اُس کو اگلے جنم میں ملے گی کھانڈیکر لیٹے ہوئے یہ سوچتا رہا۔ اِس جنم میں ابھی تک اُس نے کوئی پاپ نہیں کیا۔ اگلے جنم میں اُسے کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ پیٹ بھر کر کھانا ملے گا۔ جب کبھی وہ بیمار ہوگا تو ڈاکٹر علاج کے لیئے اُس کے گھر پر آئیگا رہنے کے لیئے اچھا مکان ملے گا۔ اُس کی بیوی اور بچّے خوبصورت کپڑے پہن سکیں گے۔

دراصل روزمرّہ کی جدوجہد اتنی سخت تھی کہ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کبھی کبھار کسی تہوار کے موقع پر باہر سے چند لوگ گانے کے لیئے بلوائے جاتے یہ گوّیے بھی دور افتادہ گاؤں سے آتے۔ ہارمونیم اور طبلے کی تھاپ پر وہ اپنی بھدّی اور بے سُری آوازیں بھجن گاتے۔ یہ بے ہنگم آوازیں، شور و غل سب کو اچھا لگتا۔ ساری رات گوّیے گاتے رہتے اور چال کے سب لوگ اِن گیتوں کو سُنتے۔ کبھی کبھی منوا دروازے کی اوٹ سے

اُس کی طرف دیکھتی اور مُسکرا کر پیچھے ہٹ جاتی۔ منّوا کی مُسکراہٹ اُسے بہت اچھی لگتی۔ نہ جانے کیوں...

لیٹے لیٹے وہ تنگ آ گیا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد تندرست ہو جائے۔ تاکہ وہ کام کاج کر سکے۔ بیچاری منّوا گھر کا بھی کام کرے۔ بچّوں کو بھی سنبھالے اور کمائے بھی۔ کب تک منّوا اسی طرح کام کرتی رہے گی۔ جوں جوں دن گزرنے لگے وہ اور دُبلا ہوتا گیا۔ پھر بخار اور کھانسی نے زور پکڑا۔ ڈاکٹر کو دکھایا تو پتہ لگا کہ بڑا روگ ہو گیا ہے۔ انجکشن لکھ کر دیئے اور دوسری دوائیں بتائیں۔ ساتھ ہی منّوا سے کہا۔" اسے وٹامن، دودھ، پھل اور تازہ ہوا کی سخت ضرورت ہے۔" اِن سب چیزوں کے لئے رُوپے چاہئیں، اتنے رُوپے کہاں سے آتے؟ بڑی مشکل سے دو وقت کا کھانا ملتا تھا اور کھولی کا کرایہ ادا ہو جاتا۔ دن بدن وزن گھٹنے لگا۔ بیماری بڑھنے لگی۔ اُس نے ایک بار اُٹھنے کی کوشش کی فوراً منہ کے بل گر پڑا۔ منّوا نے اُسے سہارا دیا۔

"کب تک سہارا دو گی منّوا؟"

"جب تک جان میں جان ہے۔"

"منّوا، اب اِس دنیا میں رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ تم کب تک محنت مزدوری کرتی رہو گی۔ میں تو اب بالکل بوجھ بن گیا ہوں۔"

"فکر نہ کرو۔ جب اچھے ہو جاؤ گے تو پھر کمانا۔"

"نہیں منّوا، میرا دل کہتا ہے، یہ بیماری میرا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اِس بیماری کا کوئی علاج نہیں منّوا۔ اب پرماتما مجھے اِس دھرتی سے اُٹھا لے تو....."

"یہ نہ کہو.... نہ نہ.... ایسی باتیں نہ کرو۔ پرماتما کے لیے ایسی باتیں مت کہو....!"

یہ کہہ کر منّوا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کھانڈیکر کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ بچ نہیں سکتا۔ شاید مرنے والے کو اپنی موت کا پتہ چل جاتا ہے۔ اب تو بڑا بیٹا بھی اُس سے آ کر پوچھتا۔

"بابا تم کام پر کب جاؤ گے؟"

"جلدی جاؤں گا بیٹے!"

"بابا میں نے کتنے دنوں سے میٹھی گولیاں نہیں کھائیں!"

"اچھا ہو جاؤں تو لا کر دوں گا۔"

اتنے میں دوسرا لڑکا آ کر کہتا "بابا تم ہر وقت کیوں لیٹے رہتے ہو؟" دراصل بچّے بھی حیران تھے کہ اُن کے بابا کو کیا ہو گیا تھا۔ وہ گھر میں کیوں لیٹا رہتا ہے باقی بچّوں کے باپ تو روز کام پر جاتے تھے۔ انہیں کے بابا کام پر نہیں جاتے۔ اُن کی زندگی میں خوشی کے لمحات کیوں نہیں آتے۔ وہ برف کا گولا نہیں کھا سکتے کوئی کھلونا نہیں خرید سکتے۔ جھولے پر نہیں بیٹھ سکتے۔

کھانڈیکر نے آج رات محسوس کیا کہ جیسے یہ اُس کے جیون کی آخری رات تھی۔ وہ چاروں بچّوں کو اپنے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر نے منع کیا تھا کہ کوئی بچّہ باپ کے ساتھ نہ سوئے، اُس کا جھوٹا کھانا نہ کھائے۔ اُس کے برتن استعمال نہ کرے۔ نہیں تو بچّوں کو بھی ٹی۔ بی ہو جائے گی۔

رات کیسے کٹی اُس کا اندازہ کھانڈیکر ہی کو تھا۔ صبح ہوتے ہی اُس نے اپنے آپ کو بہت کمزور پایا۔ بڑی مشکل سے وہ سانس لے رہا تھا۔ اور کھانسی نے اتنا

زور پکڑا کہ پسلیوں میں درد ہونے لگا۔ اُس نے اپنے جسم پر نگاہ ڈالی۔ بس ہڈیوں کا ڈھانچہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اب تو سبکے چہرے دُھندلے دُھندلے نظر آنے لگے۔ وہ اپنے بچّوں کو اپنے قریب بلانا چاہتا تھا۔ آخری بار اُن کی صورت دیکھ لے۔ وہ منّو اسے کہنا چاہتا تھا۔ پگلی میں تو تمھاری محبّت کا صلہ کبھی نہ دے سکا۔ میں تو پچھلے جنم کے پاپوں کی سزا بھگتنے آیا تھا۔ تو نے کیوں میرا ساتھ دیا۔ اب اگلے جنم میں ......، اُس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ کیا مرنے سے پہلے لوگ روتے ہیں؟ اب آنکھوں کی بینائی کم ہو رہی تھی۔ دل بیٹھ رہا تھا کمزوری اور بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ نہیں ہلا سکتا تھا۔ اُس نے بڑی ہمّت کر کے چاروں طرف دیکھا۔ اُس کے سرھانے اُس کا چھ سال کا لڑکا کھڑا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بوٹ اور پالش کی ڈبیہ تھی۔

"بابا! اب تم کام پر نہ جانا۔ آج سے میں کام پر جاؤں گا۔ اُس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ اُس کے کان بند ہو رہے تھے لیکن ذہن ابھی تک مُردہ نہیں ہوا تھا۔" میں نے پچھلے جنم کے گناہوں کی سزا بھگت لی۔ اب تیری باری ہے بیٹے!"

اُس کا دل ڈوبنے لگا۔ ایک ہچکی آئی اور اُس کا سر لُڑھک گیا۔

اُس کا بڑا لڑکا باہر فٹ پاتھ پر بیٹھا ایک آدمی کے جُوتے پر پالش کر رہا تھا ......!

پرکاش پنڈت

جمع، تفریق، ضرب، تقسیم

مہکتے جھاگ سے بھرے باتھ ٹب میں پہلے اس کی ایک ٹانگ اتری پھر دوسری اور پھر سونا رنگ مچھلی کی طرح ایک پورے جسم نے غڑاپ سے غوطہ لگا دیا۔

ابھی صبح کے صرف آٹھ بجے تھے۔ اور گیجو بھائی کا فون آنے میں پورا ایک گھنٹہ باقی تھا۔ کپڑے پہننے اور میک اپ کرنے میں اگر اسے کچھ دیر ہو گئی تو بھی گیٹ وے آف انڈیا پہونچنے کی بجائے وہ سیدھی گیلارڈ پہونچ سکتی تھی۔ جہاں ٹھیک نو بجے انہیں بریک فاسٹ لینا تھا ——— لیکن نہیں، باتھ ٹب کی مرمریں دیوار سے اپنی مرمریں پیٹھ ٹکاتے ہوئے اس نے سوچا، کم از کم آج ہر بات طے شدہ پروگرام کے مطابق ہونی چاہیئے۔ ٹھیک نو بجے گیجو بھائی کا فون سننا چاہیئے۔ ٹھیک سوا نو بجے گیٹ وے آف انڈیا پہونچ کر اپنی گاڑی واپس کر کے گیجو بھائی کا انتظار کرنا چاہیئے۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے گیلارڈ میں بریک فاسٹ، گیارہ بجے سے ڈیڑھ بجے تک گیجو بھائی کیلئے اس کے من پسند تحفوں کی شاپنگ، دو بجے نٹ راج میں لنچ، میٹرو میں چار بجے کا شو، پھر بادبانی کشتیوں کی سیر۔ ہینگنگ گارڈن میں ناز ریستوران کی کھلی چھت پر کافی کے ہلکے ہلکے گھونٹ کے درمیان ہمیشہ ایک دوسرے کا وفادار رہنے کی قسمیں اور پھر سانتا کروز کا ہوائی اڈہ ——— ہوائی بوسے اور اس وقت تک ہوائی جہاز پر نظریں جمائے رکھنا جب تک اس کی ٹمٹماتی ہوئی سبز اور سرخ روشنیاں بحرۂ عرب کے کالے پانیوں کے اوپر اندھے آسمان میں نہیں ڈوب جاتیں۔

اپنے دوستوں سے ہمیشہ اپنے کمزور حافظے کی شکایت کرنے والی مس بیلا بگیری والا کو آج کے پروگرام کی ہر چھوٹی بڑی تفصیل یاد تھی۔ یہ بھی یاد تھا کہ آج اسے اسکرٹ یا ساڑھی کے بجائے وہ الٹرا ماڈرن چست جمپرا ور پاجامہ پہننا ہے۔ جسے پہن کر عورت، عورت کے بجائے نشے کی بند بوتل دکھائی دیتی ہے۔ بالوں کی اجنتائی وضع کے لئے ان میں کہاں کہاں اور کتنے پن اڑسنے ہیں کس پنسل اور کن آئی پوڈروں کی مدد سے آنکھوں کا شیڈ بدل کر انہیں کاغذی باداموں کی شکل دینا ہے۔ اور ارغوانی لپ اسٹک اور ہمرنگ ڈیلالہ سینڈلوں کا انتخاب تو اس نے رات سونے سے پہلے ہی کر لیا تھا۔ حالانکہ ہوٹل گرین میں راجندرن کے ساتھ ڈیڑھ بجے رات تک اسکاچ دھنوں پر تھرکنے سے اس کی پنڈلیاں بے طرح اینٹھ گئی تھیں۔ اور رانیں شل ہو گئی تھیں۔ اور شیمپین کی غنودگی اسے بار بار بیڈروم کی طرف گھسیٹ رہی تھی۔

باتھ روم کے کلاک نے سوا آٹھ بجنے کا اعلان کیا تو وہ تڑپ کر ٹب سے باہر نکل آئی۔ اور اس کے جسم پر سے چاندی کا تیز سیال تیرا اترنے لگا۔ قد آدم آئینے پر نظر پڑی تو اس نے جلدی سے شاور ہاتھ کھول دیا اور اپنے مثالی جسم کو پانی کی نیم گرم پھوار کے خیمے میں چھپا لیا ——— اس کا جسم واقعی مثالی تھا کیونکہ اس کا اقرار اس کے سبھی دوستوں کے علاوہ خود گیجو بھائی بھی کئی بار کر چکا

تھا۔ اور یہ اقرار بے حد ضروری تھا کیونکہ گیجو بھائی کے ساتھ عنقریب اس کی شادی ہونے والی تھی۔ اور گیجو بھائی کا بوڑھا باپ بمبئی، احمدآباد اور سورت کے کئی کارخانوں کا مالک تھا۔

کچھ کارخانوں کا مالک تو مس بیلا بیکری والا کا باپ بھی تھا لیکن وہ کارخانے کم اور بیکریاں زیادہ تھے اور اسی لئے اس نے اپنی چہیتی بیٹی مس بیلا بیکری والا کو پوری پوری آزادی دے رکھی تھی۔ کہ وہ رومانس تو جا ہے جس تس سے کرے لیکن شادی ایسے کسی ایسے بچے، بوڑھے، یا جوان سے کرنی ہوگی جس کی بیکریاں ڈبل روٹیوں کے بجائے سوت یا فولاد اگلتی ہوں۔ اور ایک فرماں بردار بیٹی کیطرح مس بیلا بیکری والا نے اپنے نصف درجن عاشقوں کے بعد بڑی دیانت داری سے بھنگے اور رنڈوے گیجو بھائی کا انتخاب کیا تھا۔ اور اب جبکہ گیجو بھائی بزنس کے اور زیادہ اسرار و رموز سیکھنے کے لئے یورپ جا رہا تھا تو مس بیلا بیکری والا اس کی ڈیڑھ ٹانگ پر اپنے مثالی جسم کی پٹی باندھ دینا چاہتی تھی۔ کیونکہ اس کے جہاندیدہ باپ نے اسے سمجھا دیا تھا کہ یورپ کی لڑکیاں بھنگے اور رنڈوے ہندوستانیوں کو بطور خاص پسند کرتی ہیں۔ آج کا پروگرام مرتب کرنے میں بھی اس نے بیٹی کی پوری پوری مدد کی تھی۔ اور یہ نکتہ بھی ذہن نشیں کرا دیا تھا کہ موقعہ نکال کر وہ گیجو بھائی سے شادی کے بعد ہونیوالے اپنے بچوں کا ذکر ضرور کرے گی۔

بچوں کے ذکر کا خیال آتے ہی مس بیلا بیکری والا نے شادر ہاتھ کی چکری گھما دی اور اپنے سنہری جسم پر چمکتے موتیوں کو دبیز تولئے میں جذب کرنے لگی۔ اب ساڑھے آٹھ بج چکے تھے۔ اور ابھی اسے پورے کپڑے پہننے تھے اور پورا میک اپ کرنا تھا ——— لیکن بچوں کا ذکر، اس نے سوچا، بریک فاسٹ کی میز پر تو ہرگز نہیں کیا جا سکتا۔ شاپنگ کے وقت بھی ممکن نہیں۔ بیچ پر تو یہ ذکر ایسا رہے گا جیسے چکن کری، یا بریانی کا ذکر ہو رہا ہو۔ اور میٹرو کی فلم کے بارے میں تو جلی حروف میں چھپ چکا تھا کہ فلم صرف بالغوں کیلئے ہے ——— رہی بادبانی کشتیوں کی سیر، تو تجربہ شاہد تھا کہ اس وقت سمندری لہروں کے جھکولے سوائے ہنسنے اور چیخ چیخ کر ایک دوسرے سے لپٹنے کے اور کسی بات کی مہلت نہیں دیتے البتہ ——— اور اسی البتہ کے مطابق جب وہ ہینگنگ گارڈن میں ناز ریستوران کی کھلی چھت پر بیٹھے تھے اور میرین ڈرائیو کی قوس دودھیا قمقموں سے جگمگا رہی تھی اور نیم چاند کا ہالہ ناریل کے ایک پیڑ کی شاخ میں ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح سے کھیل رہے تھے۔ کہ اچانک پہلا بچہ پیدا ہو گیا۔

بچے کی پیدائش پر ایسے ایسے جشن منائے گئے۔ کہ بمبئی کے سارے بزنس مین انگشت بدنداں رہ گئے۔ پھر بچہ ہمکنے لگا اور ہمکتے ہمکتے ایک برس کا ہو گیا۔ اور اس کے لئے اٹلی سے کھلونے اور بنکاک سے فراک منگوائے گئے۔ گھٹنوں کے بل چلنے لگا تو کمروں کے قالین بدل گئے باقاعدہ انٹرویو کے بعد درجن بھر آیاؤں میں سے اس اطالوی آیا کا انتخاب کیا گیا جس نے اپنی بے داغ نسل کے ثبوت میں درجن بھر سندیں پیش کی تھیں۔ پڑھائی کے لیے کسی کنڈر گارڈن میں بھیجنے پر چونکہ ممتا کی ماری ماں کسی طرح راضی نہ ہوتی تھی۔ اس لیے نرم مزاج تجربہ کار ٹیوٹروں کا انتظام بھی گھر پر کر دیا گیا تھا۔ اور بچہ رفتہ رفتہ پروان چڑھنے لگا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ گیجو بھائی کی شیورلے گاڑی ہینگنگ گارڈن سے نکل کر مالا بار ہل کی ڈھلوان پر اترنے لگی۔ اور جب گاڑی میرین ڈرائیو کے اس مقام پر پہونچی جہاں چوپاٹی کے جگمگاتے ریتیلے میدان میں چاٹ اور دہی بھلوں کی چوبی دکانیں سجی ہوئی تھیں۔ تو بچہ پورے چھ برس کا ہو چکا تھا۔

"فدا رو کو" بیلا بیکری والا نے اپنا اجنتائی سر گجو بھائی کے کندھے پر سے اٹھاتے ہوئے نئی نئی حاملہ عورت کے لہجے میں کہا "میں چھاٹ کھاؤں گی"۔

چاٹ شاید زیادہ چٹ پٹی نہیں تھی کیونکہ ایک دو تھے کھا کر ہی بیلا بیکری والا نے پتہ ایک طرف اچھال دیا۔ اور پھر ایکدم ٹہکے لگاتی ہوئی گجو بھائی کے بازو سے جھول گئی۔ کیونکہ زمین پر گرتے ہی چاٹ کا وہ پتہ چھ برس کے ایک ننگ دھڑنگ بچے نے جھپٹ لیا تھا۔ اور اسی عمر کے کئی اور ننگ دھڑنگ بچے بڑی حسرت سے اسے پتہ چاٹتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

قاضی عبدالستار

ماڈل ٹاؤن

کانٹے دار تاروں کی گھنی باڑھ دیکھ کر راستہ بھول جانے کا احساس ہوا۔ اس نے مڑ کر دیکھا "ڈی بلاک" کی یکساں یک رنگ چہار منزلہ عمارتوں کا جنگل کھڑا تھا۔ دروازوں دریچوں اور بالکونیوں میں کھڑے ہوئے ننھے بچے دور سے رنگ برنگ پھولوں کے گچھوں کے مانند نظر آ رہے تھے۔ وہ آدھی عمارت کا چکر کاٹ کر سڑک پر آ گیا۔ بس اسٹینڈ پر کھڑی ہوئی مسافروں کی لانبی قطار دیکھ کر اس نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی۔ کہ دو مہینے ہو گئے سڑک ناپتے ہوئے لیکن راستوں کا سبق یاد نہ ہوا۔ بس نظر آتے ہی ٹیڑھی میڑھی لکیر اکبری دوہری اور پھر تہری ہو گئی۔ انسانوں کا ایک سیلاب اترنے والوں کو دھکیلتا ہوا دروازے میں دھنسنے لگا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ مٹھیاں بند ہو گئیں اور ہونٹ بھنچ گئے۔ جب ہوش آیا تو وہ بس کے اندر تھا۔ نگاہ سیٹ کی تلاش میں جھپٹ رہی تھی۔ کہ کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ تعلیم اور حشمت سے مطمئن ہو کر پہلو میں بیٹھے ہوئے آدمی کو دیکھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ انجن کے شور سے پس منظر میں اس نے اپنی آواز سنی۔ "ارے آپ؟ .... ریاض بھائی"

اور سڑک پر بھاگتی ہوئی بسوں کی طرح اس کے ذہن میں خیالات اڑنے لگے۔

وہ اپنی ہونے والی بیوی غزالہ کو دیکھ کر اور پسند کر کے واپس آیا تھا۔ کہ کسی نے اس کے کان میں کہا۔ غزالہ کی شادی اس کے ماموں اعجاز صاحب ایم پی کر رہے ہیں۔

"تو آپ نے پہچان ہی لیا........ ورنہ"

اور جہیز میں تم کو چار سو روپے کی نوکری دے رہے ہیں۔ اور یہ پاپڑ وہ اس لئے بیل رہے ہیں کہ غزالہ ان کے گھر میں رہتی ہے۔ جو ان کی بیوہ بہن کی بیٹی اور ضدی بیٹے ریاض کی محبوبہ ہے۔ غزالہ اکیلی ڈولی میں سوار نہ ہو گی۔

"دلی میں تو لوگ آنکھوں سے پہچان لیتے ہیں۔ لیکن زبان سے اجنبی بن جاتے ہیں۔"

غزالہ کے ساتھ اس کی ماں کے سر کا پہاڑ اور اعجاز صاحب کے دل کا بوجھ بھی کوٹھی سے نکل کر ڈولی میں بیٹھ جائے گا۔

"آپ کب تشریف لائے۔؟"

اور ریاض کی شادی کے راستے پر کھڑا ہوا بنی پھاٹک آپ ہی آپ کھل جائے گا۔ اس نے بھاری بھرکم اور گوری چٹی غزالہ کو گھور کر دیکھا تو اس کے گالوں پر ریاض بھائی کے ہونٹوں کی مہریں لودینے لگیں۔ کہ یہ ریاض بھائی کی باہوں کے نشان ابھر آئے۔

"میں تو کئی روز سے یہاں ہوں"

لیکن جیب کی بیماری سے نجات پانے کے لئے اس نے غزالہ کو قبول کر لیا۔ مسلسل بیکاری سے نجات پانے کے لئے اس نے شادی کر لی۔ کڑوی کسیلی دوا کا لبریز پیالہ آنکھیں بند کر کے نگل لیا۔

"کہاں قیام ہے آپ کا؟"

پھر اعجاز صاحب کی سفارش نے اسے دو کمروں کا فلیٹ بھی دلا دیا۔ جس دن اس کو فلیٹ ملا اسی کے چند روز بعد وہ غزالہ کو لے آیا۔

"یہیں ماڈل ٹاؤن میں!"

پورے دو مہینے بھی نہیں ہوئے غزالہ کو دلی آئے اور

"اچھا"

اور ریاض بھائی بیقرار ہو گئے، بے چین ہو گئے۔

"شام کو پانچ بجے آپ ریگل کے سامنے مل رہے ہیں۔"

"جی"

ایک دھچکے کے ساتھ بس رک گئی۔ ریاض بھائی کھڑے ہو گئے۔ اور مسافروں کی رینگتی ہوئی قطاروں میں گم ہوتے ہوئے چیخے۔ "آج پانچ بجے ریگل کے سامنے۔"

آفس سے نکلتے ہوئے اس نے تیواری سے دس روپے قرض مانگ لئے۔ دس بارہ اس کی جیب میں پہلے سے پڑے تھے وہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا ریگل تھیٹر کے سامنے آ گیا۔ گھڑی پر نگاہ کی پانچ بج رہے تھے سارے منظر پر دھند کا باریک نقاب پڑا تھا تیز ہوا کی ٹھنڈک کپڑوں سے چھنتی ہوئی ہڈیوں میں پیوست ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے اپنے نئے گرم کوٹ کا کالر کھڑا کر لیا۔ اور کلائیوں تک ہاتھ جیبوں میں ڈبو لیئے۔ سامنے آدمیوں کا جو سیلاب سا بہہ رہا تھا۔ سب اسی طرح آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ جیسے سب کی کوئی گاڑی پکڑنا ہو۔ اور دیر ہو چکی ہو۔ جیسے شکاریوں کو دیکھ کر سرمائی پرندوں کے پرے جھیل پر اترنے کا ارادہ ملتوی کر دیں۔ اور نکلتے ہوئے نکل جائیں۔ اینٹیں ڈھونے والے ٹھیلوں کی طرح زندگیوں سے بھری ہوئی بسیں گذرتی رہیں۔ ریل گاڑی کے ڈبوں کی طرح ایک دوسرے کے پیچھے لگے ہوئے موٹروں کی قطاروں کے درمیان سے لوگ ایسے نکل رہے تھے جیسے ہاکی کا کھلاڑی دشمن ٹیم کو ناچ دیتا ہوا گول تک پہونچتا ہے۔

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور چونک پڑا۔ چھ بج چکے تھے۔ اور آوازوں کا سناٹا گہرا ہو گیا تھا۔ رنگینیوں کا سیلاب چڑھ آیا تھا۔ اور وہ ریاض بھائی کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ اس نے سوچا ریاض بھائی سینما دیکھنا چاہتے ہوں گے ورنہ ریگل کی شرط کیوں لگاتے۔ اگر اس نے ٹکٹ نہ خریدا تو ریاض بھائی اس کو .... غزالہ کے شوہر کو مفلس خیال کریں گے کنجوس سمجھیں گے۔ یہ خیال آتے ہی وہ لپکتا ہوا بکنگ ونڈو کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس شو کا آخری ٹکٹ خریدا اور فلم شروع

ہونے کے بعد ہال میں داخل ہوا۔

"جن من گن" کے شروع ہوتے ہی وہ ہال کے باہر آگیا۔ آسمانی سوٹ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ڈھونڈھتا رہا۔ جب تیسرے شو کی گھنٹی بج گئی تب وہ ریگل کے باہر نکلا۔ دھند کے بھاری نقاب کے نیچے ٹمٹماتی روشنیاں کتنی اداس اور بیمار نظر آرہی تھیں۔ سماعت کے تھپیڑے اڑاتے والے کے شور میں کیسی دلدوز خاموشی پنہاں تھی۔ اداس وقت اس کے ماتھے سے قطرہ قطرہ ٹپکے جارہا تھا۔ اور وہ بس اسٹینڈ کی طرف بھاگ رہا تھا۔

بس آگئی۔ "کیو" ٹوٹ کر "ڈبلیو" بن گیا۔ اس نے بھی اپنے آپ کو بھیڑ میں دھکیل دیا۔ پائدان پر پاؤں رکھتے ہی احتیاط کے طور پر کنڈکٹر سے پوچھا۔

"یہ کس نمبر کی بس ہے"

"آپ کو کہاں جانا ہے"

کنڈکٹر نے سوال پر سوال جڑ دیا۔

"ماڈل ٹاؤن"

"تو پیسے نکالو"

اس نے پانچ کا نوٹ پکڑا دیا۔

کنڈکٹر نے بہت سی ریزگاری کے بوجھ سے چرمرایا ہوا ٹکٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس نے مٹھی کو سنبھال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں الٹ لیا۔ اور پیچھے سے دھکا کھا کر بغیر ارادے کے آگے بڑھ گیا۔ پھر گوشت کی دیواروں میں پھنس گیا۔ بس چلتی رہی۔ بڑی دیر تک چلتی رہی۔ جتنے مسافر اترے ان سے زیادہ چڑھتے رہے۔ اور وہ گھڑی کے پنڈولم کی طرح آگے پیچھے ہوتا رہا۔ پھر کنڈکٹر نے صدا لگائی۔ جس کے انتظار میں وہ بوڑھا ہوا جا رہا تھا۔

"ماڈل ٹاؤن"

وہ دھکے کھاتا اور کھلاتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کہر کے سمندر میں پھاند پڑا۔ سفید دھواں سا انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اور کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ سڑک کی روشنیاں پکڑے ہوئے جگنوؤں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ بھی دوسرے مسافروں کے ساتھ کڑھتا ہوا آگے بڑھا۔ اپنے اطمینان کے لئے ایک شخص سے پوچھنے لگا۔

"بھائی صاحب یہ ماڈل ٹاؤن ہے؟"

"ہاں ہاں آپ کو کہاں جانا ہے۔"

"ڈی بلاک"

"تو آگے جا کر داہنے ہاتھ گھوم جائیے۔

وہ خوش ہو کر کہر کے سمندر میں تیرنے لگا۔ پھر وہ پیٹرول ٹنکی آگئی جس کی پشت سے اس کے بلاک کو راستہ جاتا تھا۔ پھر لوہے کا پھاٹک بھی آگیا۔ اب دھند کی چادر زمین ہو گئی تھی۔ آب رواں کے مانند۔ اور وہ چہار منزلہ عمارت کے صحن میں تھا اس نے پہلا زینہ چھوڑ دیا۔ دوسرا زینہ آیا۔ اس کے پاس ہی سفیدی کا ڈرم پڑا تھا۔

وہ گھر پہونچنے کی خوشی سے چھلک اٹھا۔ سیڑھیاں چڑھ کر تیسری منزل پر پہونچ گیا جو تھے دروازے پر استغانہ صاحب کی نیم پلیٹ لگی ہوئی تھی۔ اپنے دروازے کے سامنے پہونچتے ہی اس پر جیسے بجلی گر پڑی۔

ایک پٹ آدھے سے زیادہ کھلا ہوا تھا۔ برآمدے کا بلب روشن تھا۔ اور نل کے نیچے ریاض بھائی کھڑے تھے آسمانی سوٹ پہنے اس کی طرف پشت کیئے ہاتھ دھو رہے تھے۔ پاس ہی کچن میں غزالہ اسٹوو کے سامنے کھڑی تھی۔ سرخ شال کے دونوں کنارے اس کی پیٹھ پر برابر سے پڑے تھے۔ آٹا پیسنے والے انجن کی طرح اسٹوو دھڑ دھڑا رہا تھا اور غزالہ کا سفید تندرست ہاتھ فرائی پان میں چمچہ چلا رہا تھا۔ لاہی رنگ کی اسی ساری میں وہ صبح چھوڑ گیا تھا۔ اور جیسے اس کے پیروں میں کسی نے کیلیں ٹھونک دیں۔ وہ جم کر رہ گیا۔ پھر ریاض بھائی نے نل پر پڑی ہوئی نیلی تولیہ اٹھائی۔ اور منہ پونچھنے کچن میں گئے۔ اور غزالہ کے بھاری کولھے پر ایک دھپ لگا دی۔ اب وہ برداشت نہ کر سکا اور تیز تیز قدم رکھتا زینے پر آگیا۔

" تو یہ ہیں...... ریاض بھائی "

" سستے رومانی ناولوں کے ہیرو "

" مجھے ریگل بلا لیا۔ تاکہ میں دفتر سے گھر نہ آسکوں۔ ان کا انتظار کرتے کرتے فلم دیکھنے لگوں اور وہ فلم کے ہیرو کا پارٹ ادا کریں۔ "

" اور غزالہ "

" غزالہ بھی ہیروئین ہوئی...... تو گویا کہ میں رقیب ہوں "

" بچپن کی محبت پتھر کی لکیر ہوتی ہے۔ ہیرے بھائی...... تم تو غزالہ کے قانونی داشتہ ہو۔ تمہارے ہونٹوں پر چار سو روپے ماہوار کی مہر لگی ہوئی ہے۔ "

" لیکن یہ دروازہ ؟ "

" جرم کا بھانڈا تو آخر کسی طرح پھوٹنا ہی چاہیئے تھا "

" یا جھوٹی گندی معصومیت کے لنگڑے اظہار کے لیئے اب کھول دیا ہو۔ "

" اچھی بات ہے "

" اس نے اپنی باقاعدہ تلاشی لی۔ لیکن اس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ ہاتھ کی چھڑی تک نہ تھی۔ اگر چاقو مجھے مل جاتا تو اس ڈرامے کو انجام تک پہونچا دیتا "

"اب میں کیا کروں"

"کیا کر سکتا ہوں آخر"

"تم یہیں کھڑے رہو وہ اسی طرف آئے گا۔ تم اس کو زینے پر سے دھکا دے سکتے ہو۔" پھر اس نے دیکھا جیسے ریاض بھائی کا سر پھٹ گیا ہو۔ اور وہ خون میں لت پت فرش پر ڈھیر ہوں۔ اس نے اپنے دل کے زخم میں ٹھنڈک محسوس کی۔ پھر زینے پر قدموں کی چاپ ہوئی۔ کوئی سیڑھیاں چڑھتا اسی طرف آ رہا تھا۔ اس نے سانس روک لی اور پرچھائیں کی طرح دیوار سے چمٹ گیا۔ آنے والا پہلے ٹھٹکا پھر اس کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا۔

"کون؟"

"تم کون ہو؟"

"جی......... م......... میں"

موٹے موٹے رسّوں کی طرح دو باہیں اس کی کمر سے لپٹ گئیں۔ پھر جیسے دیواریں توڑ کر آدمی نکل آئے۔ کھڑکیوں اور دروازوں سے انسان ابلنے لگے۔ اور وہ آوازوں کے زہریلے آبشار میں شرابور ہو گیا۔ دھاردار آوازوں کے زخموں سے لہولہان ہو گیا۔ اب وہ روشنی کی چادر کے نیچے کھڑا تھا۔ کئی جوڑا آنکھیں اسے گھور رہی تھیں۔ آوازیں اپنی گزشتہ چوریوں کی تفصیل سنا رہی تھی۔ آوازیں اس کو شناخت کرنے کا دعویٰ کر رہی تھیں۔ اور آوازیں ایک ساتھ اس سے متضاد سوالات کر رہی تھیں۔ پھر اس نے اپنی گڑگڑاتی ہوئی آواز سنی۔

"یہ ۳/۱۱ فلیٹ میرا ہے......... اس میں میری بیوی موجود ہے"

"ابے پاگل ہو گیا ہے......... اس میں تو میں رہتا ہوں"

اس نے تڑپ کر دیکھا ایک آدمی آسمانی سوٹ پہنے گالیاں برساتی آنکھیں کھولے اس کو سارا سموچا نگل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور مردوں کے غول کے پیچھے ایک بھاری بھرکم گدری جسم عورت لاہی رنگ کی ساری باندھے اور سرخ شال اوڑھے پلکیں جھپکا رہی تھی۔ تحیّر اور بے بسی کا فوّارہ اس کے منہ سے پھوٹ پڑا۔

"یہ ماڈل ٹاؤن نہیں ہے؟"

"ہے"

"لیکن کون سا ماڈل ٹاؤن؟"

"ماڈل ٹاؤن کیمپ!" ———— "نہیں یہ ماڈل ٹاؤن کینٹ ہے"

اس نے گڑگڑا کر اپنا آفس بیگ اس بوڑھے آدمی کے قدموں میں ڈال دیا۔ جس کی آواز مہربانی کے صیقل سے روشن تھی۔ ●●

ندا فاضلی

سات نظمیں

ایک لڑکی

وہ شوخ شوخ نظر سانولی سی اک لڑکی
جو روز میری گلی سے گذر کے جاتی ہے
سُنا ہے وہ کسی لڑکے سے پیار کرتی ہے
بہار ہو کے تلاشِ بہار کرتی ہے
نہ کوئی میل نہ کوئی لگاؤ ہے لیکن
نہ جانے کیوں!
بس اسی وقت جب وہ آتی ہے
کچھ انتظار کی عادت سی ہوگئی ہے مجھے
اک اجنبی کی ضرورت سی ہوگئی ہے مجھے
مرے برانڈے کے آگے یہ پھوس کا چھپّر
گلی کے موڑ پہ اکھڑا ہوا سا اک پتھر
یہ ایک جھکتی ہوئی بدنما سی نیم کی شاخ
اور اس پہ جنگلی کبوتر کے گھونسلے کا نشاں
یہ ساری چیزیں کہ جیسے مجھی میں شامل ہیں
مرے الم میں مری ہر خوشی میں شامل ہیں
میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی یونہی گزرتی رہے
ادا و ناز سے لڑکے کو پیار کرتی رہے

بے خواب نیند

نہ جانے کون وہ بہروپیا ہے
جو ہر شب!
مری تھکی ہوئی پلکوں کی سبز چھاؤں میں
طرح طرح کے کرشمے دکھایا کرتا ہے
لپکتی سُرخ لپٹ،
جھومتی ہوئی ڈالی
چمکتے تال کے پانی میں ڈوبتا پتھر
اُبھرتے پھیلتے گھیروں میں تیرتے خنجر
اُچھلتی گیند، ربر کی، سدھے ہوئے دو ہاتھ
سُلگتے کھیت کی مٹّی پہ ٹوٹتی برسات
عجیب خواب ہیں یہ!
بنا وضو کیے سوئی نہیں کبھی میں تو....
میں سوچتی ہوں کسی روز اپنی بھابی کے
چھنکتے پاؤں کی پازیب توڑ کر رکھ دوں
بڑی شریر ہے ہر وقت شور کرتی ہے
کسی طرح سہی بے خواب نیند تو آئے
گھڑی گھڑی کی مصیبت سے جان چھُٹ جائے
نہ جانے کون وہ بہروپیا ہے

دو کھڑکیاں

آمنے سامنے دو نئی کھڑکیاں
جلتی سگرٹ کی لہراتی آوازیں
سوئی ڈورے کے رنگین الفاظ میں

مشورہ کر رہی ہیں کئی روز سے

شاید اب
بوڑھے دروازے سر جوڑ کر
وقت کی بات کو وقت پر مان لیں
بیچ کی ٹوٹی پھوٹی گلی چھوڑ کر
کھڑکیوں کے اشاروں کو پہچان لیں

ایک مُلاقات

نیم تلے دو جسم اَجانے، چم چم بہتا ندیا جل
اُڑی اُڑی چہرے کی رنگت، کھُلے کھُلے زلفوں کے بل
دبی دبی کچھ گیلی سانسیں، جھُکے جھُکے سے نین کنول

نام اُس کا؟ دو نیلی آنکھیں
ذات اس کی؟ رستے کی رات
مذہب اُس کا؟ سرد ہوائیں
پتہ؟ بہاروں کی برسات

بھور

گونج رہی ہیں چنچل چڑیاں
ناچ رہے ہیں سُوپ
آنگن آنگن!
چھم چھم چھم چھم
گھونگھٹ کاڑھے رُوپ
ہولے ہولے بھیّا کا مُنھ
چاٹ رہی ہے گائے
دھیمے دھیمے جاگ رہی ہے
آڑی ترچھی دُھوپ

سردی

کُہرے کی جھینی چادر میں
جوبن رُوپ چھپائے
چوپالوں پہ مکانوں کی آگ اُڑاتی جائے
گاجر توڑے، مولی نوچے، پکّے ٹماٹر کھائے
گودی میں اک بھیڑ کا بچّہ
جھولی میں کچھ جوار
دُھوپ سکھی کی اُنگلی پکڑے
اِدھر اُدھر منڈلائے

ایک دن

سُورج اک نٹ کھٹ بالک سا
دن بھر شور مچائے
اِدھر اُدھر چڑیوں کو بکھیرے
کرنوں کو چھتراتے
قلم، درانتی، برُش، ہتوڑا
جگہ جگہ پھیلائے
شام!
تھکی ہاری ماں جیسی
ایک دیا ملکائے
دھیمے دھیمے ساری بکھری چیزیں
چُنتی جائے

صوفیانہ زندگی بسر کیجئے

اور

شراب نوشی سے احتراز کیجئے

یاد رکھیئے

پہلے آدمی شراب پیتا ہے

پھر شراب اور شراب چاہتی ہے

پھر شراب آدمی کو لے ڈوبتی ہے

اس لئے پہلی ترغیب سے بچیئے

• • •

اپنے وطن کے تئیں آپ کا کچھ فرض ہے

اپنے خرچ گھٹا دیں اور بچت کریں

اور اس طرح

ملک کی تعمیر و مالی و معاشی حالت کو بہتر بنائیں

یوپی اور بہار کے قحط زدہ علاقوں کے لئے

دل کھول کر مالی سہایتا کریں

جاری کردہ

سکریٹری نشہ بندی کمیٹی۔ دہلی

ایک
افسانہ
اور

کرشن چندر

نئی قمیص

یاد نہیں کس نے پہلے پہل ملوایا تھا۔ دھواں دھواں سی آنکھیں۔ مَیلی بھوری جلد۔ جسم میں سر سے پاؤں تک کہیں جھکاؤ نہیں۔ ٹانگیں پھیلا کے اور بالکل اکڑ کے چلنے کا انداز۔ کپڑے اتنے مَیلے اور کثیف کہ اب اُن کے رنگ، رُوپ، ساخت کا کوئی اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ پتلون پہنے ہے یا پاجامہ۔ بس یہ محسوس ہوتا تھا جو وہ پہنے ہوئے ہے۔ وہ اب اس کے جسم ہی کا ایک حصّہ ہے۔

پہلی ہی نگاہ میں معلوم ہو گیا کہ آدمی میرے ڈھنگ کا ہے۔ اُس کے مَیلے گندے ہونٹوں کا تبسّم بے حد ذہین اور طنز آمیز تھا۔ !

"اِن سے ملو۔ یہ عرش ہیں۔ فلمی مکالمے بہت عمدہ لکھتے ہیں۔" ملوانے والے نے مجھ سے کہا۔

اپنے تعارف کے جواب میں اس نے بڑے بڑے ناخنوں والا۔ مَیلا ہاتھ میری طرف سرکا دیا۔ میں نے اُسے ذرا سا چھُوا کے واپس کر دیا۔ مگر اسے غالباً اپنے ہات کے واپس آجانے کا احساس نہ تھا۔ وہ ہات میرے اور اس کے درمیان کئی لمحوں تک خلا میں ایک عجیب بے یقینی کے عالم میں جھولتا رہا — !

عرش میری طرف دیکھ کر تھوڑا سا ہنسا۔ اُس کی ہنسی بڑی گاڑھی تھی۔ گہری صعوبتوں کا ملغوبہ، بڑی بدذائقہ ہنسی تھی۔ مگر آپ کچھ کر نہیں سکتے ایسی ہنسی کا۔ کیونکہ اِس دنیا میں دوسرے لوگ بھی تو رہتے ہیں۔ وہ ہنستے ہیں تو آپ کو ان کی ہنسی چکھنا پڑتی ہے۔ یہی حال غالباً دوسرے لوگوں کا ہوتا ہوگا۔ آپ کے سلسلے میں .... ایک زنجیر ہے عرش سے فرش تک ....

"انھیں کچھ کام دیجیے۔" ملوانے والے مجھ سے کہا، [اس وقت حافظہ ملوانے والے کی تصویر سے بالکل خالی ہے۔ کوئی صورت نہیں ابھرتی۔ بس اتنا یاد ہے کہ اُن دنوں میرے پاس فلمی کام بہت تھا۔ بالعموم نہیں ہوتا۔ اتفاق سے ہو گیا۔ اِس لئے میں ایک مددگار کی تلاش میں تھا] میں نے عرش کی آنکھوں میں جھانکا۔ مگر اُن آنکھوں

کی پتلیوں پر کہرا چھایا ہوا تھا۔ میں کچھ معلوم نہ کر سکا۔ اُس کی پتلیوں کا رنگ میں کبھی معلوم نہ کر سکا۔
پھر اس دھند سے نکل کر ایک جھجھکتی شرمیلی ہذب سی نگاہ مجھ تک پہنچی۔ جیسے میرے دل کو ٹٹول رہی ہو۔
بہت آہستہ سے دستک دے رہی ہو۔!
میں نے عرش سے کہا۔ "آپ کہاں کے ہیں عرش صاحب ؟"
"اکبر آباد کا مغل ہوں۔" اس نے کڑی آواز میں کہا۔
پھر دبی گاڑھی ہنسی ... بیزار کن .... جلدی سے وہ سر جھکا کے بیڑی پینے لگا۔ جیسے بیڑی کے دھوئیں میں
وہ اس ہنسی کو چھپا لے گا۔!
میں نے مکالمے لکھوا کے دیکھے۔ واقعی عمدہ تھے۔ زبان شستہ و رفتہ۔ منجھا ہوا مشاق قلم، سین کو سمجھتا ہوا۔
ڈرامے کے اسلوب سے واقف، کیمرے کی ضروریات سے آگاہ، کرداروں کی افتادِ طبع سے آشنا۔ مجھے بڑی حیرت
ہوئی۔ میں نے پوچھا۔
"عرش صاحب۔ آپ دوسروں کے لئے، اِدھر اُدھر کے چند متفرق سین کیوں لکھتے ہیں جن پر آپ کا نام بھی نہیں
دیا جاتا۔ آپ خود سے کوئی فلم کیوں نہیں لکھتے ؟"
"صاحب۔ چھ سات فلمیں لکھی تھیں۔" اتنا کہکر وہ چپ ہو گیا۔
"پھر ؟"
"دو نے سلور جوبلی بھی منائی۔" وہ پھر چپ ہو گیا۔
"پھر۔؟ میں نے پوچھا۔
"پھر کچھ نہیں۔" اُس نے آہستہ سے اپنے سر کے سیاہ و سفید بالوں میں اپنی نیم مردہ انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔
"اگلا سین دیجئے !"
میں نے اگلا سین دیا۔ اس نے دو گھنٹے میں لکھا۔ مجھے پسند نہیں آیا۔ پھر سے لکھنے کو کہا۔ تین گھنٹے کے بعد اسی
سین کا نیا خاکہ سنایا۔ جو پہلے سے بھی بُرا تھا۔!
"در اصل بات یہ ہے۔" وہ ذرا سر جھکا کے بولا۔ "میں پہلی چوٹ والا رائٹر ہوں۔ پہلا وار اگر اوچھا پڑا
دوسرا اُس سے بھی اوچھا پڑتا ہے۔"!
دُھند، غبار اور کہرے میں لپٹی ہوئی اُس کی پتلیوں کے اندر سے پھر وہی ایک شرمیلی جھجھکتی سی نگاہ
مجھ تک آئی !
مجھے بُرا نہیں لگا وہ آدمی۔ میرے لکھنے کا انداز بھی وہی ہے۔ میں نے اسے بتایا۔ ذہن پہلی مرتبہ
راستہ بنا لیتا ہے پھر اُسی جادے پر رواں ہو جاتا ہے۔ برق رفتاری سے منزل تک پہنچتا ہے۔ اِدھر اُدھر

بھٹکنے، کاٹ چھانٹ کرنے، دوبارہ آگے پیچھے دیکھنے سے جی بہت گھبراتا ہے۔ ہاں صرف اوّل ہی حرفِ آخر ہے۔ شاید اسی لئے آپ بھی فلموں میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے...." میں نے اُس سے کہا۔

"صرف یہی بات نہیں ہے۔" عرش چاقو سے پنسل کی نوک تیز کرتے ہوئے بولا۔

"پھر کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ دیر تک چپ رہا۔ کچھ دیر تک ہونٹ سکوڑے گم سُم بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ سے بولا۔ "بس معاملہ کچھ چلا نہیں.... آگے.... !"

چار چھ روز کی ملاقاتوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ بحث سے کتراتا ہے۔ اپنی دلیل پر زیادہ دیر تک نہیں ٹکتا۔ وہ کسی دوسرے سے اپنی بات منوانے، دوسرے کو قائل کر دینے کا قائل بھی نہیں ہے۔ وہ بس اپنی رائے دے گا۔ دے کر چُپ ہو جائے گا۔ آپ نے اُس کی بات مان لی تو ٹھیک۔ ورنہ وہ آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دے گا۔ زیادہ باتیں کرنے سے کج بحثی سے، شیخی مارنے سے اُسے نفرت ہے۔ یہ سب خامیاں جس فلمی ادیب میں موجود ہوں۔ اُس کا کامیاب ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ معلوم نہیں کس گھپلے میں وہ پہلی دو سلور جوبلی فلمیں لکھ گیا۔ !

اُس کی کامیابی کے راستے کے عین بیچ ضرور کچھ ہوا ہوگا۔ اب میں اتنے دن ملنے کے بعد محسوس کر سکتا تھا کہ کیا ہوا تھا۔ اُس کی مہذب شرافت، اُس کا شرمیلا پن، اُس کی باہر کی دنیا سے زیادہ نہ اُلجھنے کی خواہش اُس کے راستے میں آئی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے کامیابی کی منزل سے بچھڑتا گیا۔ اور جتنا وہ بچھڑتا جاتا اُتنا ہی وہ خود اور پیچھے ہٹتا جاتا۔ حتیٰ کہ کامیابی بہت دور رہ گئی۔ مجھے ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنی گردن کو ذرا سا خمیدہ کر کے کہہ رہا ہے۔ "جی ہاں آپ آگے جائیے۔ آپ ہی آگے جائیے۔ میں پیچھے کو جاتا ہوں۔ آداب عرض !"

سُنا ہے اُسے ایک لڑکی سے محبت بھی ہوئی تھی۔ وہ غالباً اُس کی فلم کی ہیروئین تھی۔ مگر بیچ میں پروڈیوسر کود گیا۔ اور پروڈیوسر ظاہر ہے رائٹر سے بہتر آدمی ہوتا ہے۔ اُس نے عرش کی قابلیت اور اعلیٰ کارکردگی کے باوجود اُسے اپنی دوسری فلم سے کاٹ دیا۔

عرش نے کہیں اور ملازمت کر لی۔ وہ فلم نہیں چلی۔ دوسری بھی نہیں چلی۔ اُس کی وجہ سے نہیں۔ فلم نہ چلنے کی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ پھر اُسے وہ ٹکنیک بھی نہیں آتی تھی جس کے ذریعہ آدمی بڑی آسانی سے اپنی ناکامی کا بوجھ کسی دوسرے نالائق کے کندھے پر ڈال کر خود سُرخرو ہو جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عرش بڑی تیزی سے زوال کی سمت جانے لگا۔ زوال کی بھی منزلیں ہوتی ہیں۔ آدمی ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف اوپر ہی نہیں چڑھتا۔ نیچے بھی اُترتا ہے۔ پہلے دبی دبی شریفانہ مزاحمت، ایک قاعدے کی، سلسلے کی مخالفت پہلے تو عرش نے اس زوال کے خلاف مزاحمت کی ہوگی۔ پھر مجھے ایسا لگتا ہے کہ پھر زندگی کی کسی منزل پر آ کر عرش نے اپنے زوال سے مفاہمت کر لی ہوگی۔ اور اب وہ انتہائی دلی لگن اور انہماک سے اُس راستے پر گامزن تھا۔ اب وہ

خود کوشش کر کے ہر اُس پتھر کو بیچ بیچ میں سے ہٹا دیتا تھا۔ جو اُسے نیچے جانے سے روک سکتا تھا۔ !

مگر یہ سب کچھ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ !

پہلے دن تو صرف معاملت کی بات ہوئی۔ تین سو روپے ماہانہ پر بات طے ہو گئی۔ اگلے چھ ماہ کے لئے۔

عرش نے کہا۔

"مگر میں روز کے روز تنخواہ لوں گا۔ دس روپے روز" عرش نے کہا۔ !

"روز کے روز کیوں۔ ؟ ماہ بہ ماہ کیوں نہیں۔ اکٹھی رقم ملنے سے آپ کو آسانی رہے گی۔ !"

"جی نہیں۔ دقت رہے گی۔" اُس نے جواب دیا۔ "روز کے روز ہی ٹھیک ہے۔ !"

"اچھا۔ چلئے۔ روز کے روز حساب کیجئے۔ دس روپے لیتے جائیے ... صبح دس بجے آئیے شام کو پانچ بجے جائیے !"

"ٹھیک ہے۔ فی الحال دو دن کا ایڈوانس دے دیجئے !"

عرش بیس روپے لے کر چلا گیا۔ پھر چار روز تک نہیں آیا۔ میں نے ملوانے والے سے شکایت کی۔ وہ میری بات سن کر بہت ہنسا۔ بولا" عرش کسی بھٹی والے کے جھونپڑے میں بیٹھا ٹھرا پی رہا ہوگا۔ جب تک وہ بیس روپے ختم نہ ہوں گے، نہیں آئے گا۔ آپ اس کو کبھی ایڈوانس مت دیجئے۔ شام کو جب کام کر کے جائے۔ دس روپے اُس کے ہاتھ میں تھما دیجئے۔ !"

چوتھے دن عرش صبح صبح آ گیا۔ اُس نے ایسے کرب ناک لہجے میں اپنی بیوی کی شدید علالت کا ذکر کیا کہ وہ بالکل ایکٹنگ کرتا ہوا نہ معلوم ہوتا تھا۔ خیر میں نے پھر سے کام پر لگا لیا۔ تین دن تک بالکل ٹھیک سے کام کرتا رہا۔ چوتھے روز وہ کوئی بارہ بجے کے قریب آیا۔ اُس نے مجھے شکایت کرنے کا موقع بھی نہیں دیا۔ "لوکل ریلوے کا پاس کھو گیا تھا، وہ آزردہ ہو کر بولا۔

میں نے اسے لوکل پاس کے لئے ساڑھے آٹھ روپے دیئے۔ وہ روپے جیب میں ڈال بولا "سین لائیے !"

میں نے سین سمجھایا۔ دس پندرہ منٹ تک کام کر کے بولا، "اگر آپ اجازت دیں تو میں ریلوے اسٹیشن سے لوکل پاس بنا کے آ جاؤں۔ مشکل سے ایک گھنٹہ لگے گا۔ شام کو بے حد لمبا کیو ہوتا ہے !"

"جائیے۔ !"

عرش ایک گھنٹہ کی چھٹی لے کر گیا۔ پھر اُس دن نہیں آیا۔ دوسرے دن آیا۔ دیر تک میں اس سے کچھ نہیں بولا۔ وہ بھی نہیں بولا۔ دونوں خاموشی سے کام کرتے رہے۔ آخر مجھ سے نہیں رہا گیا۔

" اتنا اچھا کام کرتے ہو۔ اتنا اچھا کام کرتے ہو" میں بھڑک اٹھا۔ اور کیا حالت بنا رکھی ہے تم نے؟ اس شراب کی خاطر !"

وہ کچھ نہیں بولا۔
ان دنوں مجھ پر سدھار کا موڈ بہت غالب تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ انفرادی کوششوں سے افراد بدلے جا سکتے ہیں۔ میں نے اُس سے کہا۔
"میں تمھیں بدل دوں گا۔!"
"جی۔!" وہ بڑی عاجزی سے بولا۔
"تمھیں بدلنا ہوگا۔" میں نے غصّے سے کہا۔ "اتنا اچھّا ادیب یوں گمنامی میں سڑ رہا ہے؟ میں اِس فلم اپنے علاوہ تمہارا ٹائٹل بھی دلواؤں گا۔"

Additional Dialogues
By

A RSH

اُس کے چہرے پر کسی طرح کا تاثر نہ پیدا ہوا۔ وہ سر جھکائے اپنی پنسل کی نوک تیز کرتا رہا۔
"تمھیں اپنی عادات بدلنا ہوں گی۔" اب میں نے دو ٹوک فیصلہ کن لہجے میں اسے حکم دینا شروع کیا۔
"یہ کپڑے نہیں چلیں گے۔ میرے ساتھ چلو بازار میں۔ آج ہی۔ ابھی تمھارے لئے نئے کپڑے خریدے جائیں گے۔!"
وہ کچھ بولا نہیں۔ مگر میری طرف رحم کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی کبھی ہونٹوں کے خم سے معلوم ہوتا گویا کہہ رہا ہو۔ "کیسے احمق سے پالا پڑا ہے۔" مگر کچھ بولا نہیں۔ !
میں نے بازار سے اس کے لئے تین جوڑے کپڑے خریدے۔ تین پتلونیں۔ تین قمیصیں۔ ریڈی میڈ۔ ایک جوتا۔ دو رومال۔ پھر اُسے ایک شیونگ سیلون میں ڈھکیل دیا۔ پھر اُسے ایک حمام والے کے سپرد کیا۔ وہاں سے جو نکلا۔ تو اس کی جلد میں اس کے جسم کی اصلی رنگت جھلکنے لگی تھی۔ جب اس کے بزرگ سمرقند سے آئے ہوں گے تو یہی رنگت رہی ہوگی۔!
"اجی۔ جب میں پہلے پہل بمبئی آیا تو یہی رنگت تھی۔" عرش نے بڑی بیزاری سے کہا۔
"تھی کیا اب نہیں ہے؟"
"اب۔" وہ چپ ہوگیا۔ اور اُس کی پتلیوں کے گرد غبار گہرا ہوگیا۔ پھر دیر تک نہیں بولا۔
"آب نہانے کو نہیں ملتا ہے روز روز۔" آخر اُس نے کہا۔
"تم شراب کم کردو۔ تو تمھیں نہانے کو روز ملے گا!"

"شراب کم کر دینے سے نہانا کم کر دینا بہتر ہے۔" اُس نے جواب دیا۔

"دھیرے دھیرے بتدریج میں تمھاری شراب بھی کم کرا دوں گا۔ تمھیں پھر سے انسان بنا دوں گا۔
میں پر زیادہ زور تھا میری گفتگو میں۔ جیسے وہ تو موم کا پتلا ہو !

"جی ... جی ... بہت اچھا،" وہ بھی میری گفتگو کے دوران میں نرم موی لہجے میں میری ہاں
میں ہاں ملاتا رہا — !

"تم دن میں کتنی پی لیتے ہو ؟"

"جتنی بھی مل جائے !"

"پھر بھی — ؟"

"آدھی بوتل تو صبح ضروری ہے، نہار منھ ..... صبوحی۔ آدھی دوپہر میں۔ رات کو ایک بوتل، ڈیڑھ
بوتل، دو بوتل۔ رات کو جتنی بھی مل جائے — !"

"تمھیں اپنی عادت کے خلاف جد و جہد کرنا پڑے گی۔" میں نے اُس سے کہا۔ صبح کو تمھیں آدھی
بوتل ملے گی۔ دوپہر میں آدھی بوتل، شام کو چلتے وقت تمھیں ایک بوتل کے پیسے دے دوں گا۔ باقی
رقم ماہ بہ ماہ تمھارے گھر پہنچا دی جائے گی۔ تمھاری بیوی کے ہاتھ میں دے دی جائے گی۔ تم کو باقی
ماندہ تنخواہ میں سے ایک پیسہ نہیں ملے گا۔ !"

"ماہ بہ ماہ نہیں۔ روز کے روز دیجئے گھر پر بھی — !"

"اچھا پندرہ روز کے بعد دے دوں گا !"

"جی نہیں روز کے روز !"

"روز کے روز کیوں ؟"

"راشن لانا ہوتا ہے !"

"تمہارے ہاں کیا روز راشن آتا ہے۔ راشن تو ہفتے کے ہفتے آتا ہے۔ لہذا ہفتے کے ہفتے تمھارے
گھر پر رقم پہنچ جائے گی۔ مگر تمھیں نہیں ملے گی۔ تمھیں شراب چاہئے نا۔ وہ تمھیں مل جائے گی اور کیا
چاہیئے ؟"

"بس مجھے اور کچھ نہیں چاہیئے۔" پھر وہ اپنی گاڑھی ہنسی ہنسا !

کوئی آٹھ دس روز ٹھیک کام چلا۔ وہ وقت پر آتا تھا۔ کپڑے بھی صاف ستھرے پہن کر آتا تھا۔
شیو بھی بنی ہوتی تھی۔ لہجے میں ایک نئے اعتماد کی جھلک ملنے لگی۔ میں بہت خوش ہوا۔ اب اگلا تجربہ
شروع کرنا چاہیئے۔

کے مریض پر کڑی نگرانی رکھنا پڑتی ہے۔ آہستہ آہستہ شراب کی مقدار کم کردی جاتی ہے ساتھ میں دوائیں دی جاتی ہیں۔ بالعموم مریض چھ سات ماہ میں ٹھیک ہو جاتے ہیں!"

"پورے علاج پر کتنا خرچ آئے گا؟"

ڈاکٹر نے حساب کر کے بتایا" اگر چالیس روپے روز والا کمرہ بھی لیں تو بارہ سو تو یہی ہو گیا۔ تین سو خوراک کے سمجھ لیجئے۔ ہو گئے پندرہ سو۔ باقی پانسو دوادارو کے لگا لیجئے۔ دو ہزار روپیہ مہینہ کا تخمینہ پڑے گا۔ چھ ماہ میں بارہ ہزار خرچ ہوں گے۔ دو تین ہزار اوپر کے رکھ لیجئے۔!"

پندرہ ہزار!

پندرہ ہزار ایک ذہین، لائق، قابل آدمی کو بچانے کے لئے زیادہ نہیں ہیں۔ مگر پندرہ ہزار کون دے گا۔ یہ دنیا کسی غریب کو ایک وقت کی روٹی تو دے نہیں سکتی۔ پندرہ ہزار کہاں سے دے گی؟ خود میرے اپنے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں یہ رقم اس پر خرچ کر سکتا۔ پندرہ ہزار تو کیا۔ میں اس رقم کی ایک چوتھائی بھی فی الحال اس پر خرچ کرنے سے قاصر تھا۔

میں عرش کو ڈاکٹر کے ہاں سے لے کے چلا آیا۔

میرا شوق ٹھنڈا پڑنے لگا۔ یونہی ہوتا ہے۔ سدھار کرنے کے لئے نکلتا ہوں۔ بیچ میں ایک بہت بڑی اور اونچی دیوار آجاتی ہے۔ جسے توڑنے کے لئے میں اکیلا کافی نہیں ہوں .... سر جھکا کے واپس چلا جاتا ہوں۔ مگر کوئی تو راستہ ہوگا۔

ایک دن ٹھرّا پینے میں میں نے بھی اُس کا ساتھ دیا۔ ٹھرّا پی کر اُس دن وہ مجھ سے بہت کھُل گیا۔ جس لڑکی سے وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ آج فلم کی ایک مشہور اداکارہ ہے۔ اُس کی بے وفائی کا گھاؤ آج تک اُس کے دل میں تازہ ہے۔ پھر اُس نے مجھے اپنی کئی غزلیں سنائیں اور مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ وہ ایک اچھا شاعر بھی ہے۔ جو ہٹ کے کہتا ہے!

"تو تم اپنا کلام چھپواتے کیوں نہیں ہو؟"

"کیونکہ مجھے اپنے زخم دکھانے کی عادت نہیں ہے۔" وہ بڑی تلخی سے بولا۔

میں چپ ہو گیا۔ وہ بھی چپ رہا۔ یہ پورا پیگ خاموشی میں گذرا۔ پھر موضوع بدل دیا گیا۔ ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ مگر میرے ذہن کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ دو تین پیگ کے بعد میں نے اُس سے پوچھا۔

"تمھاری اِس عظیم الشان ناکامی کا راز کیا ہے؟

میں نے آٹھ دس روز کے بعد اُس سے کہا۔ "آج سے دوپہر میں تمھیں شراب نہیں ملے گی ـــ !"
وہ اک عجب تذبذب کے عالم میں دیر تک میری طرف گھورتا رہا۔ پھر بولا۔ "ٹھیک ہے ـ !"
دوپہر کو اُسے شراب نہیں دی گئی۔ اُس نے کچھ نہیں کہا۔ کسی طرح کی وحشت نہیں ظاہر کی۔ اطمینان سے کام کرتا رہا۔ سہ پہر میں کوئی ساڑھے چار بجے کا عمل ہوگا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔!
"روتے کیوں ہو؟" میں نے عرش سے پوچھا۔
"روتا نہیں ہوں۔ آنکھ سے پانی بہتا ہے۔" اُس کی آواز میں کسی طرح کی اُداسی یا لرزش نہیں تھی۔!
"کیوں بہتا ہے؟"
"ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب شراب نہیں ملتی ہے۔ تو آنکھوں سے پانی بہنے لگتا ہے۔!"
وہ بار بار رُومال سے اپنی آنکھیں صاف کرتا جاتا تھا۔ مگر آنسو برابر اُس کی آنکھوں سے بہے جاتے تھے۔ ساڑھے پانچ بجے کے قریب اُس کی یہ حالت ہو گئی گویا آنکھوں سے آنسوؤں کے جھرنے بہہ رہے تھے۔ مگر وہ کوئی شکایت نہیں کر رہا تھا۔!
عاجز آکر میں نے جلدی سے اُس کے لئے ٹھرّا منگایا۔ دوسرے پیگ میں اُس کے آنسو بہنے بند ہو گئے۔!
مگر میں آسانی سے ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ دوسرے دن میں نے اُسے پھر دوپہر کے وقت ٹھرّا نہیں پینے دیا۔ پھر اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تو میں نے اور اُس نے دونوں نے صبر کیا۔ پھر بہلے ہوئے اُس کے سارے جسم پر کپکپی طاری ہونے لگی۔ اس کا سارا جسم ایک خزاں رسیدہ پتّے کی طرح کانپنے لگا۔
پھر ٹھرّا پلاتے ہی ٹھیک ہو گیا۔!
بہت سوچ بچار کرنے کے بعد میں اُسے ڈاکٹر سنگھل کے ہاں لے گیا۔ ڈاکٹر سنگھل ہمارا فیملی ڈاکٹر ہے۔ اُس نے بڑی ہمدردی سے عرش کا معائنہ کیا۔ دیر تک معائنہ کرتا رہا۔ آخرکار میری طرف مُڑکر کہنے لگا۔
"آپ کا دوست الکوحلزم کا شکار ہے۔ بہت پُرانا مرض معلوم ہوتا ہے!"
"پھر کیا ٹھیک نہیں ہو سکتا؟"
"محض دواؤں سے ٹھیک نہیں ہو سکتا!"
"تو کیا کرنا چاہیئے؟"
"اِسے چھ ماہ تک کسی نرسنگ ہوم میں رکھنا پڑے گا۔ چوبیس گھنٹے نگرانی میں رکھنا پڑے گا۔ الکوحلزم

کچھ دیر چپ رہنے کے بعد وہ بولا "میں دھکا نہیں دے سکتا!"

"کیا مطلب؟" میں حیرت سے اُس کے منھ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ اپنی گاڑھی ہنسی ہنسا۔ پھر اُس نے ایک لمبا گھونٹ پی کے اُلٹے ہاتھ سے اپنے میلے ہونٹ صاف کئے، اور میری طرف دیکھ کر بڑی حقارت سے بولا "جب میں کامیابی کے اُو پنچے زینے پر کھڑا تھا اور اُوپر جانے کے لئے پَر تول رہا تھا تو اُسی سیڑھی پر اُسی زینے پر دو تین اور آدمی بھی تھے اور وہ میرے ساتھ ایک ہی سیڑھی پر کھڑے تھے اور جگہ بہت تنگ تھی۔ اوپر جانے کی ایک ہی صورت تھی، یا تو وہ مجھے دھکا دیتے یا میں اُنھیں دے دیتا۔ مگر مَیں اِس پوزیشن میں ہونے کے باوجود انھیں دھکا نہ دے سکا۔ کسی طرح میرا ضمیر آمادہ ہی نہ ہوتا تھا۔!

"پھر کیا ہوا۔؟" میں نے اُس سے پوچھا۔

وہ اپنے خالی گلاس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"پھر انھوں نے مجھے دھکا دے دیا۔!"

عرشی میرے ساتھ زیادہ دن نہیں چل سکا۔ دو ماہ کے عرصہ ہی میں وہ مجھ سے عاجز آگیا۔ روز شیو بناؤ روز صاف کپڑے پہنو۔ روز وقت سے آؤ، وقت سے جاؤ، شراب کم پیو، بیوی کو زیادہ پیسے دو۔ یہ کیا بَلا ہو گئی ہے! اُس نے سوچا ہوگا..... پھر وہ بیچ بیچ میں ناغے کرنے لگا۔ ایڈوانس پر ایڈوانس مانگنے لگا۔ آج بیوی بیمار ہے تو کل بچہ بیمار ہے۔ پرسوں وہ خود بیمار ہے۔ چونکہ وہ ایک اچھا ادیب اور شاعر تھا اِس لئے اُس کے بہانے بھی بڑے عمدہ اور متنوّع ہوتے تھے۔ اُنھیں سُن کر کچھ عرصہ کے لئے یقین آجانا لازمی تھا۔ مگر تا بکے۔ جوں جوں اُس کے تقاضے بڑھتے گئے۔ اُس کے ناغے بھی بڑھتے گئے۔ کپڑے بھی گندے اور میلے ہوتے گئے، داڑھی بھی بڑھتی گئی۔ شراب کی مقدار بھی بڑھتی گئی۔ آخر دو ماہ کے بعد جس دن وہ مجھ سے لڑ کے گیا ہے۔ اُس روز وہ اتنا ہی کثیف، گندا اور میلا تھا جتنا کہ پہلے روز جب وہ مجھ سے ملنے اور کام لینے کی غرض سے آیا تھا......!

اُس کے بعد ایک سال تک میں نے اُس کی شکل نہیں دیکھی۔ یہ دوسرے سال کا ذکر ہے، میری نئی پکچر "آئی رُت بہار کی" کی شوٹنگ شروع ہوئے تین چار ماہ گزر چکے تھے۔ میں اپنے مطالعہ کے کمرے میں ایک میز کے سامنے بیٹھا ہوا کچھ لکھ رہا تھا، کچھ سوچ رہا تھا۔ میرے سامنے کی کھڑکی کھلی تھی۔ کھلی کھڑکی سے برآمدہ اور برآمدے سے باہر باغ کا ایک حصہ نظر آرہا تھا۔ آم پر بور آیا تھا۔ فضا مست اور سُہانی تھی۔ دماغ میں کوئی عشقیہ کہانی تھی کہ اتنے میں کسی نے کھڑکی کے قریب آکر زور سے کھنکارا!

میں نے چونک کر دیکھا۔ اتنے میں کسی کی جانی پہچانی بیزار کن گاڑھی ہنسی سنائی دی۔ یہ عرشی تھا۔ کھڑکی

سے باہر فریم سے لگا۔ حُلیہ پہلے سے بدتر۔ جسم پہلے سے دُبلا، آنکھیں پہلے سے زیادہ مَیلی اور کھُرے میں دھنسی ہوئی۔ کپڑے پھٹے اور تار تار۔ اور جسم سے ایسی بدبو آتی تھی کہ ناک پر رُومال رکھنے کو جی چاہتا تھا۔ !

دیر تک میں اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ دیر تک وہ کھڑکی میں کھڑا میری طرف دیکھ کر اک عجیب کھسیلے ہوئے انداز میں مُسکراتا رہا۔ کچھ عجیب اُلجھا اُلجھا۔ پریشان، سِٹپٹایا ہوا سا کھڑا رہا۔ خاموش کھڑا رہا۔ !

"کہو ؟" میں نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے انتہائی دُرشت لہجے میں اُس سے سوال کیا [اپنے ناکام تجربے کو کون دُہرانا چاہتا ہے]

"کام چاہیئے۔ !" اُس نے اپنے گاڑھے تلخ لہجے میں کہا۔

"لکھنے کا کوئی کام میرے پاس نہیں ہے۔" میں نے اُسے فوراً جواب سُنا دیا۔ !

"لکھنے کا کام مجھے چاہیئے بھی نہیں۔" اُس نے سر ہلا کر مجھ سے کہا۔

"پھر کون سا کام ؟

"وہ جو نئی فلم آپ کی بن رہی ہے۔ "آئی رُت بہار کی"، جس کے چند سین میں نے بھی لکھے ہیں اُس فلم میں کوئی چھوٹا سا کام مجھے بھی دلوا دیجئے۔ !"

"کس طرح کا ؟"

"ایکسٹرا کا رول بھی مل جائے تو غنیمت ہے !"

میں دیر تک اُسے گھورتا رہا۔ یہ عرشؔ ہے میرے سامنے.... ایک ادیب، ایک شاعر، ایک مکالمہ نگار .... تین کامیاب تصویروں اور دو سلور جوبلی فلموں کا خالق .... ؟ یہ اپنے لئے فلموں میں ایک ایکسٹرا کا رول کرنے کے لئے تیار ہے، مگر اب یہ لکھے گا نہیں۔ کیوں نہیں لکھے گا۔ دوسروں کے لئے نہیں۔ کیونکہ شاید اِس شدید ابتری اور گہرے زوال کے باوجود کہیں پر اِس کے دل کے اندر اپنے پیشے کی صحیح عزّت اور عفت محفوظ ہے۔ محفوظ رکھنا چاہتا ہے کیا ؟ کیا اِسی لئے نہیں لکھے گا۔ اور اپنی شراب کے دام ایکسٹرا کا رول ادا کر کے حاصل کرے گا.... ؟ یا یہ بات ہے کہ مسلسل شراب خوری سے لکھنے کی صحیح صلاحیت بھی کھو بیٹھا ہے۔ جانے بات کی اصل صداقت کیا ہے ؟ میں نے مزید غور و خوض کئے بغیر اُسے فلم کے ڈائریکٹر کے نام ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ اِس خط کی بنا پر اُسے میری لکھی ہوئی فلم میں کام مل بھی گیا۔ سات آٹھ روز کے بعد اُس سیٹ کی شوٹنگ ہونے والی تھی، جس میں عرشؔ کو کام کرنا تھا۔

جس دن اُس کی شوٹنگ تھی۔ وہ دوپہر میں لنگڑاتا ہوا میرے گھر پر آ گیا۔ اور میرے مطالعہ کے کمرے کے باہر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کے مَیلے کچیلے رُخسار الکوحل کی حدّت سے سُلگ رہے تھے۔ اور آواز میں شرابیوں کی سی لکنت تھی اور ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ اُسے اِس حالت میں دیکھتے ہی مجھے غصہ آ گیا۔

"کیوں۔ کیا ہوا۔ کام پر نہیں گئے۔ آج تمھاری شوٹنگ تھی نا؟" میں نے اُس سے ڈپٹ کر پوچھا۔

"تھی۔" اُس نے شرابی لہجے میں کہا۔

"پھر گئے نہیں وہاں۔؟"

"گیا تھا۔!"

"تو کیا شوٹنگ ختم ہوگئی؟"

"نہیں ....." وہ رُکا۔ پھر اکدم بول پڑا۔ "انھوں نے مجھے نکال دیا!"

"کیوں نکال دیا۔؟"

"کہنے لگے۔ تم مکالمے ٹھیک سے ادا نہیں کرتے ہو!"

"یوں بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "تم نے زیادہ پی رکھی ہوگی!"

"یہ تو میں نے بعد میں پی ہے۔" عرش نے بے بسی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔

"اُس وقت تو معمول کے مطابق پی رکھی تھی۔ اسسٹنٹ ڈائریکٹر مجھے الفاظ کا تلفظ بتا رہا تھا۔ یوں بولتے ہیں، یوں نہیں بولتے ہیں۔ میں سر ہلا ہلا کے جی ہاں جی ہاں کہتا گیا۔ مگر جب کیمرے کے سامنے کام کرنے کا موقع آیا۔ تو میں وہی بولا جو مجھے بولنا چاہئے تھا۔ اِس پر اسسٹنٹ ڈائریکٹر کو بہت تاؤ آگیا، اور اُس نے مجھے سیٹ سے باہر نکال دیا۔!"

اتنا کہہ کر وہ زور سے ہنسا۔ اُس کی ہنسی بڑی خوفناک تھی۔ مجھے ایسا لگا جیسے خون سے اُس کا حلق بھر گیا ہو۔!

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے۔" وہ ذرا سا سر جھکا کے بولا۔ "وہ سین میرا ہی لکھا ہوا تھا۔"

بیچ بیچ میں لمبے لمبے وقفے آتے ہیں۔ چھ ماہ کے، سال کے، دو سال کے، وہ کبھی کبھار مجھ سے ملتا ہے۔ کسی شدید ضرورت سے مجبور ہو کر... اُس کا بیٹا مر گیا ہے، اُس کی ماں مر گئی ہے، بہن پاگل ہوگئی ہے.... چھ ماہ سے جھونپڑے کا کرایہ نہیں دیا.... عید آئی ہے.... ایک دفعہ اُس کی بیوی کا آپریشن ہونے والا تھا۔ نانا وتی ہسپتال میں۔ اُسے فوری طور پر ایک سَو روپیوں کی ضرورت تھی۔ میرے پاس صرف بیس روپے تھے۔ وہ میں نے دے دئیے۔ مگر باقی اسّی روپیوں کے لئے میں دن بھر بھٹکتا رہا۔ شام کو جب مل گئے تو اُنھیں لے کے نانا وتی ہسپتال پہنچا۔ جو وارڈ اُس نے بتایا تھا۔ جو بیڈ نمبر اُس نے بتایا تھا، وہاں پر نہ عرش تھا، نہ اُس کی بیوی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُس کی بیوی گھر پر اپنے میاں کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ اور عرش صاحب کسی جھونپڑے میں بیٹھے شراب پی رہے ہیں۔ اِس قدر مجھے غصہ آیا ہے

اُس پر اُس دن۔ اور میں ایسا بیوقوف بنا ہوں؟ مگر اُس کی اس دن کی ایکٹنگ بھی لاجواب تھی۔ اِس قدر زار و قطار وہ رو رہا تھا کہ مجھے اُس کے آنسو بالکل پُرخلوص معلوم ہوئے۔ بار بار چوٹ کھانے کے بعد اِس بار پھر میں اُس سے چوٹ کھا گیا۔ جی چاہا کہ کہیں اگر مل جائے تو مار مار کر اُس کی ہڈی پسلی ایک کر دوں۔ مگر اِس واقعہ کے بعد تقریباً دو سال تک وہ میرے نزدیک نہیں پھٹکا۔ وہ ماہرِ نفسیات بھی تھا۔!

پھر اِس واقعہ کے کوئی دو سال بعد میرے ایک شاعر دوست کے بنگلے پر فراق صاحب کے اعزاز میں ایک پارٹی دی گئی تھی۔ اسکاچ کی ایک درجن سے زیادہ بوتلیں کھلی تھیں۔ فلم انڈسٹری کے بڑے بڑے شاعر اور ادیب، مکالمہ نگار اور موسیقار مدعو تھے۔ عورتوں کے پرے کے پرے پُرانے جَے پوری زیوروں اور نئی نائلن ساڑیوں میں ملبوس گلاب کے تختوں کی طرح مہک رہے تھے۔ محفل شباب پر تھی۔ چاروں طرف نور اور رنگ، شراب اور نغمۂ شاعری اور خوشبو کی دھنک پھیلی ہوئی تھی۔ کہ کسی نے آ کے مجھ سے کان میں کہا "ایک صاحب آپ کو باہر بُلاتے ہیں۔!"

میں باہر گیا۔ برآمدے میں کوئی نہ تھا۔!

میں نے پوچھا "وہ صاحب کہاں ہیں؟"

"گھر کے باہر کھڑے ہیں۔!"

دو تین برآمدوں سے گزر کر سیڑھیوں سے اُتر کر میں گھر کے باہر گیا۔ اِس وقت رات کے گیارہ بجے بمبئی سے دور رسانت بنگلے کے مقام پر کون مجھ سے ملنے کے لئے آیا ہے؟

گھر کے باہر عرش کھڑا تھا۔!

مجھے دیکھ کر زور سے ہنسا، بولا، "آپ نے ایک بار کہا تھا ناں، کہ تم ہمیشہ جھوٹ بول کر مجھ سے پیسے لیتے ہو۔ آج سچ سچ کہہ رہا ہوں، مجھے شراب کے لئے پیسے چاہئیں، اور صرف شراب کے لئے .... بس ....!"

میں اُسے دیکھتا رہ گیا۔ اب اُس کی حالت بہت بگڑ چکی تھی، اور وہ بہت دور نیچے کو نکل گیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے عرش کو اُس کے پھٹے پُرانے فقیروں کے سے چیتھڑوں میں ملبوس سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے دیکھ کر میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ آخر وہ ہمیں میں سے ایک تھا۔ اُس نے بھی کئی کامیاب پکچریں لکھی تھیں۔ آج بھی اُس کے قلم میں وہی زور تھا۔ جو اُس کے ہم عصروں میں تھا۔ جو اندر اس مہکتی ہوئی گلزار محفل میں بیٹھے دعوتِ ناؤنوش میں معروف تھے۔ جن کے گھروں پر وہ ایک بھکاری کی طرح جاتا تھا۔ جن کی کھڑکیوں کے باہر وہ ایک سوالی کی طرح چُپ چاپ کھڑا ہو جاتا تھا۔ جن کے نام ادبی اور فلمی پرچوں کے پہلے صفحے پر آتے تھے۔ وہ اُن میں سے کسی ایک سے بھی قابلیت، لیاقت اور فنی صلاحیت کم نہیں رکھتا تھا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ اُسے شراب نے مارا۔ آخر کتنی شراب پیتا تھا وہ۔ آدھی بوتل صبح، آدھی دوپہر اور ایک رات کو۔ کل دو بوتلیں

ٹھرّے کی، جو اس زمانے میں چھ سات روپے کی ہوتی تھیں۔ کل چھ روپے کی شراب وہ پیتا تھا۔ اتنی شراب تو یورپ، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں کروڑوں لوگ شب و روز پیتے ہیں اور عزت اور عافیت سے زندہ رہتے ہیں۔ چھ رُوپے کی شراب کیا بہت ہوگئی ایک فن کار کے لئے ․․․․ ؟ ہم لوگ خوبصورت روشنیوں اور رنگوں کے ہالے میں تھے، اور وہ اس سے باہر تھا۔ اندر جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ اور وہ باہر پیاسا کھڑا تھا۔ میں مبہوت ہو کر اُس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ میرا ماضی ہے ؟ یا مستقبل ؟ کیوں اس طرح سے سر جھکائے کھڑے ہو عرش۔ کیوں مانگ مانگ کر پیتے ہو۔ کیوں تمھیں دوسروں کی طرح دنیا داری کی چالیں، سازشیں، تکڑمیں اور فریب نہیں آتے۔ اندر ہم لوگ اسکاچ پی رہے تھے۔ کیونکہ زندگی کے کسی مرحلے پر ہم نے کسی دوسرے کو دھکا دیا تھا۔ اور تم سے ایک دھکا نہ دیا گیا۔ ارے کس کے لات ماری ہوتی ظالم، تو آج اس زبوں حالت میں میرے سامنے تو نہ کھڑے ہوتے ․․․ ؟

یکا یک وہ زور سے ہنسا۔ جیسے سوڈے کی بوتل پھٹ گئی اور تیز کانچ کی کرچیں چاروں طرف بکھر گئیں

"کیوں کیسی نفسیاتی چوٹ کی میں نے۔" وہ طنز آمیز لہجے میں شدید حقارت سے مجھ سے مخاطب ہوا۔

یکایک میرے سارے نرم گرم۔ رحمدلی اور ہمدردی کے جذبے اس کے لئے اُس کی گاڑھی غلیظ ہنسی میں دب گئے۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ تو یہ سارا ڈرامہ اس لئے کھیلا گیا تھا کہ اس نقاد کو دیکھ کر ایسے خیال میرے دل میں آئیں۔ اور عرش اُن سے فائدہ اُٹھا کے مجھ سے رُوپے لے جائے۔!

میں نے دانت پیس کر کہا۔ "کمینے !"

اُس نے سر جھکا کے ہاتھ بڑھا کے کہا۔ "آداب عرض کرتا ہوں !"

اِس وقت اُس سے اُلجھنا فضول تھا۔ میں نے جلدی سے جیب سے نکال کے اُسے دس رُوپے دیئے اور واپس ہولیا۔ لوٹ ہی رہا تھا کہ اُس کی آواز آئی۔

اندر سے نثار کو بھیج دیجئے گا۔ اُسے بھی نفسیاتی چوٹ دوں گا۔"

اُس رات عرش نے ایک سو روپے اکٹھے کر لئے تھے۔ مگر میں نے بھی طے کر لیا تھا۔ کچھ ہو جائے اب عرش کو کبھی منھ نہ لگاؤں گا۔ !

مگر یہ زندگی اِس قدر عجیب ہے کہ یہاں کوئی قولِ فیصل بہت دیر تک نہیں رہتا۔ چند ماہ کی خفگی کے بعد میں پھر اسے کام دینے لگا۔ اب وہ میرے اور دیگر ادیبوں کے مسودے نقل کرتا تھا۔ جو ملتا اُس میں سے ایک چوتھائی گھر دے دیتا۔ تین چوتھائی رقم کی شراب پی جاتا۔ اب اس پر کسی گالی، جھاڑ، طعنے، شکوے کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اب وہ زیادہ باتیں بھی نہیں کرتا تھا۔ چونکہ کسی زمانے میں وہ کاتب بھی رہ چکا تھا۔ اس لئے اُس کا خط بہت اچھا تھا۔ میرے مسودوں کی نقل کا کام زیادہ تر اسی کو دیا جانے لگا۔ ہولے ہولے

اُس نے پھر اپنا رنگ مجھ پر جما لیا۔ یہاں تک کہ جب ایک بار میری بیوی اپنے میکے چلی گئی۔ تو میں نے اُسے کھڑکی میں کھڑا رکھنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے گھر کے اندر آنے اور پھر گھر میں بیٹھ کر کام کرنے کی دعوت دے دی۔ اب ہم لوگ اکٹھی چائے پیتے، کبھی کبھی اکھٹے کھانا کھاتے۔ وہ مجھے اپنی خوش حالی کے زمانے کی داستانیں سُناتا۔ اور اپنے جاننے والوں پر عمدہ طنزیہ فقرے کستا۔ لگتا تھا جیسے اب بھی اس کی ذہانت میں کوئی چنگاری باقی ہے۔!

ایک دن میں چند گھنٹوں کے لئے اُسے گھر میں اکیلا چھوڑ گیا۔ مجھے کسی ضروری کام سے باہر جانا تھا۔ اور جو مسودہ وہ نقل کر رہا تھا۔ اُسے آج ہی کی ڈاک سے بھیجنا بھی تھا۔ اِس لئے میں اُسے گھر میں کام کرتا چھوڑ گیا۔ چند گھنٹوں کے بعد جب واپس آیا، تو وہ اسی طرح اپنی جگہ پر بیٹھا ہوا کام کر رہا تھا۔ میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی اِدھر اُدھر نگاہ ڈالی۔ وہ بھڑک کر کہنے لگا۔

"ہاں دیکھ لو.... دیکھ لو.... میں نے کچھ نہیں چرایا ہے۔ تمھاری بیوی کے چاندی کے برتن تک محفوظ ہیں۔ اور وہ علی گڑھی پاندان بھی.... اچھی طرح سے دیکھ لو۔!"

"کیوں شرمندہ کرتے ہو عرش.... میں تو یونہی....!"

"یونہی نہیں جناب۔ ٹھیک سے سارے گھر کی تلاشی لے لو۔ ممکن ہے کوئی چیز غائب ہو۔!"

میں شرمندہ ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ کام ختم ہو گیا۔ تو میں نے اسے پیسے دے دئیے۔ پیسے لیکر وہ چلنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے چائے پی کر جانے کے لئے کہا۔ اُس نے بہت انکار کیا۔ لیکن میں نے اصرار کر کے بٹھا لیا۔ جب چائے تیار ہوئی۔ تو میں کچن میں چمچے ڈھونڈنے لگا۔ دیکھا تو کچن میں ایک چمچہ بھی موجود نہیں ہے۔ پچاس ساٹھ چمچے تھے۔ سب غائب!"

میں نے عرش کی طرف دیکھ کر کہا۔ "کچن میں تو ایک چمچہ بھی نہیں!"

عرش فوراً بھڑک کر بولا "کیا تم چمچے کے بغیر چائے نہیں پی سکتے، کھانا نہیں کھا سکتے، زندہ نہیں رہ سکتے....؟

اُس دن میں نے پھر عرش کو گھر سے نکال دیا اور قسم کھائی۔ آئندہ کے لئے ختم۔ بس ہمیشہ کے لئے ختم!

مگر اس واقعہ کے چند ماہ بعد وہ پھر میری کھڑکی میں آن موجود ہوا۔ بہت دُبلا اور نحیف دکھائی دیتا تھا۔ پیٹ پر ایک موٹی پٹّی باندھ رکھی تھی۔ جس سے اُس کا پیٹ اُبھرا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ لمبے لمبے سانسوں کے درمیان بولا۔ "بہت بیمار ہوں، خونی پیچش ہو گئی ہے۔ مجھے پچیس روپے دے دو!"

"یہ بہانے بازی اب نہیں چلے گی۔" میں نے گرج کر اُس سے کہا "چلے جاؤ!"

"نہیں سچ مُچ بیمار ہوں، واقعی.... بیس روپے ہی دے دو۔ میری حالت دیکھو۔" وہ اپنے پیٹ کی پٹّی کھولنے لگا۔!

"رہنے دو۔ رہنے دو۔ اب یہ ایکٹنگ یہاں نہیں چلے گی!"

"اچھا تو کوئی کام دے دو۔ مسودہ نقل کرنے کے لئے.... اور کچھ ایڈوانس دے دو۔ پندرہ روپے ہی دے دو.....!"

"ایک پیسہ نہیں ملے گا۔" میں نے انتہائی درشتی سے اُسے جواب دے دیا۔ اور کھٹاک سے کھڑکی بند کر دی!

چوتھے دن مجھے معلوم ہوا کہ عرش مر گیا۔ میں شمشو پان والے کی دوکان پر کھڑا منگھئی پان کا جوڑا کھا رہا تھا کہ شکیل بدایونی کے ایک نوکر نے جو اُن کے گھر سے تیس پانوں کا آرڈر لیکر آیا تھا۔ مجھے پہچان کر اور سلام کر کے کہا "آپ کو معلوم نہیں۔ عرش صاحب مر گئے۔!

ایک دھچکا سا لگا۔ تو کیا وہ سچ کہتا تھا؟ واقعی بیمار تھا؟

"کب"؟ میں نے اُس سے پوچھا۔

"آج صبح۔" نوکر نے جواب دیا۔ " ان کے گھر سے ایک لڑکا آیا تھا۔ شکیل صاحب وہیں گئے ہیں۔"!

میں نے ایک ٹیکسی بلائی اور عرش کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔

وہ سانتا کروز ویسٹ کے ایک جھونپڑے میں رہتا تھا۔ قریب میں بھینسوں کا ایک شیڈ تھا۔ ایک شیڈ میں بھینسوں کے لئے چارہ بھرا تھا۔ قریب میں گندہ بدررویں بہ رہی تھیں۔ اُن کو پھلانگ کر عرش کے جھونپڑے تک پہنچ سکتے تھے۔ عرش کی لاش جھونپڑے کے عین بیچ رکھی تھی۔ بیوی جو قبل از وقت بوڑھی ہو گئی تھی۔ ہولے ہولے بین کر رہی تھی۔ عرش کے بچے کچھ نیم برہنہ کچھ ننگ دھڑنگ اپنے باپ کی لاش کے گرد نیم دائرہ بنائے حیران و پریشان کھڑے تھے۔ سب سے چھوٹے لڑکے امجد کی عمر چار سال تھی۔ اُس کی ماں نے اُسے دوسرے محلے میں کھیلنے کے لئے بھیج دیا تھا۔!

عرش کا چہرہ صاف، سُفید اور سُتا ہوا تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ پہلی بار میں نے اُن آنکھوں کا رنگ دیکھا۔ ایک ہزار برس پہلے جب تم سمرقند سے چلے ہو گے تو یہی آنکھیں لے کے چلے ہو گے۔ کہاں کہاں پہنچے۔ اِس کا مجھے غم نہیں ہے۔ غم صرف اِس بات کا ہے کہ یہ آنکھیں زندگی میں بھی اسی طرح صاف اور نیلی کیوں نہ دکھائی دیں۔ جیسی پُر سکون اور صاف تمھاری موت ہے۔ ایسی ہی زندگی تمھیں کیوں نہ ملی۔؟

دو تین بچے ناک سڑک رہے تھے۔ کہ سسکیاں لے رہے تھے۔ کہ حیرت سے اُن آنے جانے والے خوش پوش آدمیوں کو دیکھ رہے تھے۔ جو اِس جھونپڑی میں اِس سے پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ ان بچوں کو حیرت غالباً اِس بات کی تھی کہ ایسے خوش لباس انسان اِس سے پہلے اِس جھونپڑے میں کیوں نہ آتے تھے۔ ان کے فاقہ زدہ جسموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ عرش کی مصیبت تو کٹ گئی۔ اب ان کی شروع ہونے والی ہے۔!

حالانکہ وہ میرے سامنے دفن ہوا۔ مگر یقین نہیں آتا۔ کتنے ہی دن میں کھڑکی کھولے اس کا منتظر رہا۔

خیال تھا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے میری کھڑکی کے قریب آکر رُک جائے گا اور میں اُسے وہ پچیس رُوپے دے دونگا۔ کسے معلوم تھا کہ بالکل آخر وقت میں وہ بالکل سچ بول کر مجھے چرکا دے جائے گا!

اپنے ضمیر کو تسکین دینے کے لئے مجھے اِس بار پچیس روپوں سے زیادہ خرچ کرنے پڑے۔ حالانکہ اُس وقت صرف پچیس رُوپوں میں کام چل سکتا تھا۔ مگر اب میں عرش کو واپس نہیں بُلا سکتا تھا۔ اُن مُردوں میں ذراسی انسانیت نہیں ہے۔ زندوں کو اِس طرح تنگ کرنے کا انھیں کیا حق ہے۔

ایک دوست نے اُس کے جھونپڑے کا سات ماہ کا کرایہ ادا کیا۔ ایک دوست نے دو ماہ کا راشن بھر دیا۔ میں نے اُس کی بیوی بچّوں کے لئے کپڑے بنوا دیئے۔ عرش کے تیجے پر میں اس کے جھونپڑے میں گیا تو چار سال کا ننھا امجد ایک نئی قمیص پہنے اپنی اماں کی گود میں بیٹھا تھا اور خوش ہو کر کہہ رہا تھا۔

"اماں نوی قمیج!"

مجھے دیکھ کر عرش کی بیوی نے ذرا سا گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ اور آنسو بھرے لہجے میں بولی۔ "ہاں بٹیا.... تیرے ابّا مر گئے ہیں ناں۔ تو یہ انھوں نے.... تیرے ابّا کے دوست نے تیرے۔ لئے قمیص بنوا دی ہے۔ انھیں سلام کرو بٹیا۔!"

مگر ننّھا امجد ابھی صرف چار سال کا تھا۔ ابھی اُس نے کسی کو خوشامد سے سلام کرنا نہیں سیکھا تھا۔ ابھی اُسے یہ بھی ٹھیک سے معلوم نہیں تھا، کہ مرنا کسے کہتے ہیں؟ دوست کون ہوتا ہے؟ اپنی ماں کی بات سے صرف اسے اتنا پتہ چلا کہ اس کے ابّا مر گئے ہیں۔ اور آج اسے نئی قمیص ملی ہے۔ یہ جان کر وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس کے معصوم ماتھے پر سوچ کی ایک گہری شکن نمودار ہوئی۔ اور اس نے اپنی نئی قمیص کے دامن میں اپنی انگلی پھنسا کر اپنی اماں سے پوچھا۔

"تو اماں..... تو.... ابّا اِس سے پہلے کیوں نہ مر گئے؟....."

ہم صفیرانِ چمن، مل کے پکاریں تو ذرا
یہیں خوابیدہ کہیں بادِ بہاری ہوگی

اختر سعید

سجاد ظہیر

ویت نام — زخموں کا باغ

جب تم اپنے پھول جیسے بچوں کو
سُکھ کی نیند سوتے دیکھو
جب پُر سکون
فرصت کے اوقات میں
دوستوں کے حلقے میں بیٹھ کر
تم اِدھر اُدھر کی
غیر اہم دلچسپ گفتگو کرو
جب تمھارے دل کے دھڑکن کی گونج
دنیا جہان کے
سب سے اچھے
سنگیت کی طرح
اُس دوسرے سینے سے بھی
سنائی پڑے
اور تمھیں ایسا لگے
کہ سب آسمانی دروازے
کھُل گئے
اور اچانک تم پر نور کی بارش
ہونے لگی
اور جب تم امن و امان کے
رو پہلے ماحول میں

محنت کے خون کی گردش کو
دور دور تک پھیلی ہریالی
اور کنک کی سنہری بالیوں
کارخانوں، فیکٹریوں اور ملوں
اور راتوں کی تنہائی میں
کام کرنے والے سائنس دانوں کی
بنائی ہوئی چیزوں میں
بدلتے دیکھو
اور شاعروں، ادیبوں اور کلاکاروں کی
رچناؤں سے
تمھارے سینے میں
رنگ سنگیت اور خوشبو کی لہریں
اُٹھنے لگیں
تب اُس سمے
ایشیا کے اُس چھوٹے سے ملک
ویت نام کے بارے میں سوچو!
جہاں ہمارے ہی دیش سے
شاکیہ مُنی کے بھکشو
پریم اہنسا اور کرُنا کا سندیش
لے کر گئے تھے

اور جہاں آج
ہزاروں میل سے آئے
منحوس فوجی قدموں نے
بچوں سے ہنسی
ماؤں سے اُن کی مُسکراہٹ
اور سب لوگوں سے
اُن کی خوشی
چھین لی ہے
اور جیون کے سوتوں میں
زہر گھول دیا ہے

لیکن سینے کے زخم
کبھی کبھی پھول بھی بن جاتے ہیں
بیش بہا، پاک پھول
جب وہ آزادی کے سورج سے روشنی
رفاقت اور محبّت کی
دہکتی آگ سے گرمی
اور اُس مشقّت، محنت، اور سنگھرش
کے پسینے سے نمی حاصل کرتے ہیں
جو گِرے ہوئے مظلوم انسانوں کو
آسمانی بلندیوں تک
پہنچانے کے لئے
کی جاتی ہے

وہاں، اُس زخموں کے باغ میں
آج ایسے ہی لہو رنگ پھول کھِلے ہیں
فولادی ارادوں کی
سخت اور مشکل چٹانوں کی
تلوار سے زیادہ تیز بلندیوں پر نکلے
نایاب پھول!
مُہیب، اندوہ ناک اندھیروں کی ہار،
اور انسان کے طربناک
عروج کی ——— ضمانت!

سید احتشام حسین

(بہ یادِ ویت نام)

پھر خون سے بھر گئیں فضائیں
کیونکر غمِ زندگی بھلائیں
پھر ناوکِ ظلم سر ہوا ہے
سینوں کو چلو ہدف بنائیں
برہم ہے مزاجِ زندگانی
پھر آؤ جنوں کے گیت گائیں
ہر سمت محیط سوزِ غم ہے
کب تک اسی آگ میں نہائیں
شعلے بھی تو پھول بن چکے ہیں
زخموں سے کہو کہ مسکرائیں

وہ آئے نہ مجھکو نیند آئی
روتی رہیں رات بھر ہوائیں
کیا گذرے جو وہ اچانک آجائے
کیا ہو جو نصیب جاگ جائیں!
آئی دبے پاؤں یاد کس کی
اوڑھے ہوئے خواب کی ردائیں
نکلا جو ترے خیال کا چاند
چھانے لگیں درد کی گھٹائیں
کچھ بھی تو نہیں ہے اپنے بس میں
یا ان کو کریں کہ بھول جائیں

○

سپاہی

مری رگوں میں تو میرے لہو کی گردش تھی
تمھارے پاس تھا کیا
ایک خوفِ جاں کے سوا
تمھیں یہ خوف تھا بزمِ طرب نہ لُٹ جائے
تمھیں یہ غم تھا کہ برہم نہ ہو وہ بزمِ نشاط
جو موجِ مے پہ رواں ہے سیاہ راتوں میں
مجھے یہ ڈر تھا مری آبرو پہ حرف نہ آئے
مجھے یہ ضد تھی کہ میرے وطن کی دھرتی پر
کسی عدو کے قدم کا کوئی نشاں نہ پڑے

مجھے یہ ضد تھی کہ میرے چمن پہ آنچ نہ آئے
چمن کے پھول اسی طرح مسکراتے رہیں
وطن کے کھیت اِسی طرح لہلہاتے رہیں
یہ رود بار اسی طرح گیت گاتے رہیں

مری رگوں میں تو میرے لہو کی گردش تھی
تمھارے پاس تھا کیا
اک "بڑھے چلو" کے سوا
گھِسے پٹے سے کچھ الفاظ
شاعروں کا کلام

ہزار بار کی اُگلی ہوئی وہ تقریریں
یہ سب فضول ہے بے کار ہے دِغا کے لئے
دِغا کو کچھ نہیں درکار اک لہو کے سوا
تمھارے پاس لہو تھا کہاں کہ دے سکتے
مجھے تم اپنے رگ و پے کی داستاں نہ سناؤ
لہو کہاں ہے تمھاری رگوں میں اب باقی
جبینِ وقت کی تحریر کہہ رہی ہے یہی
کہ ان رگوں میں رواں آب بھی شراب بھی ہے
مگر سوال یہ ہے ان میں خونِ ناب بھی ہے؟

تمھیں خبر بھی ہے میدانِ جنگ کی روداد
دلِ تپاں کی ہے کوئے بُتاں کی بات نہیں
یہاں نہ شعر نہ حُسنِ بیاں کا رنگ چلے
یہاں چلے تو فقط دل چلے اُمنگ چلے
فقط خلوص چلے اور بے دررنگ چلے

بتاؤ ٹینک کبھی رزمگہ میں دیکھا ہے
کسی تفنگ کی زد میں کبھی تم آئے ہو
تمھارا عزم کبھی توپ سے بھی ٹکرایا
سوال یہ ہے کہ میدانِ جنگ کا نقشہ
کبھی نگاہِ تصوّر سے ہٹ کے دیکھا ہے

یہ داستان مرا ہی لہو سُنائے گا
کہ شعلہ شعلہ بڑھی آگ جو چمن کی طرف
یہ موج موج اُٹھا اُس کو روکنے کے لئے
یہ داستان مرا ہی لہو سُنائے گا
کہ جس کے چھینٹوں نے
بجھا کے آگ وہ رکھ دی جو تم پہ لپکی تھی

قمر رئیس

ارمغانِ تاشقند

ازبکستان میں اجنبی

مری چشمِ حیرت کو شوقِ فراواں نے
کچھ ایسی تاب و تواں بخش دی ہے
کہ میں ہر نظارے کو تسکینِ دل راحتِ جاں بنائے ہوئے
ہر اک رہگزر سے گزرتا ہوں یوں
جیسے یہ کوئی اپنی ہی بھولی ہوئی داستاں ہے
کوئی ایسا نغمہ
سدا جس کو شہرِ حقیقت میں ڈھونڈا
تخیّل میں پایا تصوّر میں گایا
کوئی خواب ایسا
جسے نوعِ آدم نے ہر یُگ میں دیکھا
کوئی نور ایسا
فلک سے نہیں جو زمیں ہی سے اُترا
کوئی ایسا آئینۂ روح پرور
کہ جس میں بشر کے خد و خالِ باطن
نظر آ رہے ہیں

یہ سچ ہے غریب الوطن بے نوا ہوں

صداؤں کے اِس دشت میں کیا عجب ہے
کہ میں کچھ ابوالہول سا بن گیا ہوں
ذہن میں ہزاروں تو لاکھوں صدائیں
صداؤں سے بوجھل روپہلی فضائیں
اس انجان ماحول میں اجنبی ہوں
مگر یہ بھی سچ ہے کہ تنہا نہیں ہوں
مرے گرد جو مسکراتی ہوئی انکھڑیوں کے
کنول کھل رہے ہیں
انھیں دیکھتا ہوں
یہ نیلی بھی ہیں سبز بھی شربتی بھی
یہ نیلگوں بھی ہیں زرد بھی اور سیہ بھی
مگر رنگ کتنے ہی کیسے ہی ہوں
یہ مجھے دیکھ کر
یوں چمکتی ہیں جیسے کہیں روح میں
برقِ دلداری و دلبری جاگ اُٹھی
مجھ سے کہتی ہیں شرمائی سرگوشیاں
اجنبی تم سہی!
پر نہ سوچو کہ اپنے وطن میں نہیں
صرف آنکھیں نہیں
دل بھی وا، در بھی وا ہیں تمھارے لیے
میں جدھر بھی بڑھوں
یہ نگاہیں مری پیشوائی کریں
رہنمائی کریں۔

مری میزباں
اُنگلستان کی یہ روپہلی فضائیں

"کھلا آسماں، زرفشاں مہرِ تاباں. خنک تیز اور
سرپھری یہ ہوائیں
پگھلتی ہوئی برف میں سانس لیکر
پہاڑوں سے جو مثلِ شمشیر آئیں
مگر میرے گالوں سے بالوں سے باہوں سے
لپٹیں تو لے لیں ہزاروں بلائیں
یہ بادام اور سیب کے جھلملاتے درختوں میں ہر دم
محبت بھرے دل کی صورت ہمکتے لرزتے شگوفے
بلاتے ہیں پیہم
گل و یاسمن، نازنینانِ گلشن
روش در روش نرم شفاف کرنوں میں اشنان کر کے
بدن کو چھپاتی ہوئی کونپلوں سے
ذرا جھک کے کہتی ہیں ۔" مہمان آؤ!
مرے پاس بیٹھو ۔ مجھے گدگداؤ
مرے جسم کے لوچ میں کسمساتی ہیں جو نرم کلیاں
انھیں تم جگاؤ ۔ انھیں تم کھلاؤ
رگِ سنگ سے موجِ خوں چوس کر
سرکش و خوبرو لالۂ بادہ گوں
دور بستی سے کچھ دامنِ کوہ میں
دل گرفتہ، اکیلا، دہکتا ہوا
کہہ رہا ہے کہ میں رسمِ تہذیب سے یوں تو بیگانہ ہوں
میرے سینے میں لیکن امٹ داغ ہے
درد کا، چاہ کا، شعلۂ آہ کا
پاس آؤ مرے [illegible] تم تو فن کار ہو
پیار [illegible] کی زباں
پیار میرے وطن کی زمیں [illegible]

پیار میری ہواؤں میں نغمہ سَرا
پیار نوعِ بشر کی حسیں داستاں
پیار انسانیت کی سحر کا نشاں
پیار امن واماں
اور ہم ہیں اسی پیار کے ترجماں

تاشقند مارچ ۶۶ء

چائے خانہ[۱] کی صبح

صبح دم
پھر لب آب جو
چائے خانے کا در وَا ہوا
پھر شکم میں سماوار کے
آب سنانی اُبلنے لگا
جیسے مُدّت سے سینے میں ہو مشتعل
ان کہی داستاں
صحن میں ہر طرف
پھر گھنیرے صنوبر کے سایہ تلے
تخت بچھنے لگے
موسمِ گُل کی بے کل پریشاں ہوا
شبنمستان، گلستاں کے ہر کنج میں
مثلِ مُرغِ قفس

---

[۱] چائے خانہ اُزبکستان کا مستقل اور قومی ادارہ ہے۔ جو بالعموم کسی باغ یا پارک کے گوشے میں دریا کے کنارے کھلی فضا میں ہوتا ہے۔

پھر پھڑانے لگی

پھر بنفشہ کے پھولوں سے

ریحاں کے پتّوں سے

اُٹھنے لگی جاں فزا موجِ بو

شاخ در شاخ پھر طائرانِ چمن

یوں چہکنے لگے

جیسے پھولوں نے غنچوں نے پتّوں نے مل کر

کوئی جانفزا نغمگی چھیڑ دی

چائے خانے کے گوشے میں سوئی ہوئی

تیتری جاگ اُٹھی

زندگی جاگ اُٹھی

وہ بھی گانے لگی

لَے ملانے لگی

پھر کسی منچلے نے دوتارہ اُٹھا

نیم خوابی میں اک راگنی چھیڑ دی

اک دھنک سی اُٹھی

رنگ بہنے لگے

اور ہر رنگ سے رس برسنے لگے

تشنہ کامانِ بزمِ وفا آگئے

اپنی رنگیں چپانیں سمیٹے ہوئے

اُن کے شاداب گلرنگ بے داغ چہروں میں

ہنستے ہوئے [illegible] کی آشتی

[illegible] ہوئی دلبری

ف قدیم [illegible] کی وضع کا ایک قومی ازبک لباس جو ریشمی اور شوخ رنگوں کے کپڑے بنایا جاتا ہے

کارخانوں کی درخشندہ محنت کشی
رقصِ معصومیت وجدِ آسودگی
کچھ منقش پیالے، تُنک نیلگوں
پھر کھنکنے لگے صحن میں چارسو
بھاپ اُڑنے لگی
چائے کی چسکیاں
کیف زا، تازگی بخش، راحت فشاں
سُرخ ہونٹوں کے لمسِ حسیں کی طرح
گُدگُدانے لگیں
اذکیہ[1]، دل لگی، چلبلے قہقہے
بے محابا فضا میں بکھرنے لگے
رنگ پر محفلِ رنگ آنے لگی

یوں ہی ہر صبح کے عارضِ نور پر
گرم آغوش میں دن کے سوئی ہوئی
شام کی زُلفِ مدہوش چھانے لگی
اور ہر شام کی مستئ دسرخوشی
خواب زاروں کی مہکی ہوئی راہ سے
چائے خانے کے آنگن میں آنے لگی
اور پھر صبح دم
چائے خانے کا در وا ہوا۔

تاشقند۔ اپریل ۱۹۶۶ء

---

[1] ازبکی زبان میں بذلہ سنجی اور ضلع جگت کو اذکیہ کہتے ہیں۔

ظ. انصاری

مرزا غالب کی مثنویاں

مصنف نے غالب کی تمام فارسی کے ترجمے اور تشریح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ اور رسالہ میں فارسی مثنویوں پر کام کیا ہے۔ یہ مضمون اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

غالب نے زندگی کے کم و بیش ساٹھ سال فکر و فن کی ریاضت میں بسر کیے۔ عمر اور مشاہدے کی پختگی کے ساتھ ان کی تنقیدی نگاہ بھی گہری ہوتی گئی۔ اور اپنے کام اور کلام پر رد و قبول کا عمل برابر جاری رہا۔ اب جو ہم ان کی تمام نثر و نظم اردو و فارسی کا ذخیرہ سامنے رکھتے ہیں تو ان کا یہ دعوٰی بے جا نہیں معلوم ہوتا کہ ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ　　بگذر از مجموعۂ اردو، کہ بے رنگ من است

فارسی بیں تا بدانی کاندر اقلیم خیال　　مانی و ارژنگم و آں نسخہ ارتنگ من است

کلیات نظم فارسی میں یہ (۹ شعر کا) ساتواں قطعہ استاد شہ ذوق کو خطاب کرکے کہا گیا ہے۔ اس نے اپنے اردو کلام کی بے حیثیتی جتانا مقصود نہیں۔ بلکہ ذوق کی "پرگوئی" کے مقابلے میں اس پہلو پہ زور دیا گیا ہے کہ میرے کلام فارسی کو دیکھو، رنگارنگ نقش نظر آئیں گے، تم پر میرا مقام ظاہر ہوگا اور جانو گے کہ میں مانی اور ارژنگ کی فکر کا معتقد ہوں اور میرا فارسی کلام ہی کمال فن کا ایک شاہکار ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ مقدار میں تو غالب کی فارسی شاعری اردو کی نسبت سے چوگنی ہے لیکن اس کے علاوہ جتنی صفات ان کی اردو غزلوں میں ہم کو نظر آتی ہیں، وہ سب کی سب فارسی میں اور بھی چوکھا رنگ رکھتی ہیں۔ انھوں نے ہر صنف سخن سے جی لگایا ہے اور اپنی دشوار پسندی کے باوجود ہر زمانے کے فارسی اسلوب (سبک) کو آزمایا ہے۔ یہاں تک کہ آخری وقت میں (انیسویں صدی کے ایرانی شاعر) قاآنی کا کلام ہاتھ آ گیا تو اس رنگ میں بھی حوصلہ نکالا ؎

بلہ من عاشق و انم تشنہ نایاب ہو، ناظر حسن صفا تم تشنہ نایاب ہو،

اس پہلو کی آخری عمر کی دو فارسی مثنویاں بھی گواہ ہیں جو مختصر ہونے کے باوجود سادگی بیان میں الگ چاشنی رکھتی ہیں۔

قصیدہ گوئی اور غزل کی صنف میں غالب کا مقام طے ہو چکا ہے۔ اور زیادہ تر غزلوں کے ورنہ قصیدوں کے شعر زبانوں پر رواں ہوئے ہیں ان کی فارسی شاعری کا بھاری بھرکم حصہ مثنویوں میں بھی تھا اور ادھر پچاس برس سے چونکہ ادب دوستوں میں مثنوی کی شاعری زیادہ نگاہ میں نہیں رہی ؛ غالب کی مثنویاں دبی رہ گئی ہیں۔

غالب نے کل اٹھارہ مثنویاں لکھی ہیں۔ ۱۳ فارسی میں اور پانچ اردو میں۔ اردو کی مثنویاں رائج دیوانوں میں شامل ہیں تاہم ، آم کی تعریف میں ، ایک مختصر مثنوی کے علاوہ کوئی مقبول نہ ہوئی۔ " قادر نامہ ، خالق باری کے طرز کی مثنوی ہے بچوں کو اردو فارسی؛ لغات یاد کرانے کے لئے ، ایک اپنی کتاب نثر فارسی " پنج آہنگ ، کا منظوم اشتہار ہے بہت پُر لطف۔ لیکن جب " پنج آہنگ ، خود ہی پرانی کتابوں کے محافظ خانے میں پہونچ گئی تو اس اشتہار کی کیا حیثیت! ایک گیارہ شعر کی مثنوی ہے • پتنگ اور دل کی تمثیل جو بچپن کی لکھی ہوئی ہے اور مشہور شعر کی تضمین بن گئی ہے ؎

رشتہ در گردنم افگندہ دوست　　　می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

اور آخری مثنوی تین شعر کا ایک دیباچہ ہے جو مثنوی کی صنف میں قطعہ کے طور پر کہا گیا ہے ——— بس!

ظاہر ہے کہ اردو کی ان پانچ مثنویوں میں کوئی بھی نہ تو سنجیدگی سے لکھی گئی اور نہ اس حیثیت سے تولی گئی۔

فارسی میں بھی آخری دو مثنویاں زود رَوی کی لکھی ہوئی ہیں ایک نواب محمد علی خاں ٹونک کے جشن مسند نشینی پر نو شعر کی مبارکباد ، جو ۱۸۶۰ء کے بعد کا ہے۔ اور دوسری منشی جواہر سنگھ جوہر کے نام منظوم خط جس میں انہیں گھر واپس آنے کی سخت تاکید کی گئی ہے۔ اس میں ستر برس کے بوڑھے غالب کا انداز بیان ہی ملتا ہے۔ بڑی نرمی اور سادگی ہے لفظ کی تکرار میں موسیقی ہے اور انتہا ہے ؎

:

وفا جو ہرا از تو غم دور باد　　　دلت سرخوشِ بادہ سور باد

رسید از تو الفت فزا نامۂ　　　رواں تازہ کُن دلکشا نامۂ

ز رنجوریِ من مخور غم کہ من　　　ندارم غم ہستیِ خویشتن

معلوم ہوتا ہے کہ کلکتہ کے سفر (۱۸۲۶ء) تک غالب نے مثنوی کی طرف خاص توجہ نہیں کی تھی۔ بنارس میں دو روزہ قیام ہوا ، خنک ہوا لگی ، آب رواں میں شہر کے حسن کا نظارہ کیا اور ، کعبہ ہندوستاں ، نے ان سے سرگوشی کی کہ ؎

بھوکے نہیں ہیں سیر گلستاں کے ہم ولے　　　کیونکر نہ کھائیے کہ ہوا ہے بہار کی

تماشا دوست طبیعت مچل گئی مگر تیس برس کے غالب کی طبیعت تھی جیسے سفر کی کٹھن چھاؤں میں اپنا گھر یاد آیا ، بیوی بچے کی فکر ستانے لگی اور جی بہلانے کا لطف جاتا رہا ؎

سرو سرمایہ غارت کردۂ تو　　　زتو نالاں وسلے درپردۂ تو

غالب زندگی بھر دو جوانی کے چند سال گزار کر) کبھی اتنے آپے سے باہر نہیں ہوئے کہ گھر بار ان کو بھول جائیں جن کی ذمہ داری کاندھے پر اٹھا رکھی تھی۔ یہ ان کے کلیات کی تیسری مثنوی ہے "چراغ دیر" اور بنارس کی مدح میں جتنی نظمیں ہماری نظر سے گذری ہیں ان سب پر بھاری ہے۔ پانچویں مثنوی " بادِ مخالف "، ہے جو کلکتے کے قیام میں لکھی گئی یہ مقامی معترضین سے صلح صفائی کی خاطر شوخ معذرت نامہ ہے۔

۱۸۴۵ء / ۱۲۶۱ھ میں جب غالب کا کلیات نظم فارسی چھپ کر نکلا ہے تو اس میں کل پانچ مثنویاں شامل تھیں۔

"سرمۂ بینش "، پچاس شعر میں پیر و مرشد بہادر شاہ ظفر کے روحانی فیض کا بیان۔ یہ پہلی مثنوی ہے جو مولانا روم کے مثنوی کے اول شعر ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند　　　وز جدائی ہا شکایت می کند

سے شروع ہوئی ہے۔ غالب نے اپنی طرف سے نہیں بلکہ بہادر شاہ کی زبان سے تصوف کے معمولی نکات بیان کئے ہیں۔ اور بادشاہ کو ایک ملتی ہوئی سی دعا دے کر قصہ کوتاہ کر دیا ہے ؎

بر دعائے شہ سخن کوتاہ باد　　　تا خدا باشد بہادر شاہ باد

" درد و داغ "، دوسری مثنوی ہے۔ کئی وجھوں سے ظاہر ہے کہ یہ ترتیب کلام کی تاریخ ولادت سے کوئی نسبت نہیں رکھتی۔

" درد و داغ "، ایک مصیبت زدہ کسان کنبے کی فرضی داستان ہے کہ وہ فقر و فاقہ سے تنگ آ کے گھر چھوڑ دیتا ہے۔ ماں باپ اور بیٹا تینوں پیاس کے مارے ایک سنیاسی بزرگ کی کٹیا پر پہونچتے ہیں۔ پانی بھی ملتا ہے اور مراد بھی۔ ہر ایک کو ایک ایک دعا قبولیت کے درجہ تک پہونچانے کا یقین بخشا جاتا ہے۔ عورت جوانِ رعنا ہو گئی اور ایک شکاری شاہزادے کے ساتھ بھاگ نکلی۔ بڑھے نے بد دعا کی کہ اس بے وفا کی صورت مسخ ہو جائے وہ مادۂ خوک، بن گئی، "خوک شد و بدنفسی ساز کرد "۔ شہزادے نے اسے اپنے گھوڑے سے گرا دیا اور چلتا بنا۔ وہ شوہر اور بیٹے کے قدموں میں لوٹنے لگی۔ مجبوراً بیٹے نے اپنے حصے کی دعا صرف کردی کہ میری ماں کو اصلی صورت مل جائے۔ تین دعائیں قبول ہو کر بھی یہ بدنصیب کنبہ وہیں کا وہیں رہا۔ اور ثابت ہوا کہ خدا کی مشیت اندھے کی لاٹھی نہیں بلکہ عین حکمت ہے۔

" رنگ و بو "، چوتھی مثنوی پھر ایک فرضی کہانی ہے۔

بود در آں دولتے از خسرواں　　　غازۂ کشِ عارضِ ہندستاں

بادشاہ نے بے محابا بخششوں سے اپنی دولت اور اقبال مندی کو ناراض کر دیا۔ وہ رخصت ہو چکے تو

ہمت کی باری آئی، وہ بھی جانے لگی تو بادشاہ نے اس کا بازو تھام لیا:

اے زتو کارِ دو جہاں ساختن چوں تو نباشی، چہ تواں ساختن

تیرے ہی دم سے تو دونوں جہان کے کام بنتے ہیں، تو ہی تیرے دم کے ساتھ نہ رہی تو پھر مجھ سے کیا بن پڑے گا یہاں تک پہونچ کر شاعر اپنے کرموں کا رونا رو رہا ہے۔ اور خود پر تنقید کی ہے۔

گرمیِ خونت کہ ازیں بیش بود صَرفِ بَر انداختنِ خویش بود

اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو کچھ گیا، وہ گیا، اب ہمت بلند رکھو اور دنیا کو ہیچ سمجھو۔

ہمّت اگر بال کشائی کند صعوہ تواند کہ ہمائی کند

اگر ہمت بازو کھول دے تو ممولہ ہما کا رتبہ پا جائے۔

پانچویں مثنوی وہی "بادِ مخالف" ہے جس میں فارسی ناشناس بدذوق نکتہ چینیوں کے نام صلح نامہ بھی ہے اور چھینٹے بھی۔

از منِ مارسائے ہیچ مداں معذرت نامۂ لیست زی یاراں

مثنویوں میں ۱۸۴۵ء تک بس اسی قدر شامل کیا ہے۔ حالانکہ ہمیں معلوم ہے کہ وہ برسوں پہلے اپنے کرم فرما مولانا فضلِ حق خیرآبادی کے کہنے سے وہابیوں کے رد میں ایک اچھی خاصی جاندار مثنوی لکھ چکے تھے۔ اسے کلیات میں شامل نہ کرنے کی ایک ہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ایک فقہی مسئلے سے غالب کے دل کا علاقہ نہیں تھا۔ دوست کا دل رکھنے کو مثنوی لکھی تو وہ گویا ان کے حساب میں مل گئی۔

جیسا کہ سال بعد یہی کلیات پھر غالب کی زندگی میں چھپتا ہے تو اس میں غزلوں کا اضافہ بہت کم اور مثنوی کا بہت زیادہ ہے۔ اب یہاں دو ہزار سے اوپر اشعار کی گیارہ مثنویاں شامل ہیں اور آخری (ایک ہزار ۸۰ شعر کی) مثنوی "ابر گہر بار" بھی شریک ہے۔ جو وہ کئی برس سے رک رک کر کہہ رہے تھے اور علاحدہ بھی چھپوا چکے تھے۔

غالب نے اپنے اس شاہکار شعری کارنامے "ابر گہر بار" کو الگ سے دو صفحے کا مختصر دیباچہ دیا ہے جس سے ان کے فنکارانہ وجود کے اندر جھانکنے کا موقعہ ملتا ہے:

.... جب ہڈیوں کے اس ڈھانچ کو جس کا نام غالب ہے۔ گویائی کی قوت دی جانے لگی تو اس میں عرفی شیرازی کے طرز کا نمک اور نظیری نیشاپوری کے انداز کی مٹھاس ملادی اور غیب سے حسن کی شور انگیزی اور گوہ ریزی بھی شامل کردی ...... جب مثنوی لکھنے کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو فردوسی کو رہنمائی کے لئے اور نظامی گنجوی کو پشت پناہی کے لئے تعینات کر دیا...... خاص کر مناجات میں ایک اچھوتے انداز میں رندانہ اور قلندرانہ سخن سرائی کی ہے کہ بہشتی فرشتوں کے ہونٹوں پر یاھو کرتے کرتے چھالے پڑ گئے۔ اور معراج کے ذکر میں

فکر سے اتنی اڑان کی کہ خود کلام کو معراج نصیب ہو گئی۔ کلام کے وہ ناشناس جو ہندوستانی فارسی گویوں کی بو کاس کے عادی ہیں، میرے خداداد جوہر کو کیا خاک سمجھیں گے......."

پھر معاصرین کی قدر ناشناسی پر داد طلب ہیں اور مثنوی کا آخری ورق "لطفہ فقت بیافتن توفیق داستان طرازی" کا سبب ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کو قرار دیا ہے جس نے جسموں میں جان اور جانوں میں سکت، دولت مندوں کے پاس زر اور سخنوروں کے پاس سخن نہ چھوڑا، ....

"......... خدا گواہ کہ زندگی میں دوستوں سے سخن کی داد ویسی نہ پائی جیسی ملنی چاہئے تھی تو اب کیا امید رکھوں کہ وہ میرے مرنے کے بعد دعائے مغفرت کریں گے........"

"ابر گہر بار" کے اس دیباچے سے جو اُن کی زندگی میں ہی کم از کم دو بار چھپ چکا تھا، اور معاصرین کی نگاہ میں تھا، ہمیں یہ نکتے ملتے ہیں:

- وہ اپنے فارسی کلام میں مغلیہ دور کے بہترین فارسی شاعروں کے حسن بیان کا نچوڑ دیکھتے ہیں۔ جن کے ہاں بانکپن کا انداز بھی ہے اور لہجے کی گھلاوٹ بھی۔ یہاں نہ وہ فیضی کا نام لیتے ہیں نہ بیدل کا جس سے ظاہر ہے کہ زیادہ پیچیدگی، لفظی کاواک اور حد درجہ باریک بینی، استعارے اور کنایے کا آئیڈیل سامنے نہیں رکھتے۔ اختصار کے لحاظ سے بیدل اور حزیں کی فارسی مثنویاں موجود تھیں لیکن وہ اُن کا نام تک نہیں لیتے۔
- مثنوی لکھتے ہوئے اُن کے پیش نظر فردوسی کے شاہ نامہ اور نظامی کے خمسہ (پانچ طویل مثنویوں) کا آئیڈیل تھا۔ ان دونوں کو شاعر نے اپنی ترنگ میں للکارا بھی ہے۔ غالب کو رزم کے بیان میں فردوسی کے مقابل اور بزم میں نظامی کے سامنے طلب کرنا چاہیے۔
- غالب کو اپنی مناجات کے اچھوتے پن پر فخر ہے اور چوں کہ ہزار برس سے تمام مثنوی نگاروں کے ہاں "مناجات" ایک لازمی جز رہی ہے اس لئے ہم غالب کی مناجات کو فارسی اور اردو کی ہزاروں مثنویوں میں قابلِ ذکر مناجاتوں کے ساتھ تول سکتے ہیں۔
- غالب نے فکر و فن کی پختگی کے خاص اس دور میں مثنوی پر محنت کی تو ضرور اس صنف کو تھمے ہوئے، سنبھلے ہوئے انداز میں سنجیدہ اور مربوط بیان کے قابل سمجھا۔ اور جب سخنوری کے زور میں فرق اور ذہنی ربط میں فتور آتے دیکھا تو قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔ شعر کہے، خط لکھے، نقد کے معرکے لڑے لیکن مثنوی نہیں لکھی۔

"آثار الصنادید" میں سرسید احمد خاں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۰ء سے پہلے تک یہ مثنوی، جس کا غالب نے لمبا چوڑا پلان بنایا تھا تقریباً اتنی ہی ہو چکی تھی جتنی اب ہے۔ مثنوی جب الگ سے چھپی ہے ۱۸۴۵ء میں، تب بھی کم و بیش اتنی ہی تھی تو گویا یہی گیارہ سال تک وہ آگے نہ بڑھ سکی اور پھر ۵۷ء کے ہنگامے نے اس

میں اضافے کی امید بھی بجھادی۔ اگر محض یہی ہنگامہ ایک سبب ہوتا تو اس سے پہلے غالب کو گیارہ سال کسی قدر سکون اور اطمینان کے ملے تھے، کیوں آگے نہ بڑھا سکے۔

ہم سمجھ سکتے ہیں کہ انھوں نے " ابر گہر بار " کو چاہے جو بلند بانگ مقصد قرار دیا ہو، لیکن اسلامی رزمیہ نظم کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ جو شخص " مناجات " میں آنکھیں نیچی کر کے بخشش کی دعا نہ مانگ سکے اور " دامن یزداں چاک " کرنے پر اتر آئے جس نے اپنے اعمال کا حساب دینے کے بجائے خدا سے حساب فہمی شروع کر دی ہو ؎

بفرمائے کاین داوری چوں بود
کہ از حرم من حسرت افزوں بود

(ذرا یہ تو فرمایئے کہ کہاں کا حساب کتاب ہوگا اگر میرے حساب میں جرم اس سے کم نکلے جتنی حسرتیں آپ کی طرف نکلتی ہیں) وہ اس راہ میں دور نہ جا سکتا تھا۔

مولانا شبلی نے نظامی کی مثنوی " سکندر نامہ " پر تنقید کرتے ہوئے نکتے کی بات لکھی ہے ؛

"...... سکندر نامہ کے انتخاب میں غلطی ہوئی لیکن مجبوری تھی۔ قومی تاریخ فردوسی کے حصے میں آ چکی تھی۔ رسول اللہ صلعم کے غزوات اور خلفا کے معرکوں میں شاعری کی گنجائش کم تھی کیونکہ اصلیت سے بال برابر ہٹتے تو مذہبی عدالت میں مجرم قرار پاتے اور شاعروں کے لئے کچھ نہ کچھ آب و رنگ چڑھانا ضرور تھا........ اب اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ کسی مشہور کشورستان کی داستان اختیار کی جائے......... "

غالب بھی غالباً موضوع کے انتخاب میں مارے گئے ـــــ ـــــ اور جس مقام پر قلم رکا ہے وہاں تکرار پھر کر بالآخر یہی عذر پیش کیا ہے ؎

بمستی توان نغز گفتار بود
مرا باید از خویش ہشیار بود

(مستی میں آدمی ایک سے ایک مزے کی بات کہہ سکتا ہے لیکن یہاں مجھے اپنے آپ سے ہشیار رہنا پڑے گا)

بہ بزمے کہ درد سے بود آفتاب
زدود درسمود دستور اب و زکباب

سخنور چہ گفتار پیش آورد
کزاں بزم بر روئے خرمی آورد

(جس محفل میں شراب و کباب اور نہر و نغمہ سے پرہیز لازم ہو وہاں شاعر زبان کھولے بھی تو ایسا کیا کمال دکھائے کہ اس سے دل کسی خوش ہو جائے)

دریں بزم او باش را بار نیست
مے و ساغر و زخمہ و تار نیست

سو باتوں کی ایک بات یہ کہ اس محفل میں " اوباش " کا گذر نہیں، کیونکہ ساز و صہبا کی گنجائش نہیں ہے۔ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر۔ اور اسی کو اصل سبب سمجھ کر معذرت قبول کرنی چاہئے اور غالب کے

اس شعری کارنامے میں دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انھوں نے "مناجات"، "منقبت"، "ساقی نامہ" اور "مغنی نامہ" میں کیا گل کھلائے ہیں۔

چھٹی مثنوی "شانِ نبوت و ولایت" میں ہے جس کا مقصود یہ کہ وحدانیت پرستی کا ہرگز یہ منشا نہیں کہ محمد اور علی اور اولیاء اللہ کو نہ مانو، ان کی قبروں پر نہ جاؤ، ان کے وسیلے سے دعائیں نہ مانگو، خدا پرستی میں ان بزرگوں کی عظمت ماننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ مسئلہ مسلمانوں میں آج تک اسی طرح نزاعی ہے جیسے غالب کے زمانے میں تھا۔ دہلی کا شاہ ولی اللہی خاندان اس قبر پرستی کو بت پرستی کے قریب سمجھتا رہا اور اب دیوبندی عقیدہ ان کا وارث ہے۔ رسوم کے ملک ہندوستان میں خاص کر اورنگ زیب کے بعد، طوائف الملوکی اور بے یقینی کے ہندوستان میں ظاہری رسموں نے بڑا رواج پایا اور خانقاہیں مسجدوں سے زیادہ آباد ہوگئیں تو ولی اللہی مجاہد شاہ اسمٰعیل اور سید احمد بریلوی اٹھے، انہوں نے اپنے دور کی بت شکنی شروع کی۔ اور مولوی فضل حق خیرآبادی وغیرہ نے ان سے ٹکر لی (مولانا کے اہم عربی رسائل میں ایک وہ بھی ہے جو زمین کی حرکت کے نظریے کے خلاف لکھا گیا جب تمام یوروپ اس نظریے کو قبول کر کے آگے جا چکا تھا) غالب نے فضل حق کے نظریئے کی تائید میں قلم اٹھایا مگر نہ جانے کدھر نکل گئے کہ انہیں ترمیم کرنی پڑی ———— اور وہی ترمیم شدہ مثنوی ہمارے سامنے ہے جس کا زور اس نکتے پر ہے۔

بت رسم خاص در ہر مرز و بوم خود چہ می خواہی ز نفیِ ایں رسوم

(ہر ایک سرزمین، ہر ایک کی اپنی رسم ہوتی ہے، ان سے انکار کر کے تم آخر چاہتے کیا ہو؟)

دو مثنویاں بہادر شاہ اور ولی عہد فتح الملک کو عید کی مبارک باد میں ہیں، مختصر اور ہلکی پھلکی، قصیدۂ تہنیت کا اہتمام نہ کر سکے تو مثنویوں سے کام چلا لیا، رسم ادا ہوگئی۔

نویں[9] مثنوی شاہ اودھ کی نثری تصنیف کا منظوم دیباچہ ہے۔ جس سے اصل تصنیف کے مضمون کا پتہ نہیں چلتا البتہ بادشاہ سلامت کی مدح خاصی ہے (غالب کو دربار اودھ سے وظیفہ ملنے کی توقع تھی جو ۱۸۵۰ء میں پوری ہوئی)

بہ دارائی خرد مند یگانہ بہ دانائی شہنشاہِ زمانہ

(حکومت کا بندوبست چلانے میں تو شاہ اودھ بے مثل دانش ور ہیں اور دانش وری میں شہنشاہِ وقت ہیں) اس خردمندی اور شاہنشاہی، دونوں کا انجام غالب کو ہم سے بہتر معلوم تھا۔

دسویں مثنوی "آئینِ اکبری" کے سرسید اڈیشن کی تقریظ ہے۔ جسے موصوف نے اپنی کتاب میں شامل نہیں کیا۔ اور دلوں میں رنجش بیٹھ گئی۔ جواد الدولہ عارف جنگ سید احمد خاں نے ۱۸۴۷ء میں عمر

کے ۱۸۵۰ میں سال بڑی محنت سے آثار الصنادید مکمل کی تھی تو غالب نے اس کی تقریظ نثر میں لکھی پہلے مصنف سے اپنا خلوص کا رشتہ جتایا، سید احمد کے عمل کی تعریف کی اور لکھا کہ اس کتاب سے ۰ گذرے ہوئے کے کاموں کا علم ہوگا اور آنے والوں کی آگاہی بڑھے گی، " کہ ہم بر آگندگان سپاس نہادو ہم آیندگاں را آفریں گوئے ساخت" لیکن ۸، ۹ برس بعد جب ابوالفضل کی کتاب قانون " آئین اکبری،، کو سید احمد خاں نے تصحیح کے ساتھ تیار کر کے چھاپنا چاہا تو غالب سے پھر تقریظ لکھوائی۔ یہ ۱۸۵۷ء سے سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے کہ غالب نے اس تاریخی کام کو " مردہ پروردن ،، قرار دیا اور لکھا کہ

برچنیں کارے کہ اصلش ایں بود   آں ستایدکش ریا آئیں بود

(جس کام کی یہ اصلیت ہے اس کی تو وہی تعریف کرے جو ریاکاری برتنے کا عادی ہو)

مثنوی کا موڑ یہاں ہے ؎

گرز آئیں می رود با ما سخن   چشم بکشا اندری دیر کہن

صاحبان انگلستاں را نگر   شیوۂ و انداز اینان را نگر

اب اگر آئین ، (انتظام سلطنت) کی ہی گفتگو کرنی ہے تو آنکھ کھول کر اس پرانے بتخانے (دنیا) میں انگلستان کے صاحبوں کو دیکھو، ان لوگوں نے کیا دستور نکالا ہے، یا انداز پایا ہے، اس پر غور کرو کہ انھوں نے پتھر سے نکالنے کے بجائے تنکوں سے آگ نکالی، بھاپ اور دھوئیں سے انجن چلا دیئے۔ پانی پر اسٹیمر دوڑائے، تار برقی ایجاد کی، سڑکوں پر گیس کے ہنڈے جلا دئے۔ آج جو آئین جاری ہے اس کے مقابلے میں پچھلے آئین پرانے ہو کر رہ گئے ہیں۔

ہر خوشے را خوشترے ہم بودہ است   گر سرے ہست افسرے ہم بودہ است

(ہر ایک خوب سے خوب تر موجود ہوتا ہے، اگر سر ہے تو اس کا تاج بھی ہے) خدا کا فیض برابر جاری رہتا ہے۔

غالب نے " آئین اکبری،، کی تاریخی اہمیت نہ پہچانی (جو انیسویں صدی کے یورپ میں مانی گئی) اس حقیقت کو انیسویں صدی کے دہلوی ماحول میں دیکھنا چاہئے جس میں غالب بسر کر رہے تھے البتہ جس پہلو کی اہمیت ہے اس مثنوی میں وہ ہے ؎

مردہ پروردن مبارک کار نیست   خود بگو کاں نیز جز گفتار نیست

یہ مثنوی کلیات نظم فارسی میں کم و بیش نو سال گمنامی کے غار میں پڑی رہی زمانے نے پلٹا کھایا تو اس مثنوی کی روشنی میں ہم نے غالب کو سر سید کا پیش رو پایا " آئین اکبری،، شائع کرانے کے کوئی بیس برس خود

سرسید کا کیا رخ تھا؟ وہی سید تھے جنھوں نے بعض انگریز ماہرین تعلیمات کی رائے کے برخلاف اس پہ زور دیا کہ اعلی تعلیم انگریزی زبان میں دی جائے۔ اور مغربی علوم کو تعلیم یافتہ طبقے میں عام کیا جائے۔ غالب سرسید سے پورے تیس سال بڑے تھے اور فکر کی رسائی میں بھی آگے نکلے۔

> افسوس کہ مولانا حالی، جن کے سامنے دونوں کی زندگی کے ورق کھلے پڑے تھے اور سماجی زندگی کا بھی چولا بدلا جا رہا تھا۔ غالب اور سرسید کے اس واقعہ کو (" یادگار غالب " اور " حیات جاوید ") دونوں سوانح عمریوں میں بیان کرتے ہیں لیکن
>
> " .... گو ان (غالب) کی یہ رائے غلط ہو یا صحیح مگر جو کچھ " آئین اکبری " اور اس کی تصحیح کی نسبت ان کا خیال تھا اس کو تقریظ میں ظاہر کئے بغیر نہیں رہے .... "
>
> فرما کر گذر گئے ہیں۔ کاش مولانا حالی بھی اس مثنوی کے قضیے کی نسبت ان کا جو خیال تھا وہ ظاہر کئے بغیر نہ رہتے۔ اور آئندہ نسل کے سوانح نگار کو صاف گوئی کا ایک آدھ نمونہ دے جاتے۔

گیارہویں مثنوی " ابر گہر بار " ہے جس کا ذکر تمام غالب شناسوں کے ہاں آیا ہے، لیکن اس کی اہمیت اقبال کے " شکوہ " کے گھر گھر عام ہونے کے بعد کھلی ہے۔ اگر غالب نے اس مثنوی کے سوا کچھ نہ لکھا ہوتا تب بھی ہم انہیں فارسی زبان کا ایک عظیم الشان ہندوستانی شاعر شمار کرتے جو عرفی، نظیری، اور ظہوری سے کسی طرح کم رتبہ نہیں ہے۔ اور امیر خسرو کو چھوڑ کر باقی " پوچ گویان ہند " پر اس کا غصہ بالکل برحق تھا۔

اسی مثنوی پر ہم تفصیل سے گفتگو کر رہے ہیں۔

غالب کی تیرہ فارسی مثنویوں میں چند ایسی ہیں جو کسی شمار قطار میں نہیں آتیں : بہادر شاہ ظفر کی صوفیانہ نکتہ دانی پر پہلی مثنوی، چھٹیں اور ان کے ولی عہد کو عید کی مبارک باد، ساتویں اور آٹھویں مثنوی اور شاہ اودھ کی تصنیف پر منظوم دیباچہ نویں مثنوی۔ بارہویں اور تیرہویں، جو کلیات میں شامل نہیں ایک مدحیہ قصیدے کی تلافی ہے، اور ایک منظوم خط، جس کا ذکر آ چکا۔ باقی سات مثنویوں میں سے دو میں فرضی قصہ ہے، وہ بھی برائے نام۔ ایک " درد و داغ " اور دوسرے " رنگ و بو " جن کا خلاصہ اوپر بیان ہوا۔

غالب کے ایک ہم عصر آغا احمد علی احمد نے مثنوی کے سات اوزان میں سے ایک وزن پر اپنی عالمانہ کتاب " ہفت آسمان " لکھی ہے۔

یہ وہی آغا احمد علی ہیں جن کے بزرگ اصفہان سے آئے اور بنگال میں رہ پڑے ۔ فارسی گویان ہند میں بن اہل علم سے غالب کی ٹھنی رہی ان کے سرخیل یہی بزرگ تھے ــــــ خصوصاً قاطع برہان کی مخالفت میں غالب نے انہی کے جواب میں وہ مشہور قطعہ لکھا ہے ؎

مولوی احمد علی احمد تخلص، نسخہ ۔۔۔ درخصوص گفتگو ئے پارسی انشا کردہ است

غالب نے ان کی علمی و ادبی قابلیت کو تسلیم کرتے ہوئے بدزبانی کی شکایت کرتے ہوئے لکھا ہے :

صاحب علم و ادب واں گہ ناز از رہ غضب ۔۔۔ چوں سفیہاں دفتر نفرین و ذم املا کرد است

(ایسے لائق فائق آدمی ہو کر غصے میں یوں چھچھوروں کی طرح کالم گلوچ پہ اتر آئے :)

معلوم ہوتا ہے کہ آغا احمد علی اصفہانی ثم بنگالی نے جو فن مثنوی کے بڑے فاضل اور خود شاعر بھی تھے ساتوں بحروں پر الگ الگ رسالے تصنیف کرنا طے کیا تھا، ابھی ایک ہی بحر کو لے پائے تھے کہ انتقال ہو گیا۔ یہ کتاب ۱۸۶۰ء میں تیار ہوئی اور ۱۸۷۳ء میں پہلی (اور غالباً آخری) بار کلکتہ Baptist Mission Press سے ٹائپ کے حروف میں شائع ہوئی ۔ مثنوی کی صنف کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ رسالہ بہت بیش قیمت ہے ۔ اگرچہ اس کے حوالے دیکھنے میں نہیں آتے ۔ ق ۔ ا

یہ وزن جس میں عاشقانہ بیان کے علاوہ دوسرے موضوع زیادہ سجتے ہیں، نظامی، خواجوی کرمانی، جامی امیر خسرو، عرفی، فیضی، بہاء الدین عاملی، علی حزیں اور قاآنی کی بعض اہم اور زندہ جاوید مثنویاں اسی بحر میں لکھی گئی ہیں مفتعلن، مفتعلن، فاعلات ۔ دو بار، فاعلات کی جگہ فاعلن کا زحاف بھی آتا ہے ــــــ (بحر سریع مطوی موقوف)

آغا احمد علی نے فارسی کی ۔ مثنویاں اس بحر میں گنائی ہیں پھر حزیں اور آقائی تک پہونچ کر غالب کی چار مثنویوں سرسری) ذکر کیا ہے کہ" درد و داغ " اور " رنگ و بو " اور عید کی دونوں" یک درقمہ، مہا رکبادیہا، اسی بحر میں ہیں۔ اسی جملے پر تان توڑی ہے۔

.... الفاظ و تراکیب متقدمان در کلامش بسیار یافت می شود ۔ ہر چہ در خوش می گذرد می نویسد قبیح بود یا فصیح ،، (یعنی اگلوں کے لفظ اور ترکیبیں ان کے کلام میں بہت ہیں ۔ جو کچھ ان کا جی چاہتا ہے لکھ جاتے ہیں، برا ہو یا اچھا)

آغا احمد علی کی پرکھ سے قطع نظر اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کی یہ چاروں مثنویاں ہمارے لئے یہ

بحر، جس میں نظامی، خسرو اور جامی نے مقابلے کے شعر نکالے ہیں، غالب کے لئے ایک دفع الوقتی ہے۔

نظامی کہتا ہے ؎

گوہر دریائے گرامی ست ایں — مخزن اسرار نظامی ست ایں

امیر خسرو نے "قران السعدین" میں نظامی کو یوں داد دی ہے ؎

نظم نظامی بہ لطافت چو دُر — وز دُر او سر بسر آفاق پُر

(نظامی کی نظم پاکیزگی میں موتی کے مانند ہے اور تمام دنیا میں اس کا شہرہ ہے)

مولانا جامی نے "تحفۃ الاحرار" میں یہ دعا مانگی ہے ؎

رشح ازاں بادہ بجامی رساں — رونق نظمش ز نظامی رساں

(اس شراب کی ایک بوند جامی کو بھی عطا کر کہ نظامی کی نظم کی رونق اسے بھی ملے)

پھر جامی ہی کا شعر آتا ہے ؎

ہیکل آیات گرامی ست ایں — مدح مخواں، خطّ غلامی ست ایں

(اگرچہ یہ مثنوی نظامی کی نظم سے بہتر ہے لیکن اسے تعریف نہ سمجھئے، غلامی کا پروانہ لکھ دیا ہے)

مرزا نے نظامی کے شانے پر سے اچکنے کی کوشش میں اتنا بھی نہ سوچا کہ نظامی نے زندگی بھر نہ مدحیہ قصیدے لکھے نہ غلامی کے پروانے۔ بادشاہوں نے البتہ ان سے تمنا کی کہ وہ کچھ "خراج فن" قبول کریں اور اپنی ایک آدھ تصنیف ان کے نام منسوب کر دیں۔ چنانچہ نظامی کی پانچوں شاہکار مثنویاں (خمسۂ نظامی) شاہان نزدیک و دور سے منسوب ہیں۔ وہ سلطنتیں مٹ گئیں لیکن مثنویوں میں ان کے نام اور قدر دانی کے انعام محفوظ رہ گئے۔

اگر اس مضمون کو غالب کی تمام فارسی اردو مثنویوں کا احاطہ نہ کرنا ہوتا تو ہمیں شروع میں ہی صرف پانچ مثنویوں کو چن لینا چاہئے تھا۔ یہ وہی ہیں جن کا ہم تعارف کرا آئے ہیں۔ "چراغ دیر"، "باد مخالف"، "در شان نبوت ...."، "تقریظ آئین اکبری"، اور "ابر گہر بار"۔ اور ان میں بھی پانچویں مثنوی ہے (کلیات میں گیارھویں) جو غالب کی مثنوی نگاری کا سب سے اعلیٰ نمونہ بھی ہے اور اپنے حجم میں باقی دس کے برابر۔

"چراغ دیر"، اگرچہ سفر میں یا وطن کی پھانس نکالنے کے لئے لکھی گئی تاہم اس کی اہمیت

تعالی اللہ بنارس، چشم بد دور — بہشت خرّم و فردوس معمور

میں پوشیدہ ہے اور یوں لہک لہک کر بنارس (جو آجکل پھر سے "وارانسی" ہو گیا ہے) کی تعریف کی ہے گویا اب دلی سے سروکار نہ رکھیں گے۔

ممکن نہیں کہ غالب کی نگاہ میں شیخ علی حزیں کے وہ اشعار نہ ہوں جن میں ایک بہت مشہور ہے ؎

از بنارس نہ روم معبد عام ست ایں جا — ہر برہمن بچہ لچھمن و رام ست ایں جا

شیخ تو بنارس ایسے گئے کہ وہیں رہ پڑے لیکن میر درد کے شاگرد ہدایت جو بنارس پر فدا ہو گئے تھے کی ... مثنوی در مدح بنارس کا ذکر تذکروں میں آیا ہے۔[1]

ولی دکھنی نے جو (گجرات میں بہت رہے) سورت شہر کی تعریف میں ایک اعلیٰ درجے کی مثنوی لکھی ہے۔ غالب ... سے غالباً گذری ہوگی۔ فارسی زبان و ادب کے ماحول میں بسر کرنے والے ان اہل نظر کی طبیعتیں کس قدر تماشا ... حسن آگاہ ہیں کہ ولی کو دریائے تاپتی میں جو جلوہ نظر آیا وہی غالب کو گنگا کے آئینے میں دکھائی دیتا ہے۔ ... کہتے ہیں ؎

بھری ہے کیسی رنگ رنگ کی سورت — ہر اک صورت ہے وہاں انمول مورت

پھر ان "موزوں" کی تعریف ہے ......

ہر اک جانب دکھو ہیں فوج در فوج — تجلی کے سمندر کی اٹھی موج

غالب کی مثنوی "چراغ دیر" سے پہلے جن مثنویوں کا چرچا تھا ان میں میر حسن کی "سحر البیان"، "فیض آباد" ... وصیف، دیا شنکر نسیم کی "گلزار نسیم" بھی موجود تھیں، وہاں جن طلسمی شہروں کے مرقع ہیں وہ خود ان شاعروں کے ... بازار سے لئے گئے ہیں لیکن غالب کی اس مثنوی کا رنگ اور ہے۔ یہاں تفصیلات کا بیان نہیں، تفصیلات ... شاعر کے تاثرات ہیں۔ اور یوں مثنوی کے عام چلن سے علاحدہ ہیں۔

بنارس کے روحانی رسیے کے آگے سر جھکانے کے بعد ذرا اس بانکی نظر پہ دوڑاتے ہیں:

میانہا نازک و دلہا توانا — ز نادانی بہ کار خویش دانا

اور پھر ....

ز رنگیں جلوہ ہا غارت گر ہوش — بہار بستر و نوروز آغوش

(کمریں نازک، دل مضبوط، الھڑپن کے ہوتے اپنے معاملے میں سیانے رنگین جلووں سے ہوش اڑا دیں ... بخشیں اور آغوش میں پھول کھلا دیں)

ظاہراً بیان کی یہ شوخی اپنے مرکز سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے لیکن ایک توسع کے عالم میں کوئی بھی پسندیدہ ... آپ سے آپ "انمول مورت" بن جاتی ہے اور دوسرے غالب محض عبادت خانہ کے تقدس پر

[1] افسوس کہ بمبئی کے کتب خانے چھاننے پر کہیں یہ مثنوی نہ مل سکی کہ مواز نہ کیا جا سکتا۔ (ظ۔ انصاری)

مرمٹنے والے آدمی نہیں تھے۔ اُن کے نزدیک لطافت بے کثافت جلوہ پیدا نہیں کر سکتی، غالب تھکے ہوئے بنارس پہونچے تھے اور سنبھلے ہوئے یہاں سے گذر گئے۔ بعد کے خطوں میں بھی بنارس کو یاد کیا ہے اور ہمیشہ اپنے دل میں احترام پایا ہے

اس دلّی سے، جو سکھ پنجاب پر فوجی مہم بھیجنے روپیہ اور جنگی سامان سپلائی کرنے والے مسلمانوں کا سینٹر بنی ہوئی تھی جہاں اُس وقت وہابی تحریک زوروں پر تھی۔ بنگال، بہار اور یوپی سے ہتھیار اور ہزاروں مجاہد اُمڈے چلے آرہے تھے۔ غالب نکلے تو بنارس میں ٹھہرے اور ان کا فوری تاثر دیکھنے قابل ہے۔ وہ ایک فرضی رہنما سے سوال کرتے ہیں۔ کہ دنیا اتنی بگڑ چکی ہے کہ تباہی کے آثار ہر طرف نظر آرہے ہیں، انسانی بھلائی اور بھائی چارہ اُٹھ گیا، پھر یہ ڈھانچ کس سبب سے قائم ہے، وہ جواب دیتا ہے:

کہ حقّا نیست صانع را گوارا　　که از ہم ریزد ایں رنگیں بنارا

(سبب دراصل یہ ہے کہ خدا کو اس دلنواز بنیاد بنارس کا گرانا اور تباہ ہونا گوارہ نہیں ہے)

یہ ہے تیس برس کی عمر میں غالب کے سینے کی وسعت کہ وہ اس مقام کو جو

عبادت خانۂ ناقوسیاں ست　　ہمانا کعبۂ ہندوستاں ست

سنکھ پھونکنے والوں کا عبادت خانہ اور ہندوستان کا کعبہ ہے۔ اپنے چہیتے دلّی سے زیادہ پُرسکون پاتے ہیں اور اس کو زمین کی میخ قرار دیتے ہیں۔ بنارس کے علاوہ غالب نے لکھنؤ اور پٹنہ میں بھی قیام کیا۔ شیعوں کا لکھنؤ خاص کر بلکہ اودھ انگریزوں کے رنگ میں رنگ چکا تھا۔ فنونِ لطیفہ کے سارے شعبوں میں "فرنگی" اثر جھلکنے لگا تھا۔ انگریز اور فرانسیسی آبائی ڈیوڑھیوں میں رہنے لگے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کئی کروڑ روپے کے حصے نوابین اودھ خرید چکے تھے، اور خرید رہے تھے۔ مذہبی زندگی پر شیعہ مجتہد اور فرنگی محل کے صُلح پسند علماء حادی تھے۔ وہاں دور مذہبی شدّت کا پتہ نہ تھا۔ پٹنہ اگرچہ براہِ راست انگریزوں کے انتظام میں تھا۔ لیکن وہاں آنچ تیز تھی۔ بہار اور بنگال سے والنیٹروں اور ہتھیاروں کی سپلائی کا دوسرا بڑا مرکز یہی شہر بنا ہوا تھا۔

ہمیں ان دونوں مرکزی شہروں کے سلسلے میں غالب کے چند خطوط کے حوالے اور تین شعر کے قطعے کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ غالب اپنی دھن میں آنکھیں بند کیے تو نہ گذرے ہوں گے۔ یہ بھی نہیں کہ یہاں جن ممتاز لوگوں نے اُن کی قدردانی کی، وہ اپنے اردگرد کے حالات سے محض نابلد تھے۔ قیاس کہتا ہے کہ کلکتہ پہونچ کر جو اُن کی آواز کھلی ہے اس کے سُر اسی راہ میں ملتے جارہے تھے اور ذہن کھلتا جاتا تھا عین اسی زمانے کا یہ شعر محض قافیہ پیمائی ہونے سے رہا ؎

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو　　کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظّارہ سے وا ہو

اگر یہ نکتہ روشن ہو جائے تو ہم نہ صرف "چراغِ دیر" بلکہ "آئینِ اکبری کی تقریظ" کی تہہ میں بھی اتر سکتے ہیں۔
اصل میں یہ اہم مثنوی بنارس پر یا بنارس کی خاطر لکھی ہی نہیں گئی مثنوی کا اٹھان فریادیہ ہے۔ دوستوں کی یاد ستا رہی ہے ؎

رقمِ سنگم شرارے می نویسم
کفِ خاکم غبارے می نویسم

پتھر سے چنگاری اڑتی ہے۔ مشتِ خاک سے غبار اٹھتا ہے اور یاروں کی محفل سے دور ہونے کی شکایت لکھی ہے ؎

مگو داغِ فراقِ بوستاں سوخت
غمِ بے مہری این دوستاں سوخت

وطن کی جدائی کا غم اتنا نہیں اکھرا جتنا ان دوستوں کی بے مروتی کھل گئی۔
غالب کے ہاں عیش و دروزہ کا لطف بزم کے دم سے ہے۔ بزم کے بغیر نہیں۔ محفل سے کٹ کر انھیں پونم کی رات پوس کی ٹھٹھری ہوئی چاندنی لگتی ہے۔ "چراغِ دیر" کی غبار نویسی میں یہاں تک لکھ گئے کہ ٹھکانے کا کیا ہے، دلی شہر نہ ہو تو بھی دنیا بھری پڑی ہے۔ آدمی کہیں بسیرا کر لے

سرِ شاخ گلے در گلستانے

لیکن پھولوں کے بغیر بسر نہیں ہوتی
اس مثنوی کے ٹھیک سال بھر بعد غالب پھر بھرے بیٹھے ہیں۔ ایک کلکتے میں انھیں ایسے بد ذوق سے پالا پڑا ہے جو (فرید آباد کے لالہ دیوانی سنگھ قتیل کو فارسی ادبیات کی کسوٹی سمجھتے ہیں۔ غالب نے پھر قتیل کے نام پر صلواتیں سنادیں تو وہ اور دب میں آ گئے۔ اور جان چھڑانا دشوار ہو گیا۔ "بادِ مخالف" میں صفائی پیش کر رہے ہیں کہ وطن کی دوری کا غم اور اپنی محفل سے جدائی کا درد مجھے تڑپا رہا ہے، اس پر رحم کرو ؎

اندہِ دوری وطن نہ گرید
غمِ ہجرانِ انجمن نہ گرید

میں نے غصے میں سخت سست کہہ ضرور دیا لیکن میں کلکتے میں اپنے وطن دلی کو بدنام کر کے جانا نہیں چاہتا۔
بعد میں کوئی کہے کہ ایک بے سرو سامان شاعر آیا تھا اور وہ

ننگِ دلی و سرزمینش بود

آہ ازاں دم کہ بعدِ رفتنِ من
خونِ دلی بود بگردنِ من

تا بوم رنجِ دوستاں باشم
بر دلِ انجمن گراں باشم

افسوس کہیں یوں نہ ہو کہ بعد میں دلی کی عزت و شہرت کا خون میری گردن پر رہ جائے۔ جب تک جیوں دوستوں کے دل پر میلی رہے اور محفل کے دل پر بوجھ بن جاؤں۔

کیا یہ وہی غالب ہیں جن کا یہ شعر زبانوں پر رواں ہے؟

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال　　　ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

وجود کی خلوت میں جو محشر بپا ہے وہ برحق سہی تاہم بامراد اور باجبر زندگی کو پورا نہیں پڑتا۔ اس کے لیے انجمن چاہیے۔ اور وہ بہ سر شاخ گلے در کفتا نے میسر نہیں آتی۔

غالب نے انجمن کی یاد میں تین آدمیوں کے نام نذر پیش کر دیے ہیں: فضل حق خیرآبادی، حسام الدین حیدر خاں، نواب امین الدین احمد

پوری انیسویں صدی میں خیرآبادیوں کا یہ خاندان، ہندوستانی مسلمانوں میں منطق و فلسفہ کی سب سے بڑی سند تھا۔ اور اس کے بزرگ فضل حق غالب کے ہم عمر ایک ہی سال کی پیدائش حسام الدین ان کے قدر داں اور عمر میں بڑے نواب امین الدین احمد سترہ سال چھوٹے تینوں دلی شہر کے نامی گرامی اور فارسی علم و ادب کے علمبردار نہایت مہذب لوگ تینوں غالب سے بہتر سماجی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ ہیں ان کی انجمن کے نمایندے۔ ان کی ذہنی خلوت کے راز دار۔ یہ کوٹھوں اور بازاروں کی شب بیداری کے ساتھی نہیں ـــــــ بلکہ ان کے کلام پر رائے دینے والے اور زبان شناس لوگ ہیں۔

کیا اس نکتے کے واضح ہو جانے کے بعد بھی ہمیں غالب کا پورٹریٹ تیار کرنے میں کسی شوخ رنگ کی ضرورت رہتی ہے؟ مثنوی میں بہ نسبت غزل کے زیادہ وضاحت ہوتی ہے اور بیان کا ایسا تسلسل بھی جس سے شاعر کے مقصد میں غلط مبحث کی گنجائش نہیں رہتی۔ غالب نے اپنے کلام میں جا بجا بزم اور انجمن کو یاد کیا ہے۔ جب وہ تنہائی کی نہیں کھوتے ہیں تو بزم آرائی کی تمنا نکل آتی ہے۔ وہ مشہور غزل،

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کیے ہوئے　　　جوشِ قدح سے بزم چراغاں کیے ہوئے

اس حقیقت کی نفی نہیں، بلکہ تصدیق ہی کرتی ہے۔

کلکتہ کے مشاعرے میں غالب نے فارسی کی دو غزلیں سنائیں۔ چند اہلِ زبان کے علاوہ پانچ ہزار کے قریب مقامی لوگ ہوں گے۔ ان میں فارسی شناسوں نے دو لفظوں پر اعتراض کیا۔ ایک یہ کہ "ہمہ عالم ہیچم" میں عالم اسم جمع ہے۔ اس پر "ہمہ" کا لفظ نہیں چاہیے۔ دوسری ایک غزل کی ردیف میں "زدہ" پر بعضوں نے آواز سے کسے کہ زدہ کی ہ پر کسرۂ اضافت تو ہو نہیں سکتا، کسرۂ ظرفیت ہو گا۔ غالب کے پیش رو قتیل کے بیان سے سند دی گئی۔ غالب نے جواب دیے۔ بعض اور علمائے زبان نے غالب کی تائید کی۔ لیکن بزم کا لطف اس ہنگامے میں رخصت ہو گیا۔

"بادِ مخالف" میں غالب کا کہنا ہے کہ یہ اندھا دھند تقلید اچھی بات نہیں ہے۔ زبان کے ثبوت میں اہلِ زبان کا کلام ہی مستند ہو گا:

کز اہلِ زباں نبود قتیل　　　　ہرگز از اصفہاں نہ بود قتیل

اگر آپ لوگ قتیل کو ہی اپنا رہنما سمجھتے ہیں تو میں اہلِ زبان (ایرانی نژاد) کو رہنما سمجھتا ہوں، طالب، عرفی، نظیری، ظہوری، علی حزیں، جلال اسیر، ان کا کلام نظر میں رکھتا ہوں اور

آں کہ طے کردہ ایں مواقف را　　　　چہ شناسد قتیل وواقف را

(جس نے یہ مقامات طے کئے ہوں وہ قتیل اور واقف جیسے شاعروں کو کیا خاطر میں لائے گا)

چلئے آپ اسے ایسا ہی بڑھاتے چڑھاتے ہیں تو میں مان لوں گا کہ اس کا کلام مور کی پنکھیوں کی طرح رنگا رنگ اور موٹی موٹی لغتوں کا انتخاب ہے......... وغیرہ۔

یہ ہنگامہ جو ایک بار ۲۸ ۔ ۱۸۲۷ء میں کلکتے سے شروع ہوا، چالیس برس بعد غالبؔ کے مرنے سے چند روز پہلے تک انھیں کچوکے دیتا رہا۔ عمر کے آخری حصے میں اس کا سبب فارسی لغت "برہان قاطع" پر مرزا کے اعتراضات تھے

سوال یہ ہے کہ:۔ کیا محض جدت پسندی کی بدولت غالبؔ سببِ نزاع بنے؟

—— کیا وہ استادانِ فن کی تقلید ناجائز سمجھتے ہیں؟

—— کیا وہ خود کو اہلِ زبان کے مدِ مقابل خیال کرتے ہیں؟

—— کیا وہ اہلِ زبان اور استادانِ فن کی تقلید اتنی لازمی سمجھتے تھے کہ ہندوستانی فارسی شناسوں کی توہین پر اتر آتے ہیں؟

"بادِ مخالف" اور "آئینِ اکبری کی تقریظ" "ابرِ گہر بار" کا دیباچہ اور "کلیاتِ نظم فارسی" کا دیباچہ اس پر ایسی درد ناک شہادتیں ہیں کہ پھر خطوط اور اشعار سے استفسار کی ضرورت نہیں رہتی۔

وہ کہتے ہیں کہ زبان اور اس کے محاوروں کے خم و پیچ میں مستند اہلِ زبان کا فرمایا ہوا سند ہے۔ اس سے ہٹ کر قیاس پر لفظ ایجاد نہیں کر سکتے۔ البتہ تحقیق کی آنکھ کھلی رہنی چاہیئے۔ اہلِ زبان کے لہجے کی تقلید نہیں کر سکتے اور ان کی غلطیوں کی نقل کرنا غلطی ہے۔

یہ زبان کا معاملہ ہے جو سماعی ہے، قیاسی نہیں لیکن زندگی کے متحرک نظام میں ہمیشہ نئے سے نئے اور بہتر سے بہتر کا وجود ہوتا رہتا ہے۔ تقلید کی نگاہ تحقیق سے بے بہرہ رہتی ہے۔ وہ قوت جس سے ہر زندہ وجود کو فیض پہونچتا ہے ہمیشہ فیض رسانی کرتی رہتی ہے۔ سرسید کو وہ یہی جتاتے ہیں!

مبدأ فیاض را شمر بخیل　　　　لوز می ریزد رطب ہا زاں نخیل

کھجور کے درخت سے پکے پکے تازہ کھجور ٹپکتے رہتے ہیں، یہ نہ سمجھو کہ اگلوں پر کمال ختم ہو گیا اور ہمیں ان کی صرف

تقلید کرنی رہ گئی ہے۔

عارفؔ رومی نے اس مضمون کے پھیلاؤ کو کیا دو مصرعوں میں لپیٹ دیا ہے!

گرچہ تقلید ست استونِ جہاں　　　　ہست رسوا ہر مقلّد ز امتحاں

(اگرچہ تقلید بڑی دنیا کا مدار ہے، لیکن جب امتحان کا کڑا وقت آجائے تو مقلد بغلیں جھانکنے لگتا ہے)

یہ پانچوں قابلِ ذکر مثنویاں جو چالیس برس کے ذہنی سفر کا پتہ دیتی ہیں غالبؔ کو ایک سالم اور مکمل ذہنی اور فنی ہستی کے طور پر پیش کرتی ہیں۔ ایسے کہ ردّ و قدح کی گنجائش نہیں رہتی۔ ان میں محض غالب کا نہیں، آدھی صدی کا مطالعہ ہوتا ہے گیارہویں اور تقریباً آخری طویل مثنوی "ابرِ گہر بار" ہندوستان میں فارسی شاعری کا کلائمکس ہے اور اس کے جوہر پر کھنے کے لئے فردوسیؔ، نظامیؔ، خسروؔ اور جامیؔ، عرفیؔ اور ظہوریؔ کی محفلوں میں غالبؔ کے ساتھ گھومنا ضروری ہے جسے ہم اگلی ملاقات پر اٹھا رکھتے ہیں۔

جگن ناتھ آزاد

اقبال

فکر و فن کا امتزاج

کلامِ اقبال کی اس وقت تک جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں اتنی شاید اردو اور فارسی کے کسی شاعر کے کلام کو نصیب نہیں ہوئیں لیکن اس کے باوجود ہر شرح نگار نے اعتراف کیا ہے کہ جہاں تک کلامِ اقبال کی تشریح کا تعلق ہے اس کا حق ہم سے ادا نہیں ہو سکا۔ اور یہ ایک حقیقت ہے کوئی بھی شرح شعر کے معانی تک پہونچ سکتی ہے اس سے آگے کی منزل تک جس کا تعلق معانی کے معانی سے ہے نہیں پہونچ سکتی "ماورائے سخن بھی ہے اک بات" کا مفہوم بیان کرنا شرح کے بس میں نہیں۔ شاعری ایک ایسی وجدانی تخلیق ہے جو اپنی مزید وضاحت کے لئے نثر کے لباس میں آنے پر آمادہ نہیں اور جہاں تک اقبال کی شاعری کا تعلق ہے۔ اسے نثر میں ڈھالنا اور زیادہ مشکل ہے۔ اقبال کا شعر احساس کے تاروں کو جس طرح چھیڑتا ہے اور دل و دماغ میں جو کیفیت پیدا کرتا ہے وہ کیفیت اس شعر کی شرح کر دینے کے بعد باقی نہیں رہتی اس لئے کہ اقبال نے فکر اور جذبے کو ہم رنگ و ہم آہنگ کر دیا ہے۔ بلکہ صحیح الفاظ میں اس نے فکر کو جذبہ بنا کر پیش کیا ہے۔

اقبال کے جن نقادوں نے اقبال داینٔ غی اور مفکر کے روپ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے تصویر کا صرف ایک ہی رخ پیش کیا ہے۔ اقبال کی مکمل تصویر ہمارے سامنے اس وقت آ سکتی ہے جب ہمارا صرف فکرِ اقبال کا مطالعہ نہ ہو بلکہ ہمارا مقصد یہ ہو کہ ہم فکرِ اقبال کا مطالعہ شعرِ اقبال کی روشنی میں کریں۔

اقبال کے بلند ترین افکار اس کے جذبے کی انتہائی گہرائیوں سے وابستہ ہیں۔ اقبال نے شعر میں جو کچھ کہا ہے اسے نثر میں بیان کرنا ہمارے لئے ہی نہیں بلکہ خود اقبال کے لئے بھی ممکن نہیں تھا۔ یہ فرق صرف نثر اور نظم کا فرق نہیں ہے بلکہ بنیادی طور پر سوچنے اور محسوس کرنے کے انداز کا فرق ہے۔

اقبال کی زیادہ تر نظمیں ایسی ہیں جن کی ابتدا ایک کیفیتِ انبساط سے ہوتی ہے اور جب ہم نظم کے آخر تک پہونچتے ہیں تو کیفیتِ انبساط کے ساتھ ہی ساتھ ایک کیفیتِ فکر کو بھی اپنا رفیق پاتے ہیں۔ یہ کیفیتِ فکر اقبال کے اس تجربے کی دین ہے جو اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بلا واسطہ نتیجہ ہے۔ یہ کیفیت ہمیں اقبال کی تقریباً ہر ہم نظم میں نظر آئے گی خواہ وہ شمع و شاعر ہو یا گورستانِ شاہی، خضرِ راہ ہو یا طلوعِ اسلام، خطاب بہ فرنگ ہو یا ذوق و شوق، ساقی نامہ ہو یا مسجدِ قرطبہ یا جاوید نامہ کے مختلف حصے ہوں

ایک اچھے شعر کی طرح کیفیتِ انبساط کی تشریح بھی خاصی مشکل ہے۔ کسی زبان کی کلاسیکی شاعری کے مطالعہ کے بعد تو کیفیتِ انبساط کا مفہوم سمجھ میں آسکتا ہے اس کے بغیر شاید ممکن نہ ہو کیونکہ اس کیفیت کا تعلق اتنا سمجھنے سے نہیں جتنا محسوس کرنے سے ہے چنانچہ اقبالؔ کے افکار کو اقبال کی شاعری سے الگ کر کے دیکھنے کا طریقہ کلامِ اقبال کی وضاحت کے حق میں ہو تو ہم قائل ہیں ہی ہمارے اپنے ذوقِ سلیم کے لئے بھی کچھ کم مضر نہیں۔

یہ صحیح ہے کہ اقبالؔ نے اپنی شاعری میں جہانِ فکر و موضوع کی کایا پلٹ دی ہے لیکن صرف اسی نقطۂ خیال سے کلامِ اقبالؔ کا مطالعہ کرنا اقبالؔ کی شاعری سے لذت اندوز اور بہرہ ور ہونے کے لیے کافی نہیں۔ اگر اردو شاعری کی تاریخ میں ہمیں پہلی بار ایک مربوط سلسلۂ فکر اقبالؔ ہی کے کلام میں نظر آیا ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم شاعری کے اس سرچشمے کو فراموش کر دیں جس نے اقبالؔ کی فکر و نظر کی تخلیق بھی کی ہے اور پرورش بھی۔

اپنی وفات سے کوئی چار ماہ قبل علامہ اقبالؔ نے یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو آل انڈیا ریڈیو لاہور سے نئے سال کا پیغام نشر کیا تھا جس میں انہوں نے امنِ عالم کا ذکر کرتے ہوئے مختلف سیاسی نظاموں کو ہدفِ ملامت بنایا تھا اور دنیا کی مختلف سیاسی جماعتوں سے یہ سوال کیا تھا کہ "کیا تہذیب کے ارتقا کا یہی انجام ہوتا ہے۔ جو ہمیں نظر آ رہا ہے اور پھر خود ہی اس سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ انسان روئے زمین پر صرف اسی حالت میں پر امن زندگی بسر کر سکتا ہے جب کہ اس کے دل میں انسان اور انسانیت کے لئے احترام کا جذبہ موجود ہو۔ صرف ایک ہی اتحاد اس وقت ہمارے کام آسکتا ہے اور وہ اتحاد بنی نوعِ انسان کا اتحاد ہے۔ جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان کی تفریق سے کہیں بلند ہے۔ ...... یہ ساری کائنات اپنے خالق کا ایک کنبہ ہے۔"

یہ ہے وہ جذبہ جس سے اقبال کی شاعری عبارت ہے اور جس کے ساتھ اقبال کا سارا فکری نظام وابستہ ہے حبِ آدم کا یہی وہ جذبہ ہے جس کی بدولت اردو شاعری کی تاریخ میں سب سے پہلی بار کلامِ اقبالؔ ہی میں ہمیں دو خلا آدر غائب ہوتا نظر آتا ہے جو اس وقت تک فنکار اور عوام کے مابین حائل رہا تھا۔ زندگی کی حقیقتیں ہماری شاعری میں پہلے بھی جلوہ گر ہوئی تھیں اور مختلف انداز سے لیکن اقبالؔ کے یہاں آکر ان حقیقتوں کے اظہار نے ایک باقاعدہ نظامِ فکر کی صورت اختیار کر لی۔ اور یہی نظامِ فکر شعرِ اقبالؔ کی ایک انمول دین ہے۔

اقبال نے اول سے آخر تک فن کے بارے میں یہ نظریہ پیش کیا ہے ——— اور اقبالؔ کی اپنی شاعری اس کی ایک دلکش مثال ہے ——— کہ تمام فنونِ لطیفہ عرفانِ حیات کی کیفیت سے لبریز ہونا چاہئیں تاکہ افراد اور اقوام کی زندگی کو صحت مند طریقے سے متاثر کر سکیں۔ فن کے بارے میں اقبال کا یہ نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے جو فن کار کو اس سماج کے روبرو لے آتا ہے جس سے وہ مخاطب ہوتا ہے اور اسی نظریئے نے اردو کے ادیبوں اور شاعروں کو حدِ نظر تک پھیلتی ہوئی ایسی وسعتیں عطا کیں جو بیسویں صدی کی ابتدا تک ان کی نظر سے پوشیدہ تھیں۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن   جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے   یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں   جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

اقبال کا حبِ آدم کا تصور کوئی وقتی یا ہنگامی قسم کا تصور نہیں ہے نہ ہی یہ کوئی ایسا تصور ہے جو کسی قسم کی سیاسی مصلحتوں سے وابستہ ہو۔ حبِ آدم کا یہ تصور اقبال کے یہاں کسی بیرونی تحریک کی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ اُس کے دل کی گہرائیوں کا ایک جذبہ ہے یہ اُس کی شخصیت کا عمیق ترین پرتو ہے جس کی تجلّی سے اقبال کی شاعری کے تمام ادوار ـــ اسرار و رموز سے ارمغانِ حجاز تک ـــ جگمگا رہے ہیں۔

اسرارِ خودی کی تمہید میں اقبال تصنیفِ مثنوی کا سبب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

شب دلِ من مائلِ فریاد بود   خامشی از یاربم آباد بود
شکوۂ آشوبِ غمِ دوراں بُدم   از تہی پیمانگی نالاں بُدم
ایں قدر نظارہ ام بیتاب شُد   بال و پر بشکست و آخر خواب شُد
روئے خود بنمود پیرِ حق سرشت   کو بہ حرفِ پہلوی قرآں نوشت
گفت اے دیوانۂ اربابِ عشق   جرعہ گیر از شرابِ نابِ عشق
بر جگر ہنگامۂ محشر بزن   شیشہ بر سر دیدہ بر نشتر بزن
خندہ را سرمایۂ صد نالہ ساز   اشکِ خونیں را جگر پرکالہ ساز
تا بہ کے چوں غنچہ می باشی خموش   نکہتِ خود را چو گل ارزاں فروش
در گرہ ہنگامہ داری چوں سپند   محملِ خود بر سرِ آتش بہ بند
چوں جرس آخر ز ہر جزوِ بدن   نالۂ خاموش را بیروں فگن
آتشی تقّی بزمِ عالم بر فروز   دیگراں را ہم ز سوزِ خود بسوز
سنگ شو آئینۂ اندیشہ را   بر سرِ بازار بشکن شیشہ را
از نیستاں ہمچو نے پیغام دہ   قیس را از قومِ حے پیغام دہ
نالہ را اندازِ نو ایجاد کُن   بزم را از ہائے و ہو آباد کُن
خیز و جانِ نو بدہ ہر زندہ را   از قمِ خود زندہ تر کن زندہ را
خیز و پا بر جادۂ دیگر بنہ   جوشِ سودائے کہن از سر بنہ
آشنائے لذتِ گفتار شو   اے درائے کارواں بیدار شو

ان اشعار سے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ اقبال نے مذکورہ مقصد کی تکمیل کے لئے فنِ شعر کو منتخب کیا۔ ایک غلط اور منطقی اندازِ فکر ہے۔ اگر اقبال یہ کہتے ہیں کہ

شاعری زیں مثنوی مقصود نیست　　　بت پرستی بت گری مقصود نیست

تو وہ یہ کہہ کر اصل میں بحث کی گرہ کشائی کر رہے ہیں جو فن برائے فن اور فن برائے زندگی کی صورت میں مدت دراز سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ کسی مقصد کے حصول کے لئے مختلف فنون میں سے اقبال نے فنِ شعر کو منتخب نہیں کیا۔ بلکہ اپنی شاعری کے بھرپور امکانات کو جس کا انہیں بخوبی علم اور احساس تھا۔ سماجی مقاصد کے حصول کیلئے استعمال کیا۔ اسی مثنوی کے شروع میں آپ کہتے ہیں

باغباں زورِ کلامم آزمود　　　مصرعے کارید و شمشیرے درود

اور پھر ایک موقع پر اپنی شاعری کے بارے میں یوں اظہارِ خیال کرتے ہیں۔

چوں نوا از تارِ خود برخاستم　　　جنتے از بہرِ گوش آراستم

ان اشعار میں اقبال نے صرف اپنی شاعرانہ صلاحیتوں ہی کی طرف اشارہ نہیں کیا بلکہ حبِ آدم کے اس جذبے کا اظہار بھی کیا ہے جس نے بانگِ درا کے ابتدائی صفحات میں

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے　　　ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

کی صورت اختیار کی تھی اور جو ارمغانِ حجاز میں ان الفاظ میں ایک ادبی شاہکار بن کے نمایاں ہوا۔

چو بلبل نالۂ زارے نداری　　　کہ در من جانِ بیدارے نداری
دریں گلشن کہ گلچینِ ملال است　　　تو زخمے از سرِ خارے نداری

یہ "نالۂ زارے" جو اقبال اور اقبال کی شاعری کے لئے ایک متاعِ بے بہا ہے فکرِ اقبال کی تخلیق نہیں ہے۔ بلکہ خلاق ہے اور یہی جذبہ اس تصور کا بھی خلاق ہے کہ ایک نیا دور کتمِ عدم سے عالمِ وجود میں آ رہا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس نے کلامِ اقبال میں قدم قدم پر عظمتِ آدم کے تصور کو جنم دیا۔

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے　　　زمیں از کوکبِ تقدیر ما گردوں شود روزے
خیال او کہ از سیلِ حوادث پرورش گیرد　　　ز گردابِ سپہرِ نیلگوں بیروں شود روزے
یکے در معنیٔ آدم نگر از ما چہ می پرسی　　　ہنوز اندر طبیعت می خلد موزوں شود روزے

چناں موزوں شود ایں پیش پا افتادہ مضمونے
کہ یزداں را دل از تاثیرِ او پر خوں شود روزے

ہیں۔

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں   کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہِ کامل نہ بن جائے

عظمتِ آدم کا یہ تصور کس قدر حقیقت پر مبنی اور زندگی سے لبریز ہے اس کی شہادت آج کی سائنس
ی وضاحت کے ساتھ دے رہی ہے۔ یہ چند اشعار جو حسنِ کلام کے ایک شہکار کی حیثیت رکھتے ہیں انسان
نے والی عظمتوں کی ایک پیشین گوئی ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں ان مطالبات کی ایک جھلک بھی موجود ہے جو شاعر
نقبل سے کر رہا ہے ؎

طلوعِ فردا کا منتظر رہ کہ دوشِ امروز ہے فسانہ

اقبال کا روحِ عصر کے ساتھ جذباتی اور ذہنی تعلق ایک شدید اور گہرا تعلق ہے۔ اس لئے عصرِ حاضر کے وہ تمام حالا
واقعات جو بنی نوع انسان کے مستقبل پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ فوری طور پر اقبال کی شاعری کے موضوع بن جاتے ہیں
ل کا جذبۂ شعر گوئی جب ان موضوعات کو غور و فکر کے دائرے میں لے آتا ہے تو یہی موضوعات فکر و فن کا ایک ایسا
ن امتزاج پیش کرتے ہیں کہ سیاسی دنیا سے سراپا مفقود ہو جانے کے باوجود بھی ادب میں ان کی حیثیت ہمیشہ برقرار
ہے۔ یورپ، ایشیا اور افریقہ میں وقت نے جس انداز سے بھی کروٹ لی اقبال کے لئے اس میں ایک تازہ انسپریشن
ان موجود تھا۔ ان لمحہ بہ لمحہ بدلتے ہوئے واقعات کو تاریخ کا جز تو کتنی ہی شخصیتوں نے بنایا ہوگا لیکن ادب العالیہ
بنانا اقبال کے مقدر میں تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ حالات و واقعات جو ابھی تک پوری طرح عالمِ وجود میں نہیں
تھے۔ اور پردۂ تقدیر میں ابھی بن بگڑ رہے تھے اقبال کے کلام میں جاودانی چمک دکھا رہے ہیں۔ اقبال کا یہ کہنا کہ

حادثہ وہ جو ابھی پردۂ افلاک میں ہے   عکس اس کا مرے آئینۂ ادراک میں ہے

یا

عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں   میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب

یا

دیکھتا ہوں دوش کے آئینے میں فردا کو میں

محض شاعرانہ تعلّی ہی کی مثالیں نہیں ہیں بلکہ ان حقائق کا اظہار ہیں جن کا ثبوت ہمیں کلامِ اقبال میں قدم قدم پر ملتا ہے

دیارِ مغرب کے رہنے والو! خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زرِ کم عیار ہوگا

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام   وائے تمنائے خام وائے تمنائے خام

مرے حلقۂ سخن میں ابھی محوِ تربیت ہیں
وہ گدا کہ جانتے ہیں رہ و رسمِ کج کلاہی

اس کا سبب یہ ہے کہ در دِ آدم کے ساتھ اقبال کا تعلق دلی تعلق تھا، رسمی یا سیاسی تعلق نہیں تھا۔ اقبال کا ہاتھ ہر وقت نبضِ عالم پر تھا۔ عالمِ نو کا ذوق و شوق اور اس کے مسائل ہر لمحہ اقبال کے سامنے تھے۔ لیگ آف نیشنز، لیگ آف نیشنز، مسولینی، نپولین کے مزار پر، ٹالسٹائی، کارل مارکس، نطشے، لینن اور قیصرِ ولیم، سوشلزم، کارل مارکس کی آواز جمعیتِ اقوام، یورپ، اور یہودی، گاندھی اور مالوی، جلیان والا باغ، بالشویک روسی، مشرق، بلادِ اسلامیہ اور شام و فلسطین چند ایسی نظمیں ہیں جن کے مطالعے سے یہ راز افشا ہوتا ہے کہ اقبال نے کس طرح اپنے دور کے لمحے کو اپنی شاعری کا جزو بنایا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان پیچیدہ ادبی مسائل کی کس کامیابی کے ساتھ گرہ کشائی کی ہے جو اس سے قبل کسی فنکار کے سامنے نہیں آئے تھے اقبال نے ان نظموں میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اُن سے اگر ہم کہیں کہیں متفق نہیں بھی ہے۔ تو وہ بھی ان فن پاروں کی عظمت سے منکر نہیں ہو سکتا۔ وقت کے سیلاب میں ان موضوعات کی تلاش ہر اعتبار سے نئے ساحلوں کی تلاش ہے۔ ان ایسی دوسری متعدد نظموں نے اردو شاعری کی موضوعاتی سرحدوں کو ہی وسیع نہیں کیا بلکہ اندازِ بیان میں ایک نیا حسن اور نئی وسعت پیدا کی ہے۔ زندگی کے مسائل، علم الاخلاق، اور ضابطۂ حیات کے قابلِ تقلید نمونے جو ہماری شاعری کے لیے اکثر و بیشتر نئے موضوعات تھے۔ اقبال کی شاعری میں از خود کونپلیں بن کے پھوٹے اس لیے کہ اقبال کی شاعری کی جڑیں اپنے ماحول کی زمین میں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں ؎

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے ۔۔۔ بری ہے مستیِ اندیشہ ہائے افلاکی

دوسری جنگِ عظیم نے جہاں اپنے دور کی تہذیب کے قصر کو یوں مسمار کر دیا کہ اس کی بنیاد تک ہلا ڈالیں وہاں اس نے بعد از جنگ کی دنیا کو بعض نئی اقدار سے بھی روشناس کیا۔ اقبال کی شاعری ان نئی اقدار کے پرتو سے مزین ہے خضرِ راہ، اور طلوعِ اسلام اس کی دو ایک مثالیں ہیں اقبال نے صرف ایک نئی دنیا کے عالمِ وجود میں آنے کی بشارت ہی نہیں دی بلکہ اس امر کی بھی نشاندہی کی ہے کہ پرانا نظام نئے نظام کو عالمِ وجود میں آنے سے روکنے کیلئے کس طرح برسرِ کار ہو جاتا ہے اور کس طرح انجام کار جدلیاتی کشمکش کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے ان ہی رموز کو فاش کرتے ہوئے اقبال سامراج میں مزدور کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں اور تاریخ کی انگلی پر نبض رکھتے ہوئے فرد اور قوم کی تقدیر کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں۔ بیٹے کو بڑھے باپ کی نصیحت ایک معنی خیز نصیحت ہے ؎

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر ۔۔۔ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

تاریخ اقبال کے شاعرانہ اظہار کے لئے ایک پس منظر کا کام دیتی ہے۔ اصل چیز منظر ہے جو اقبال کی شاعری سے عبارت ہے۔ اقبال کی حقیقت پسندی کی بنیاد وہ جذبہ ہے جو حرکت کرتی ہوئی زندگی اور اس کے مسلسل ارتقا کو شعر میں سمو کا آرزو مند ہے۔

تاریخ کی جانب اقبال کا نظریہ انتہائی ترقی پسندانہ ہے۔ تاریخ کے عمل کو اقبال نے ایک دائرے میں گھو

ہوئی تحریک نہیں سمجھا بلکہ ہمیشہ آگے بڑھتی ہوئی تحریک سمجھا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اقبال نے تاریخ کو جدید بنا کر پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ ہی اس پر جدت پرستی کا ملمع کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ شاعرانہ طور پر اس کی از سر نو تخلیق کرنے پر اپنی توجہ مبذول کی ہے۔ اقبال کی نظر میں شاعری ماضی کی اجمالی تصویر کشی نہیں ہے بلکہ ماضی سے مستقبل کی جانب اس حرکت کا نام ہے جو بنی نوع انسان کی تقدیر کا تعین کرتی ہے۔ "مسجد قرطبہ" اسی انداز فکر کی ایک مثال ہے۔

زندگی اور دردِ زندگی کے ساتھ اقبال کے تعلق خاطر نے صرف اقبال کے شعر ہی کو عظمت عطا نہیں کی بلکہ اس حقیقت کو بھی روشن کیا ہے ——— اور اردو شاعری میں پہلی بار ——— کہ زندگی کے ساتھ ایک شدید اور گہرا ربط رکھے بغیر ادب عالیہ کی تخلیق ممکن نہیں ہے۔

اقبال سے پہلے بھی ہماری اردو شاعری نے عظمتوں کو چھوا ہے لیکن اس فرق کے ساتھ کہ چند ایک مستثنیات کو چھوڑ کر فن کا حسن زندگی کی حقیقتوں سے دور چلا گیا ہے۔ حقیقت اور رومانیت کے حسین امتزاج سے ہماری کلاسیکی شاعری بھی خالی نہیں رہی لیکن اس امتزاج کی انتہا ہمیں اقبال ہی کے کلام میں نظر آتی ہے۔ دنیا کے متعلق ایک ترقی پسندانہ نظریہ ہمیں اول اول کلام اقبال ہی میں ملتا ہے۔ تاریخی حقائق اور تبدیلیوں کی عکاسی اور ان حقائق اور تبدیلیوں کا رد عمل شاعرانہ حسن سے لبریز ہمیں سب سے پہلے اقبال ہی کے یہاں دکھائی دیتا ہے اور شاعری کے اسی کرشمے نے نئی نسل[1] پر یہ نکتہ روشن کیا ہے کہ مواد و ہیئت اور فکر و فن کو شاعری میں ہم آہنگ کرنے ہی سے عظیم شاعری کی تخلیق ممکن ہے۔ زبان اور اسلوب کے حسن کی اہمیت اپنی جگہ مسلم اور زندگی کی صداقتوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن اعلیٰ شاعری جبھی معرض وجود میں آ سکے گی جب مواد و ہیئت جذبے میں اس طرح سما جائیں گے کہ ایک کو دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ فکر کو جذبہ بنا کے پیش کرنا ہی شاعری کی معراج ہے۔ اور اقبال کے کلام نے ہمیں اسی معراج سے آشنا کیا ہے۔

[1] یعنی اقبال کے بعد کی نسل جو ترقی پسند تحریک کی نمائندہ ہے۔

کرتار سنگھ دگل

پنجابی ادب میں جدیدیت

پچھلی چند دہائیوں کے اندر ادب میں جدیدیت کے دھارے نے کئی رنگ روپ بدلے ہیں۔ بیسویں صدی کے اوائل میں روایت پسندی کے بالمقابل جدیدیت کا جو تصور کارفرما تھا اسی صدی کی چوتھی دہائی میں ترقی پسندوں نے اُسے رجعت پسندی کا نام دیا اور پھر اس کے بعد جو لکھنے والے منظرِ عام پر آئے وہ اپنے آپ کو نوین یا اگاگی یا پریوگ وادی کہنے لگے اور آج کے ناراض نوجوان نے ان سب کو یک قلم مسترد کر دیا ہے۔ اس کے اسلاف جن قدروں کو عزیز رکھتے تھے ایک ایک کر کے وہ ان سب کا قلع قمع کر رہا ہے۔

لیکن میرا خیال ہے کہ یہ سب جدیدیت کی مختلف شکلیں ہیں۔ ایسی ہر ادبی تخلیق جو روایت سے ہم آہنگ نہ ہو جدیدیت کے زمرے میں آتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آج ہم جسے جدید کہتے ہیں کل اُسے روایتی کہہ کر ٹھکرا دیا جائے۔ جدیدیت ایک اضافی اصطلاح ہے ماضی سے انحراف اور عصری اقدار کی نقش گری کو اس کے لازمی عناصر قرار دیا جاتا ہے۔ جس طرح بدلتے ہوئے فیشنوں کا بنیادی مزاج یکساں ہوتا ہے، جدیدیت کا بنیادی مزاج بھی ایک ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ ہو سکتا ہے کہ جاتے ہوئے فیشنوں کو دو میں وقفے سے تکرار ہوتی رہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی موڑ پر جدیدیت بجاتے خود احیا پرستی کی آواز باز گشت بن جائے۔

تخلیقی ادب میں جدید وہی ہے جس میں نئے انسان کا، اس کی زندگی، اور تمناؤں کا، اس کی اُمیدوں اور محبتوں کا اور اس کی کامرانیوں اور محرومیوں کا عکس جلوہ گر ہو، چاہے وہ کسی ہیئت اور شکل وصورت میں ہمارے سامنے آئے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس کی ہیئت بھی بہرحال نئی ہو۔ پنجابی ادب کی جدید ترین پریوگ وادی ہیئت، ہمیں گرو نانک کی تخلیقات میں ملتی ہیں۔ انھوں نے منثور شاعری کے نمونے چھوڑے ہیں۔ وہ آزاد نظم کے بہت بڑے معمار تھے۔ بڑی فن کارانہ چابکدستی کے ساتھ انہوں نے شعر کے داخلی وزن و آہنگ کو برقرار رکھا ہے۔ وہ اتنے بڑے فن کار تھے کہ نقاد جب ان کا درجہ و مقام متعین کرنے اور ان کے ادبی ورثے کو مختلف خانوں میں بانٹنے کی کوشش کرتے ہیں تو چکرا کر رہ جاتے ہیں۔

پنجابی ادب میں جدیدیت کا آغاز بھی اسی وقت سے ہوتا ہے۔ جب ہم عصرِ جدید میں قدم رکھتے ہیں۔ پچھلی صدی کے اواخر میں ہندوستان پر برطانیہ کا سیاسی تسلط مستحکم ہو چکا تھا اور ہماری معاشرت پر انگریزوں کے طرزِ حیات کا اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ مغرب کی تقلید میں تعلیم کو پھیلانے کے لئے ہم، اسکول اور کالج، کتب خانے اور دارالمطالعے کھول رہے تھے چھاپہ خانے قائم ہو رہے تھے اور بڑی تعداد میں اخبارات، رسائل اور کتابیں چھپ رہی تھیں، انگریزی زبان سیکھنا اور انگریزی ادب کا مطالعہ کرنا ایک عام بات بن گئی تھی جس کی بدولت مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ فکر کے نئے نئے دریچے کھل گئے تھے لیکن میرا خیال ہے کہ مغربی فکر نے ہمیں براہِ راست آشنا نہیں کہ

جتنا کہ ہم اس کے بعض ناخواستہ اثرات کی سعی مقاومت کے باعث متاثر ہوئے۔ عیسائی مشنریوں نے عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ہندوستان کی مختلف عصری زبانوں میں انجیل مقدس کے ترجمے اور دوسرے مذہبی کتابچے چھاپ کر گلی گلی اور گھر گھر مفت بانٹنا شروع کر دئے تھے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ پنجاب میں سکھوں نے سکھ سبھا تحریک شروع کی اور ہندوؤں اور مسلمانوں نے بھی اسی قسم کی تحریکوں کا آغاز کیا۔ اس مزاحمت نے ہمارے اندر خود شناسی پیدا کر دی اور ہمارے تجربے کو گمبھیر بنا دیا۔ ہندوستان کے مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کو عیسائیت کی یلغار سے بچانے کے لئے مختلف فرقوں کے الگ الگ مدرسوں کی ایک بڑی تعداد عالمِ وجود میں آ گئی اور اسی کے ساتھ ملک میں سیاسی بیداری پھیلی اور لوگوں میں کے دلوں میں یہ احساس جاگ اٹھا کہ ایک اجنبی نسل کے مٹھی بھر افراد کالے کوسوں سے آ کر ایک ایسی قوم پر اپنی حکومت کا سکہ چلا رہے ہیں جس کا اپنا ایک شاندار اور قابلِ فخر ماضی ہے۔ جو دلیر اور حوصلہ مند ہے اور جس نے بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ پہلی بڑی لڑائی کے بعد اس بیداری میں اور اضافہ ہوا۔ پنجابی سپاہیوں نے انگریز سپاہیوں کے دوش بدوش اس لڑائی میں حصہ لیا تھا اور میدانِ جنگ میں بہادری کے جوہر دکھا کر تمغے اور اعزازات حاصل کئے تھے۔ اور اپنی شجاعت و دلیری کا لوہا منوا لیا تھا۔ پھر جب یہ سپاہی محاذِ جنگ سے لوٹے تو ایک نئی روشنی لے کر لوٹے۔ اب وہ باہر کی دنیا کی ایک جھلک دیکھ چکے تھے۔ جنگ کے بعد ان کی زندگی میں تھوڑی سی خوشحالی بھی آ گئی تھی، ان کے دلوں میں ایک نیا تصورِ حیات پیدا ہو رہا تھا، اب وہ ایک بہتر اور صحت بخش ماحول میں سانس لینا چاہتے تھے اور یہ بھی چاہتے تھے کہ اُن کے ارد گرد جو کچھ ہو رہا ہے اس سے باخبر رہیں۔ اب وہ عورتوں کی تعلیم کے بھی مخالف نہیں رہے تھے اور پرانی تنگ نظریوں کے خول سے باہر نکل رہے تھے دیہاتوں اور شہروں میں پہلی سی وہ دوری باقی نہیں رہی تھی۔ فاصلے سکڑ رہے تھے، دوریاں مٹ رہی تھیں اور زمان و مکاں کی پرانی حدیں ٹوٹ رہی تھیں۔

ہمارا موضع راولپنڈی کنٹونمنٹ سے کوئی پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں، جب کبھی انگریز سپاہی اُدھر سے گذر جاتے تو پورے گاؤں کے لئے ہوّا بن جاتے۔ عورتیں اپنے گھروں میں چھپ جاتیں۔ بچے خوف سے کانپنے لگتے اور مرد دست بستہ ہو کر اپنے سر جھکا لیتے اور اُن کے کتے ہمارے کتوں پر بھونکتے۔ پھر وہ زمانہ آیا کہ دیہاتوں کے لئے گورے سپاہی اور کنٹونمنٹ کے لئے دیہاتی ایک روزمرہ کی چیزیں بن گئے۔ اب ہم ان گوروں کے شانہ بہ شانہ چلتے اور گورے بھی ہماری دکانوں سے اپنی ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں خریدتے۔ کبھی ہم ان سے کھنچے کھنچے رہتے اور کبھی ان کو اپنا ساتھی بنا لیتے ـــ اور پھر قوم کے محبوب رہنماؤں کی قید و بند، جلیانوالہ باغ کے قتلِ عام، بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی پھانسی کے حشر ساماں واقعات پیش آئے اور ملک کے گوشے گوشے میں غم و غصہ کے ساتھ دلیری اور جرأت مندی کی بھی ایک لہر دوڑ گئی۔ اب ہم گاؤں کے میدانوں میں مشقیں کرنے والے گوروں کو اپنے پیڑوں کے سائے تلے پناہ دینے پر بھی ناک بھوئیں چڑھانے لگے۔ اب ہمارے کتے ان کے کتوں کا تعاقب کرنے لگے اور ان باتوں میں ہم کو مزا آنے لگا۔

پنجابی ادب میں جدیدیت کی لوح پر، ہمارے عہد کے بزرگ و محترم شاعر اور نثر نگار بھائی ویر کا نام سب سے اوپر نظر آتا ہے وہ ہندوستان کی مختلف زبانوں پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ انگریزی ادب پر بھی ان کی نظر گہری تھی پنجابی زبان میں انھیں تخلیقی ادب

معماروں کی حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے لکھنے کو گویا اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر انھوں نے پنجابی میں لکھنا شروع کیا اور عمر بھر لکھتے رہے۔ نظم و نثر دونوں شعبوں میں انھوں نے ایک قیمتی ادبی سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے۔ ان کی انشاپردازی کا آغاز چند کتابچوں سے ہوا، یہ کتابچے انھوں نے سکھ روایات اور تعلیمات کی تبلیغ و تحفظ کے لیے لکھے تھے۔ اُن کی شاعری بھی بہت چھوٹے پیمانے پر شروع ہوئی۔ ان کی ابتدائی شاعری گرو کی تعریف میں چند قصائد پر مشتمل ہے لیکن بتدریج ان کی شاعری کا رنگ نکھرتا گیا۔ یہاں تک کہ "رانا سورت سنگھ" میں وہ اپنی شاعری کی انتہائی بلندیوں تک پہنچ گئے۔ "رانا سورت سنگھ" چودہ سو سے زائد اشعار پر مشتمل ایک طویل رزمیہ نظم ہے۔ شاعر نے اپنے باطنی اور روحانی تجربوں کو آزادی کے ساتھ پیش کرنے کے لیے اپنی اس نظم کو ردیف و قافیہ کی پابندیوں سے آزاد رکھا ہے، بھائی ویر سنگھ کی یہ نظم حرّی شاعر کی شخصی زبان میں اظہارِ خیال کا پہلا تجربہ ہے۔ بعد میں موہن سنگھ نے اس قسم کے زیادہ شائستہ تجربے کیے۔ بھائی ویر سنگھ نے ایک پکے سکھ کی حیثیت سے اپنے آپ کو سکھ فلسفہ و فکر میں گم کر دیا تھا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے اندر کا مفکر جاگ اُٹھا اور وہ سکھوں کے طرزِ حیات اور گروردانی کے شاندار ورثے کے بہترین ترجمان اور عکاس بن گئے۔ انھوں نے "گرو نانک چمتکار" اور "گرو گوبند سنگھ چمتکار" کے نام سے نانک اور گوبند کی سوانح عمریاں لکھیں۔ ان دونوں کتابوں میں ان کی نثر نگاری کا جذباتی اور غنائی انداز خاصے کی چیز ہے۔ ان کی نثر بڑی پاکیزہ، سلیس، بامحاورہ اور فکر انگیز ہوتی ہے۔ نثر میں بھی وہ شاعری کرتے ہیں۔ وہ کوئی مورخ نہیں تھے کہ کسی دور کے واقعات کو تاریخی انداز میں مدوّن کرتے۔ وہ تو ایک عاشق تھے اور عاشق ہی کے انداز میں انھوں نے اپنے محبوب کی قصیدہ خوانی کی ہے تاہم اُن کی تالیفات گرو گرنتھ کوش (۱۹۲۷ء) گرو گرنتھ صاحب کی ڈکشنری۔ اور گرو پرتاپ سورا کی گرنتھ کی شرح (۱۹۴۳ء) اُن کے دو بڑے علمی کارنامے ہیں۔ انھوں نے ناول نگاری کی جانب بھی توجہ کی لیکن اُن کے ناول "سُندری"، "بیجے سنگھ" اور "ستونت کنور" وغیرہ کامیاب ناول نہیں کہے جا سکتے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کا پورا زور سکھ تعلیمات پر تھا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت اپنی جگہ پر باقی رہتی ہے کہ بھائی ویر سنگھ نے پنجابی زبان میں افسانہ نگاری کے کچھ ابتدائی نقوش چھوڑے ہیں۔ میرے نزدیک بھائی ویر سنگھ نے نثر سے زیادہ شعر کی خدمت انجام دی ہے۔ وہ اپنے زمانے میں بھی شاعر کی حیثیت سے زیادہ متعارف تھے اور آئندہ بھی اسی حیثیت سے ان کا نام باقی رہے گا۔ انھوں نے پنجابی شاعری کو روایتی ہیئت کے گورکھ دھندے سے آزاد کیا پیچیدہ اور بھاری بھرکم اوزان و اشکال سے دامن بچایا اور آسان اور سریع الحرکت بحروں کو آزادی کے ساتھ استعمال کیا۔ انھوں نے شاعری کی پرانی ہیئت کو بدل کر اپنے عہد کی زندگی سے ہم آہنگ بنا دیا۔ اور اسے نئے دور کے مزاج سے قریب تر لے آئے۔ انھوں نے ایک نئی بحر "تورائی" ایجاد کی جو فارسی رباعی کی بحر سے مماثلت رکھتی ہے اور اس بحر میں بہت اچھی رباعیاں لکھیں۔ بھائی ویر سنگھ نے اپنے باطنی تجربات کو حقیقت کی خارجی دنیا کے آگے بہت ہی آسان اور عام فہم زبان اور عام زندگی کی تمثیلات کے ذریعہ پیش کیا ہے۔ وہ زندگی بھر روحانیت میں ڈوبے رہے۔ مادیت اور جسمانیت کی جانب انھوں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ یہی سبب ہے کہ اُن کے پڑھنے والوں کو اُن کی شاعری میں سماجی عناصر کا فقدان نظر آتا ہے۔ کیٹس اور ورڈسورتھ سے متاثر ہو کر انھوں نے اپنی شاعری میں پرندوں اور پھولوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ کشمیر پر ان کی متعدد نظمیں ہیں جن میں شاعر نے کشمیر کے دریاؤں، باغوں اور قدیم آثار کے گیت گائے ہیں اور قدرت کے حسین مناظر کی

تصویریں کھینچی ہیں لیکن کشمیریوں کی غربت و فلاکت اور سماجی پستی یا معاشی درماندگی کا ان نظموں میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا۔

بھائی ویر سنگھ ایک گوشہ نشین شاعر تھے، وہ انسانوں سے بھی دور بھاگتے تھے اور اپنی شہرت اور نام و نمود سے بھی، ان کی نظم و نثر میں جو ہزاروں صفحات پر مشتمل ہے، آزادی کی اس جدوجہد کا اشارہ تک نہیں ملتا جس میں ان کے اہل وطن اپنی جانوں کی بازی لگائے ہوئے تھے۔ وہ سنہرے گردوارے کا تو ذکر کرتے ہیں لیکن سنہرے گردوارے سے چند قدم کے فاصلے پر برپا ہونے والی اس قیامت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا جس نے سیکڑوں میل دور بنگال میں رہنے والے ٹیگور کو بیکل و مضطرب بنا دیا تھا۔ بلا شبہ یہ بات عصرِ حاضر کے نقاد کو اچنبھے میں ڈال دیتی ہے اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ بھائی ویر سنگھ نے اپنے آپ کو رجعت پسند قوتوں سے وابستہ کر لیا تھا یا وہ بیرونی حکمرانوں کے جبر و استبداد کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے تھے؟

میرے خیال میں ایسی کوئی بات نہیں تھی بلکہ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ وہ اپنی باطنی دنیا میں اس درجہ کھوئے ہوئے رہتے تھے کہ عالمِ خارجی پر ان کی نظر ہی نہیں پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ کوئی اور تاویل اس بات کی ہو ہی نہیں سکتی کہ بھائی ویر جیسا حساس شاعر کس طرح اپنے ارد گرد کے پُر آشوب حالات سے یوں بے تعلق اور غیر متاثر رہے — وہ شاعر جو ایسے نازک شعر کہہ سکتا ہو۔

بادل ابھی ابھی برس کر تھما ہے — اور بارش کا ایک قطرہ ابھی تک ایک تار پر آویزاں ہے
وہ زمین پر گرا ہی چاہتا ہے لیکن ابھی تک گرا نہیں ہے
کوئی اس سے پوچھتا ہے — تم کس کی راہ دیکھ رہے ہو
اور وہ کہتا ہے
میرے بے حساب ساتھی تھے۔ ہم سب ایک ساتھ آسمانوں سے آئے تھے
لیکن وہ سب کدھر چلے گئے؟
میں چاروں طرف انھیں کو ڈھونڈھ رہا ہوں۔

ویر سنگھ بنیادی طور پر ایک صوفی شاعر ہیں لیکن ان کی بھرپور طمانیت قلب انھیں ان صوفی شاعروں سے ممتاز کرتی ہے جن کے دلوں میں اضطراب و بیقراری کی چنگاریاں بھڑکتی رہتی ہیں۔ ان کی شاعری ان کی ذات کے اطراف گھومتی ہے جس میں پڑوسی کے نالہ و فریاد کی کوئی گنجائش نہیں۔

وہ اس راستے سے آیا اور اس راستے سے چلا گیا
مجھے اس کی تلاش نہیں ہے۔
میں تو اس تصور میں گم ہوں کہ وہ کس انداز سے گیا۔

بہر حال بھائی ویر ایک جدید شاعر ہیں۔ انھوں نے روایتی ہیئت اور روایتی اندازِ فکر سے انحراف کیا اور پنجابی شاعری کو کلاسیکی انداز سے چھٹکارا دلایا

بھائی ویر سنگھ کے بعد پنجابی کے جدید شاعروں میں ہمیں پورن سنگھ کا نام ملتا ہے۔ پورن سنگھ مشرق و مغرب کی ترقی یا

سے نسبتاً زیادہ باخبر تھے۔ پیشے کے اعتبار سے وہ ایک کیمسٹ تھے۔ ان کا ذہن حکیمانہ اور احساس تیز تھا۔ بلاشبہ اپنے دور کے ادیبوں میں ان کا قد و قامت بہت بلند ہے۔ انھوں نے روایت کی ساری زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا اور والٹ وھٹ مین کے انداز میں نثری نظمیں لکھیں۔ ان کی شاعری کی آزاد ہئیت، بیان کی توانائی اور خیال کی تازگی ان کی چند خصوصیات ہیں۔ پورن سنگھ اپنی شاعری میں غریبوں، کمزوروں اور بھوکوں کی بات کرتے ہیں، انھیں کو اپنی شاعری کا آدرش بناتے ہیں۔ اور ان کی آنکھوں میں ایسی قناعت و آسودگی پاتے ہیں جس کا ناکارہ دولتمندوں کے پاس گذر تک نہیں۔ انھوں نے مقبولِ عام کلاسیکی نظم 'پورن بھگت' کو نئی تاویل اور نئے رنگ کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ رانجھا کو اپنے بھائی اور ہیر کو اپنی بہن کی طرح مخاطب کرتے ہیں۔ پنجاب کے رومانوی عاشق اُن کے لئے دیوتا کا درجہ رکھتے ہیں۔ وہ معمولی معمولی درختوں کی تعریف کے گیت گاتے ہیں اور ان جانے پھولوں میں انھیں حُسن کی ایک لاانتہائی دنیا نظر آتی ہے۔ وہ ان تنہا گوشوں کو دل و جان سے سراہتے ہیں جہاں دو چاہنے والے ملتے ہیں۔ کسی غریب اُپلے تھاپنے والی لڑکی کی تصویر اپنے اشعار میں وہ کچھ اس انداز سے کھینچتے ہیں کہ وہ لڑکی ایک آرٹسٹ بن کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ وہ چراگاہوں میں چرنے والے مویشیوں سے بغل گیر ہونے کی آرزو کرتے ہیں۔ انھوں نے دیوتاؤں کو عام آدمیوں کے برابر لا کھڑا کیا ہے اور عام آدمی ـــ مزدور، محنت کش اور عاشق ـــ کو دیوتا کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔ ان کی شاعری ایک تیز رفتار ندی کی طرح اپنے راستے سے ان تمام عروضی اصولوں کو تہس نہس کرتی ہوئی گذر جاتی ہے جو ان کے پیش رو شاعروں کو بہت عزیز تھے وہ روزمرّہ کی پنجابی زندگی کے کرداروں اور منظروں کو اپنی شاعری میں از سرِ نو تخلیق کرتے ہیں اور انھیں امر بنا دیتے ہیں وہ گرو نانک اور گرو گوبند سنگھ کے فلسفہ کا مغربی فلسفہ سے تعلق پیدا کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے اس کی تشریح کرتے ہیں کہ اس میں ایک نئی گہرائی اور معنویت نظر آنے لگتی ہے۔ وہ اپنی نثری تحریروں میں ووٹ کی اہمیت اور صنعت کاری کے معاشی پہلو جیسے عنوانات پر پنجابی زبان میں پہلی مرتبہ قلم اٹھاتے ہیں۔ افسوس کہ پورن چند کی زندگی کا سفر بہت مختصر رہا اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اپنی مختصر سی زندگی میں چند در چند معاشی اور جذباتی الجھنوں کا شکار بنے رہے۔ اگر وہ زیادہ دنوں تک زندہ رہتے تو بلاشبہ عصرِ حاضر کے ایک بڑے عالم شاعر کا مرتبہ و مقام حاصل کر لیتے۔ انھوں نے پنجابی ادب کو صحت مند روایات سے روشناس کیا۔ نئے موضوعات کے دروازے کھولے اور نئی ادبی وسعتوں کے امکانات کی نشان دہی کی ان کی ادبی تخلیقات نے پنجابی ادب کو جدیدیت کا ایک مستقل راستہ بتایا۔ وہ ایک ترقی پسند ادیب تھے۔ انھوں نے ہردیال جیسے انقلابی کو اپنے ہاں پناہ دی اور ایک جاپانی جاسوس کو کئی ماہ تک ڈیڑھ دو دن میں اپنے پاس رکھا لیکن حیرت کی بات ہے کہ ان کی نظم و نثر میں کہیں اس بات کا اشارہ نہیں ملتا کہ اہلِ وطن کو بیرونی حکمرانوں کی غلامی کا جُوا اتار پھینکنا چاہیئے۔

اس کے بعد ہم سوہنر کے نامی گرامی مصنف موہن سنگھ (۱۹۰۵ء -) کے زمانے میں داخل ہوتے ہیں اب جدیدیت پنجابی ادب میں اپنے سفر کا ایک طویل حصہ طے کر چکی ہے۔ موہن سنگھ صحیح معنوں میں اپنے دور کے ترجمان ہیں۔ انھیں اپنے دلیس کے عوام کے تعلق سے اپنی ذمہ داریوں کا پورا احساس ہے۔ وہ بھگت سنگھ، گاندھی اور نہرو کے عہد کے فنکار ہیں، ہر قدم پر [illegible]

گذرا ہے اور اب اسی کی اٹھائی میں بھی وہ سرگرمی امن پسندوں کے ساتھ ہیں۔ وہ پنجاب کے ایک قدیم تعلیمی ادارے یعنی خالصہ کالج امرتسر کے ٹیچنگ اسٹاف میں رہ چکے ہیں جہاں پروفیسر تیجا سنگھ، پروفیسر گربچن سنگھ اور پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں جیسے روشن دماغ عالم اور مفکران کے رفقائے کار تھے۔ ان دنوں، انھوں نے جو کچھ لکھا اس کا ایک ایک لفظ ان کے فاضل رفیقوں کی نگاہِ تنقید سے گذر کر منظرِ عام پر آیا۔ اسی زمانے میں موہن سنگھ نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا اور اپنے عہد کے بہترین مغربی مصنفوں سے متاثر ہوئے۔ موہن سنگھ کی ابتدائی شاعری کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بڑی بے باکی سے اپنی ذاتی محبت کا ماجرا بیان کرتے ہیں۔ وہ اپنی محبوبہ کا ذکر بے کم و کاست شخصی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اپنے پیش رو شاعروں کی عمومیت پسندی ان کے ہاں نہیں پائی جاتی وہ نہایت ہی حقیقت پسندانہ اور جذباتی انداز میں اپنی محبت اور محبوب کی تصویر کھینچتے ہیں۔ انھوں نے اپنی شاعری میں بڑی بے تکلفی سے عام بول چال کی زبان استعمال کی ہے۔ مکالماتی آہنگ کے پہلو بہ پہلو ہمیں ان کی شاعری خصوصاً ان کی طویل نظموں میں ایسے نمونے بھی ملتے ہیں جو مُوڈ کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے جاتے ہیں۔ علامات کا استعمال شعور کی رَو کی تکنیک داخلی آہنگ اور شاعری کی زبان کو بول چال کی زبان سے قریب لانے کی کوشش ـــ ان کے کلام کی چند نمایاں خصوصیات ہیں۔ موہن سنگھ نے انارکلی، اور نور جہاں، پر جو نظمیں لکھی ہیں، ان کی بدولت پنجابی شاعری میں ایک گہری سماجی بصیرت پیدا ہو رہی ہے۔ وہ صرف تاج کی عظمت و شوکت کے گیت نہیں گاتے بلکہ تاج، کے تصور کے ساتھ ہی، انھیں، ان ہزاروں مزدوروں کا خیال آجاتا ہے جنھوں نے فنی تعمیر کے اس عجوبۂ روزگار نمونے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر دیا تھا اور اپنی جانوں کی بازی لگا دی تھی۔ وہ اپنے عہد کی روایات اور سماجی اقدار کو چیلنج کرتے ہیں اور اپنے ملک کی سیاسی غلامی، عوام کی پست حالی اور سماجی نابرابری کے اسباب کی تہہ تک پہنچتے ہیں۔

وہ بڑے ہی درد بھرے لہجے میں سوال کرتے ہیں کہ آخر کیوں ایسا ہوتا ہے کہ جس عورت سے انھیں پریم ہے وہ اُن کی نہیں ہو سکتی۔

وہ دروازے پر تھی ـــ ایک قطعۂ جائیداد
اور اس کے پہلو میں اس کا مالک کھڑا تھا ـــ اس کا شوہر
اور اس کے سامنے اس کا چاہنے والا تھا
وہ دروازے پر تھی
خاموش اور ساکت و صامت
سوسن کی طرح سفید، سنگ مرمر کا ایک ستون
اس کی چھاتیاں، دو قفس بند فاختاؤں کی طرح تھی
اس کی آنکھیں دو چمکدار نگینوں کے مانند
اس کے ہونٹ دو یاقوت تھے

خاموش اور بے بس
گفتگو بند تھی، مسکراہٹ بند تھی
تُف ہے رسم و رواج کی ایسی شب گزیدہ پرچھائیں پر
تُف ہے روایات کے ایسے خون آشام دیو پر
اس کے پہلو میں
اس کا شوہر کھڑا تھا
اپنا ہاتھ اس کے کاندھے پر رکھتے ہوئے
اس نے کہا
یہ میری جائیداد ہے
میں اس کا مالک ہوں
منو کا بنایا ہوا قانون میرے حق میں ہے
اور انسان کا قانون بھی
اور میرا رُتبہ بھی
اور ریت رسم بھی
لیکن دل ؟
اس کی کوئی پروا نہیں
میں دیکھوں گا
کہ یہ خوبصورت حویلی کس طرح
مجھے پناہ دینے سے انکار کر سکتی ہے
یا موسم سرما میں مجھے حرارت بخشنے سے منکر ہو سکتی ہے
اور موسم گرما میں ٹھنڈک عطا کرنے سے
عاشق کے سامنے
جو اپنی دُھن کا پکا ہے
ایک قطعۂ جائیداد
ہاں
وہ ہے

ایک خاموش چٹان
جیسے میری محبت کی آگ
آج پگھلانے سے قاصر ہے
میں اس آگ میں اور تُندی پیدا کروں گا
اس دنیا کو بدل کر
ایک دن میں لوٹوں گا
اور اُسے نئے سرے سے زندگی کی طرف بلاؤں گا
"جائیداد"

موہن سنگھ نے ایک پکے ہیت پرست کی حیثیت سے شعر کہنا شروع کیا تھا لیکن آگے چل کر انھوں نے پنجابی شاعری میں نئے تجربے کئے — بڑے مشکل اور جرأت مندانہ تجربے اور اب ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے تجربوں کے دائرے سے باہر نکل آئے ہیں اور پھر ایک مرتبہ روایتی ہیئت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ اُسی پرانی ہیئت میں 'ہیر' لکھیں جس میں وارث شاہ نے اپنا یہ تخلیقی شاہکار انجام دیا تھا۔

پریتم سنگھ سفیر (۱۹۱۶ء—) کا میلانِ طبع نامانوس اور ذاتی علامات کے استعمال کی جانب زیادہ ہے۔ وہ ایک یاس پسند اور موجی شاعر ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ہر چیز پر سے ان کا ایمان اٹھ گیا ہے۔ اپنے عہد کے جدیدیت پسند شاعروں میں ان کی وضع بالکل نرالی ہے ان کی شاعری کے مطالعہ سے نئے لکھنے والوں کی بے صبری کا بہت اچھا اندازہ ہو سکتا ہے۔ جیسے ہی اُن کے خیالات میں گہرائی پیدا ہونا شروع ہوتی ہے اُن کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے فکر کے بوجھ تلے دبے جا رہے ہیں۔ پھر وہ ایکدم سے چونک کر آگے بڑھتے ہیں لیکن اس مرحلے پر اُن کی زبان ان کا ساتھ نہیں دیتی۔ اُن کی نظموں کو پڑھتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتے ہیں، کہہ تو رہے ہیں لیکن پوری طرح سے کہہ نہیں پا رہے ہیں بلکہ اپنے مضمون سے آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں، زندگی پر بے اعتمادی، خدائی انصاف پر ایمان کا فقدان اور حسن کے ساتھ گناہ کا احساس — یہ ہیں چند خاص مضامین جنہیں سفیر اپنی شاعری میں بار بار دُہراتے ہیں۔

پنجابی زبان میں نئے خطوط پر افسانہ نگاری کا آغاز پروفیسر سنت سنگھ سیکھوں کی کہانی 'بھیی دے نیانے' سے ہوتا ہے سنت سنگھ کی اُس کہانی کی بدولت اظہارِ خیال کے نئے پہلو اور تازہ امکانات ابھر کر سامنے آئے۔ 'بھیی دے نیانے' میں سوسائٹی کے عام کرداروں کی بہت ہی معنی خیز، نفسیاتی اور مؤثر تصویریں ملتی ہیں۔ پنجابی کے نئے افسانہ نگاروں نے سماج کے ٹھیکیداروں کے بجائے کچلے ہوئے اور فلاکت زدہ انسانوں کی زندگی کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے اور کہانی کی نئی ہیئت پر بھی خاص توجہ کی ہے۔ نئی پنجابی کہانی اور ڈرامے میں بول چال کی پنجابی زبان اور دوسری بولیوں کا استعمال ملتا ہے۔ موہن سنگھ نے شاعری سے زیادہ اپنی کہانیوں میں ٹھوراڑی بولی کا استعمال کیا ہے — عام آدمی کی زندگی کی تصویریں کھینچتے کھینچتے نئے کہانی کار اتنی دور نکل گئے کہ زندگی کے تاریک پہلوؤں

پر بھی ان کی نظر پڑنے لگی اور ہم نے اس گندگی اور نجاست کا بھی مشاہدہ کیا جس میں ایک عام آدمی کے شب و روز بسر ہوتے ہیں لیکن ان گندہ موریوں کو اس طرح کھولا کہ ان کے اندر کی عفونت اور سڑاند چاروں طرف پھیل گئی اور اس طرح نئے افسانے کی حقیقت پسندی رسوائی سے دوچار ہو گئی۔ نیا لکھنے والا اپنے پڑھنے والوں کی آسودہ خاطری کو جھنجوڑنا چاہتا تھا۔ اول اول وہ اس میں کامیاب بھی ہوا لیکن آگے چل کر اس میں انتہا پسندی آ گئی۔ ہم نے ایسے موضوعات پر بھی قلم اٹھایا جو اس سے پہلے ادب میں شجر ممنوعہ سمجھے جاتے تھے جیسے ہم جنسی، انسانوں اور جانوروں کے درمیان غیر فطری تعلقات، بدہیئت اور بدقوارہ کردار وغیرہ۔ ہم اپنے کرداروں کی انتہائی گہرائیوں تک غوطے لگانے لگے اور پھر کھلے بندوں، پکار پکار کر ان کہی باتیں سنانے لگے۔

اسی زمانے میں نئے شاعروں کی ایک پوری پود ابھر آئی جس میں ڈاکٹر ہربھجن سنگھ اور جسبیر سنگھ اہلووالیہ غالباً اپنی نسل کے سب سے نمایندہ شاعر ہیں۔ ان کے خیالات روزمرّہ کی بات چیت کے ڈھنگ میں شعر کا قالب اختیار کرتے ہیں۔ وہ مختلف خیالات کے آپسی تعلق کا کھوج نکالنے اور ایک تصوّر سے دوسرے تصور کی جانب پھلانگنے کی کوشش کرتے ہیں ان پر لاشعور کی بڑی سخت گرفت ہے۔ ویر سنگھ کی خالص روحانی اور پورن سنگھ کی صوفیانہ شاعری سے ان کی شاعری کا آہنگ بالکل مختلف ہے۔ انھوں نے موہن سنگھ کی روایات کے تسلسل کو باقی رکھا ہے۔ شاعر کا آج محض یہ منصب نہیں رہا ہے کہ وہ اپنے خیالات کے ابلاغ پر اکتفا کرے بلکہ ایک حسّاس فن کار اپنے اندرونی ارتعاشات' کا تجربہ کرتا ہے، ضروری ہے کہ انھیں بھی زبان و بیان کا پیکر عطا کرے۔ آج ہماری سوسائٹی میں افکار و خیالات کا جو طومار ہے، نئے لکھنے والوں پر اس نے بڑی قیامت توڑی ہے ہربھجن سنگھ تو اپنے مکالماتی آہنگ کی بنا پر اصرار البصیرت اور لفظیات کے سہارے اپنی شاعری کی آبرو باقی رکھتے ہیں لیکن جسبیر سنگھ کے کلام کو پڑھ کر ایسا احساس ہوتا ہے کہ وہ الجھے ہوئے ہیں اور ان کا سمجھنا دشوار ہے۔

جدید ترین شاعروں میں ''ام تیاور'' ''نار اسا'' ''نو دالوں'' کو ابھی اپنے آپ کو منوانے کے لئے بہت سے مرحلے طے کرنا ہیں۔ کسی زبان کے ادبی ورثے کو حرفِ غلط کی طرح مسترد کر دینے سے تو بات نہیں بنتی۔ جدیدیت کی یہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ ان کی جڑیں زمین کے اندر ٹھہری نہیں ہیں، موہن سنگھ دیہات کے رہنے والے تھے۔ سنت سنگھ سکھوں کا تعلق ایک کسان گھرانے سے تھا اور تیجا سنگھ بھی ایک دیہات میں پیدا ہوئے تھے اور وہیں ان کی ابتدائی تعلیم و تربیت ہوئی لیکن نئی نسل کے اکثر لکھنے والے شہروں سے تعلق رکھتے ہیں جس سماج کا انھیں تجربہ ہوا وہ ابھی ایک تشکیلی دور سے گذر رہا ہے۔ ہمارے شہروں کی موجودہ سوسائٹی تضادات کا ایک معجون مرکب بنی ہوئی ہے۔ یہ ایک عجیب و غریب سوسائٹی ہے۔ ایسی سوسائٹی ان لوگوں کے لئے تو دلکش ہو سکتی ہے جو دور سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں لیکن جو اس میں سرتاپا الجھے ہوئے ہیں ان کے حق میں بڑی دوبھر بن جاتی ہے۔ ہماری شہری زندگی کے سماجی مسائل کے تعلق سے بعض متقدمین کی کہانیاں اور موہن سنگھ، پریتما سنگھ، سفیر، امرتا پریتم اور ہربھجن سنگھ کے بعض افسانے بہت خوب ہیں لیکن ہمارے نئے شاعر بھی اپنے مسائل کی نقاشی کا ارادہ کرتے ہیں تو جیسے بھول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتے ہیں اور اصل مقصد ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ میں اس موقع پر ایک ادبی ماہنامے سے دو نظمیں پیش کرتا ہوں جو کسی خاص تلاش کے بغیر میں نے چُن لی ہیں۔ پہلی نظم ایک نوعمر شاعر کی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

ڈھلتی ہوئی شام کا سمے ہے
سورج زمین میں ڈوب چکا ہے
ایک مسافر کی بس چھوٹ گئی ہے
اور وہ اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتا پھر رہا ہے
ٹکٹ گھر کی ہر کھڑکی میں جھانک آتا ہے
راستے سے گذرنے والی ہر موٹر کو روکنے کے لئے بیفائدہ ہاتھ ہلاتا ہے
تانگوں اور ٹرک گاڑیوں کے پیچھے دوڑتا ہے
لیکن ناکام رہتا ہے
رات کے سائے گہرے ہوتے جا رہے ہیں
اس کے دماغ اور جسم کی تیز و تند سرد لہریں
ہر لحظہ اُسے کاٹ رہی ہیں
پھر وہ سوچتا ہے
کیا اس بھرے پڑے شہر میں کوئی ایسا ہے جو اس کا اپنا ہو
اور آخر رنجور و دل شکستہ
ایک کارواں سرائے کا رُخ کرتا ہے
تو بھی اس جیسی ہی ہے

(سرتیدر گل۔ آرسی ۱۰ اگست ۱۹۶۵ء ــــــــ)

اب ایک بیشتر شاعر کی یہ نظم دیکھیے:۔

ہمارا عہدِ طفلی تاریک تھا
میرا اور تمہارا ــ دونوں کا
دسمبر کی سرد رات کی طرح تاریک
تاریک اور تنہا
اس تاریکی میں ایک روشنی تھی
میرے دوست کا تابناک چہرہ
روشنی جھلملائی
دل کی گرمی سے پگھلے ہوئے الفاظ کتنے جاں نواز تھے

بچپن کے دن تاریک تھے
رائیگاں
تاہم کتنے خوشگوار
پھر ہم بڑے ہو گئے ــــ میں اور تم
روشنی ہم سے چھین لی گئی
تابناک چہرے کی جگمگاہٹ مٹا دی گئی
دن کے وقت، پسینے میں شرابور، لاکھوں محنت کش
میرے ساتھی تھے
راتیں تنہا اور تاریک تھیں
میرے ہونٹوں پر ایک فریاد مچل جاتی
اور سرد ہوائیں اُسے وہیں منجمد کر دیتیں
پھر چند روز بعد
تم نے اور میں نے مل کر ایک پکّی سڑک بنائی
جیسے کسی دوشیزہ کی ایک بے باک انگڑائی
اب ہمارے اطراف لاکھوں جگمگاتی ہوئی لہریں تھیں
جن سے چاند کی سی خُنک شعاعیں پھوٹتیں
جس طرح کسی سفید پوش پادری کے ہونٹوں سے
دُھلے ہوئے الفاظ برستے ہیں
سود و زیاں کی اس بے مروّت دنیا میں
تم اور میں اب نکمّے آدمی نہیں ہیں
تاریکی اب ہمیں ایک آنکھ نہیں بھاتی
چاندنی پایندہ باد
تاریک دنوں کے دوستوں کی اب ہمیں کوئی ضرورت نہیں

(ــــ ہر بھجن سنگھ۔ آرسی، اگست ۱۹۶۵ء ــــ)

پنجابی کی نئی کہانیوں میں بھی ہم کو ایک قسم کی مایوسی اور اُلجھن ملتی ہے۔ اجیت کور نے اپنی ایک کہانی میں ایک نامرد شوہر کا نقشہ لکھا ہے جس کی بیوی شوہر سے ناآسودہ ہو کر اپنے شوفر کے ساتھ ہم بستر ہو جاتی ہے۔ کلونت سنگھ ورک، ایک لمحہ کی تمام تر بے اثری

کو اپنی گرفت میں لانے کی اس طرح کوشش کرتے ہیں کہ ـــ کسی رستوران میں ایک شادی شدہ مرد، شام کے طویل اور اذیت ناک انتظار کے بعد ایک شادی شدہ عورت سے ملتا ہے۔ پھر وہ دونوں چائے پیتے ہیں، ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں اس کے بعد عورت اپنے کمسن بچے کے ساتھ جو گویا اس کی ڈھال بنا ہوا تھا اپنے گھر لوٹ جاتی ہے۔

تاہم انصاف کی بات نہ ہوگی کہ سارا الزام نئے لکھنے والوں کے سر ڈال دیا جائے۔ نئے لکھنے والوں کے ہاں بڑھنے، ابھرنے اور چمکنے کے امکانات بھی پائے جاتے ہیں۔ ہمارا نیا لکھنے والا اپنے کام کے بارے میں سنجیدہ ہے۔ اس کا آغاز اچھا ہوا ہے اور وہ اپنے راستے پر بخوبی آگے بڑھ رہا ہے لیکن پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے ـــ اور یہ ایک بڑا سوال ہے کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟ شاید وہ خود بھی اس کا جواب نہیں جانتا۔

"اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ رہ کر سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں ہے اس لئے کہ اس میں بہرحال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہوئے ہیں۔ اور اگر اب ممکن بھی ہو تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں۔ اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجش نے باوجود بہت ہی چھوٹی سی بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات ہے۔ اس کا ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں۔ خاص طور سے انسانی برادری کے نشتر دکھ درد کے رشتے"

فیض احمد فیض

(دستِ تہ سنگ)

جے راج آنند

جدید سوسائٹی میں ادیب کی ذمہ داریاں

ے عہد میں تخلیقی ادیبوں اور فنکاروں کا رول کیا ہے؟ اس سوال پر مختلف اور متضاد نقاطِ نظر پائے جاتے ہیں
ۂ نظر پچھلے پچاس ساٹھ برس کے دوران میں ابھر کر سامنے آئے ہیں۔
ؤ فن برائے فن، کا نقطۂ نظر ہے جسے فرانس کی انتشاریت پسند تحریک نے فروغ دیا اور دوسرا نقطہ یہ ہے کہ کوئی ادیب
ں سے اپنے آپ کو بری نہیں کر سکتا کیونکہ وہ سماج ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے اور جب تک اس کی سماجی بصیرت
ے پڑھنے والوں کے جذبات پر بھی اثر انداز نہیں ہو سکتا۔
ون متضاد لیکن اہم نقاط نظر کے علاوہ اور بھی کئی ایک ایسے چھوٹے چھوٹے نظریئے ملتے ہیں جو مفاہمت
ار اور سرکار پرست ادیبوں کی ایجاد ہیں۔
ت پسندوں کا کہنا ہے کہ جمود کو توڑنا تو کجا، ادیب و شاعر جمہور میں کوئی معمولی سی حرکت تک پیدا نہیں
ن کار، ادیب صرف ایسا مال بازار میں لاتے ہیں جس پر سب سے زیادہ بولی لگتی ہے اور سرکار پرست ادیب
ہاں میں ہاں ملاتے ہیں جو ان کی سرکار کے ذریعے ہوتے ہیں۔ چاہے وہ سرکار کلیسا ہو یا مملکت یا
علم شے۔
جن اقسام کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان میں ایسے ادیبوں کی تعداد بہرحال بہت کم ہے جو اپنی تمام تر شعوری
جود انسانوں سے ربط و تعلق قائم رکھنے کی ضرورت سے بے نیاز ہو سکتے ہیں۔
بھی اپنی زندگی اور ماحول سے آنکھیں نہیں چرا سکتا اور نہ اس سماج سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھ سکتا
سانس لیتا ہے اور نہ اس کے لئے یہ ممکن ہے کہ مختلف قسم کے سماجی نظاموں کی نابرابری، بے انصافی
ے الگ تھلگ رہے۔
سے لحظہ تک انسانی زندگی کی داستان پر ایک نظر ڈالیں تو شاید یہ بات زیادہ واضح ہو جائے۔
سانی تقاضوں کے تحت عورت کے رحم میں بچے کی تخلیق اور صورت گری کا عمل طے پاتا ہے پھر وہ عالم وجود
فقت، اور دیکھ بھال کے ماحول میں آہستہ آہستہ بڑا ہوتا ہے۔ ماں باپ اور استاد اس کی نشو و نما کے

معاون بنتے ہیں۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے خاندان سے محبت اور نفرت کے رشتے قائم کرتا ہے۔ اس کے احساسات جذبات اور خیالات میں بھی بتدریج پختگی پیدا ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ خاندان کی حدوں سے نکل کر پوری برادری قوم اور تمام بنی نوع انسان سے اس کے رشتے وابستہ ہوجاتے ہیں۔ زندگی کے تقاضے اس کے جسم و روح کو للکارتے ہیں۔ اُس کی جسمانی و روحانی نشوونما کے لئے جو عناصر اس کے معاون بنتے ہیں، اُن کی اہمیت کو وہ تسلیم کرتا ہے۔ پھر بھی سماجی زندگی کے مختلف شعبوں میں اس کی شرکت اس کے اندر آگے بڑھنے کی چیٹک پیدا کرتی ہے اور جس سماج سے اس کا تعلق ہوتا ہے اُس کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنی شخصیت کی تکمیل کا جذبہ شدت سے اُس کے دل میں اُبھرتا ہے۔ اُس کی زندگی کا آدھا حصّہ انسانی مقاصد کے حصول کی جد و جہد اور اس جد و جہد سے اپنے آپ کو ہم آہنگ بنانے میں گزر جاتا ہے اور باقی آدھا حصّہ زندگی کی موروثی آویزشوں کی بوجھ سے عہدہ برآ ہونے کی کوششوں میں صرف ہوجاتا ہے جب یہ بات طے ہے کہ جو کچھ اس کرۂ ارض پر پیش آتا رہتا ہے انسان اس کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ تو اس کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ فرد کی نامیاتی زندگی اپنے ابنائے جنس کی جانب اس کے عمل اور ردِ عمل سے متعین اور متشکل ہوتی ہے کہ اسی ذریعہ سے وہ اپنی بدولی حاصل کرتا ہے اور پھر جو سماجی پابندیاں اور ذمہ داریاں اس پر عائد ہوتی ہیں ان کو پورا کرتا ہے۔ عمل و اقدام کا یہی فطری طریق کار بعض اخلاقی، ذہنی اور طبعی اقدار و معیارات کا متقاضی ہوتا ہے۔

ان اقدار و معیارات کا سرچشمہ کہاں

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ ان کی آگہی موروثی ہوتی ہے جو پیدائش کے ساتھ ہی انسان کے حصے میں آجاتی ہے اور بعضوں کا خیال ہے کہ تمام اقدار و معیارات اُس ماحول کی دین ہوتے ہیں جن میں انسان نشوونما پاتا ہے۔ لیکن اصل صداقت یہ ہے کہ انسان کا پیدائشی ورثہ اور پھر اُس کا ماحول۔ یہ دونوں مل کر ہی انسانی اقدار و معیارات کو متعین کرتے ہیں۔

تخلیقی ادب کا مطالعہ، مختلف اربابِ حکمت کے افکار و خیالات اور ماہرین عمرانیات کے الگ الگ نظریوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔ تخلیق ادب کے مطالعہ سے ہی ہمیں پتہ چلتا ہے کہ انسان کا پیدائشی مزاج چاہے اس کا میلان کچھ ہو، کسی طرح اپنے اردگرد کے لاکھوں متنوع واقعات سے متاثر ہوتا ہے۔ افراد گروہوں اور اقوام کے ٹکراؤ اور دباؤ سے پیدا ہونے والے حالات عالم انسانی کی بنیاد ہوتے ہیں۔ زندگی اپنے نت نئے ہنگاموں، رنگا رنگی، ہما ہمی اور ان جانے امکانات کے باوجود ایک صداقت کُلّی ہوتی ہے اور موت اس کی ضد۔ لیکن کارل جاسپرس، مارٹن ہیڈ گر اور البرٹ کامو جیسے اربابِ فکر و حکمت، اس حقیقت کو نہیں مانتے۔ انھوں نے موت کو انسان کی نمود کامل سے تعبیر کیا ہے۔ وہ زندگی کے جانی دشمن اور موت کے پیامبر تھے۔ انھیں کے افکار کے باعث عصرِ حاضر کے بحران پر قابو پانے میں رکاوٹیں پیدا ہوئی ہیں۔

انسان کو انسان سے جوڑنے والے رشتے ایک ناقابل انکار حقیقت کا حکم رکھتے ہیں۔ ایسے منتھی بھر افراد بھی

جو اپنی موروثی دولت کے سہارے، زندگی سے الگ تھلگ، فراغت و آرام کے ساتھ روز گذارتے ہیں وہ بھی اپنے باغ سے ملے ہوئے دوسرے لوگوں کے باغوں پر نظر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ ایسے لوگ جسے آزادی سمجھتے ہیں کسی عنوان بھی آزادی سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ وہ بڑی خام خیالی اور خود فریبی میں مبتلا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ زندگی اور سماج سے ان کی بے تعلقی اور بے نیازی بھی تو انھیں منافعوں کی دین ہے جو دوسروں کی جیب کاٹ کر حاصل کئے گئے ہیں۔

دوسروں کو لوٹنے والے اپنی دولت و املاک کو دوسرے کے حوالے بھی کر سکتے ہیں لیکن جو شخص صرف اپنی محنت سے روزی کماتا ہے۔ وہ کس طرح سماج سے اپنے آپ کو بے تعلق رکھ کر نام نہاد انسانی آزادی کا دعویدار بن سکتا ہے اگر وہ اپنا کام چھوڑ دے اور کسی صاحبِ ثروت کی طرح خلوت نشیں بن جائے یا کسی سادھو کی طرح جنگل میں جا بیٹھے تو ظاہر ہے کہ وہ بے روزگار بن جائے۔

بعض تخلیقی فنکار کبھی کبھی اس انداز سے سوچتے ہیں کہ ہمارا یہ سماج، جو صرف زر داری کا سماج ہے ہم کو الگ تھلگ رہنے اور تنہائی کی زندگی گذارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ بس ہم پر اس سماج کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی اور ہم ایسی تمام ذمہ داریوں سے آزاد ہو کر فن برائے فن کی تخلیق میں اپنے آپ کو مصروف رکھ سکتے ہیں۔

ایسے ادیب اور فن کار انسانی تعلقات کے بارے میں اس نافہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کہ بدی، ناانصافی اور غلطی بھی انسان کو وراثتاً حاصل ہوتی ہے۔

قرونِ وسطیٰ کے کبیر، نانک اور تکارام جیسے عظیم ہندوستانی شاعروں اور فن کاروں اور عصرِ حاضر کے گرو دیو ٹیگور، گاندھی اور جواہر لعل نہرو جیسے بلند مرتبت ہندوستانی ادیبوں، دانشوروں اور کلاکاروں نے ان سوالات کے جواب دیئے ہیں۔ ان سب نے انسانوں کے باہمی رشتوں پر زور دیا ہے۔ اور سماجی ناانصافی سے رستگاری اور تزکیۂ نفس کے ذریعہ انسانی زندگی کی تکمیل کا پیغام سنایا ہے۔

عہدِ حاضر کی زندگی کے فوری تقاضے بہت صاف اور واضح ہیں، منزل تک پہونچنے اور ان ناگفتہ بہ حالات سے نکلنے کی جدوجہد جن میں ہمارے اجنبی آقاؤں نے کئی نسلوں تک ہم کو جکڑے رکھا اور پھر اس دنیا کو ذلت و انحطاط کے اس گڑھے سے نکالنے کی کوشش جس میں وہ انسان کے ہاتھوں انسان کے استحصال اور منافع خوری کے نظام کی وجہ سے گر گئی ہے ——— یہ سب ایسے تقاضے ہیں جو ہمارے ضمیر کو جھنجوڑتے ہیں اور تبدیلی کی ضرورت کا احساس ہمارے دلوں میں پیدا کرتے ہیں۔

لیکن ایک ادیب یا فن کار کے ذہن میں تبدیلی کا کوئی میکانکی تصور نہیں ہوتا وہ اپنے تخلیقی فن یا ادب کے ذریعہ زندگی کا روپ بدلنا چاہتا ہے۔ جس کا اثر دوسروں کے احساس کی تہوں تک پہونچ جاتا ہے۔ اس طرح تخلیقی ادب اور اسے پوری شدت کے ساتھ افراد اور گروہوں کے باہمی تعلقات کا انکشاف کرتا ہے اور انسانی ضمیر کی مختلف سطحوں

کو حرکت میں لاتا ہے۔

نقطہ ایک قسم کا عمل ہوتا ہے۔ نقطہ اور عمل کا اٹوٹ تعلق ایک تمثیل بن کر ہمارے سامنے آتا ہے۔ نقطہ ایسی حکایتیں داستانیں، اور کہاوتیں سناتا ہے جو اپنی طاقت اور اثر آفرینی کے ذریعہ دوسروں کو بھی اُن کی اپنی الجھنوں سے باہر لے آتی ہے اور وہ اس طرح اُن کے قول و عمل میں یک جہتی پیدا ہو جاتی ہے۔

تخلیق کا یہ عمل اپنی بلند ترین سطح پر پہونچ کر پیغمبری کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ پھر شاعر اگر پیغمبر نہیں تو کچھ بھی نہیں ایسا ہی فنکار اور شاعر کے بارے میں شیلی نے یہ آدرش پیش کیا ہے۔ کہ "بس رشتے جوڑ دو" — اور ایسا ہی شاعر گویا ایک انجانا قانون ساز بن جاتا ہے۔

(ترقی پسند مصنّفین کی کانفرنس کے لئے)

ادیب اور عوام

"عوام سے الگ رہ کر ہم بیگانہ کے محض رہ جائیں گے۔ ادیبوں کو انسانوں سے مل جل کر انہیں پہچاننا ہے میری طرح گوشہ نشین رہ ان کا کام نہیں چل سکتا۔ میں نے ایک مدت تک سماج سے الگ رہ کر اپنی ریاضت میں جو غلطی کی ہے اب میں اسے سمجھ گیا ہوں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج یہ نصیحت کر رہا ہوں۔ میرے وجود کا تقاضا ہے کہ انسانیت اور سماج سے محبت کرنا چاہیئے۔ اگر ادب انسانیت سے ہم آہنگ نہ ہوا تو وہ ناکام و نامراد رہے گا۔ یہ حقیقت میرے دل میں چراغِ حق کی طرح روشن ہے اور کوئی استدلال اسے بجھا نہیں سکتا"

ٹیگور کا خط ترقی پسند مصنّفین کے نام

ساحر لدھیانوی

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے غم ناک دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے ۔ کہ جان و دل
تاعمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

گو ہم سے بھاگتی رہی یہ تیز گام عُمر
خوابوں کے آسرے پہ کٹی ہے تمام عُمر
زُلفوں کے خواب، ہونٹوں کے خواب اور بدن کے خواب
حُسنِ بیاں کے خواب، کمالِ سخن کے خواب
شامِ خزاں میں صبحِ بہارِ چمن کے خواب
زنداں کے خواب، کوچۂ دار و رسن کے خواب
شائستگیٔ دہر، فروغِ وطن کے خواب

یہ خواب ہی تو اپنی جوانی کے پاس تھے
یہ خواب ہی تو اپنے عمل کی اساس تھے
یہ خواب مر گئے ہیں تو بے رنگ ہے حیات
اپنے بدن پہ آپ ہی اب تنگ ہے حیات

آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے
ورنہ یہ رات آج کے غم ناک دور کی
ڈس لے گی جان و دل کو کچھ ایسے ۔ کہ جان و دل
تاعُمر پھر نہ کوئی حسیں خواب بُن سکیں

شمیم کرہانی

مَیکدہ

اگرچہ موردِ تہمت ہے مَیکدہ لیکن
یہاں بہارِ جنوں کی شگفتگی تو ملی
جلے حیات کے ہاتھوں پہ جام و گل کے چراغ
اندھیری رات کے صحرا کو روشنی تو ملی
برس رہی تھی اُداسی غموں کی دنیا میں
کہاں خوشی تھی میسّر یہاں خوشی تو ملی
گلوں کی آڑ میں آنکھیں جھپک گئیں تو ذرا
غموں کی چھاؤں میں خوابوں کی زندگی تو ملی
اسیرِ زندگیٔ تنگ نائے دنیا کو
اجازتِ سفرِ ماہ و مشتری تو ملی
کہاں تھی دیر و حرم میں دلوں کی یکرنگی
یہاں شیوخ و برہمن میں دوستی تو ملی

خلوصِ دل کی قباؤں میں رنگ و بو تو نہیں
یہاں لباسِ محبت میں سادگی تو ملی
غبار خوردہ جبینوں پہ چاندنی جھلکی
خزاں رسیدہ رُخوں پر بہار سی تو ملی
حیات جاگ تو اُٹھی دلوں نے سانس تو لی
چہل پہل نظر آئی، ہما ہمی تو ملی

خرد کا نازِ لباسِ نمائشی تو گیا
جنوں کو فرصتِ رقصِ برہنگی تو ملی

رشید اختر

شہرِ ہوس کے در پر

(۱)

شکستہ اینٹوں، پرانے گارے کی اک فصیلِ بلند بطنِ زمیں میں پنجے گڑوئے ہنستی کھڑی ہوئی ہے
شکستہ اینٹیں نہ جانے کتنے ہی موسموں کی تمازتوں میں جھُلس چکی ہیں
ہوائے دوراں کی سرد مہری سے لڑ چکی ہیں
تغیّراتِ زماں کی بھٹّی میں تپ چکی ہیں
زمیں میں ان کی جڑیں ہزاروں برس سے پیوست ہو رہی ہیں
حدِ نظر تک زمیں کو ان سے مفر نہیں ہے

بلند و بالا عظیم و برتر فصیل میں راستہ نہیں ہے
بس ایک در ہے
جہاں یہ کتبہ شکستہ اینٹوں کے درمیاں جگمگا رہا ہے
"یہاں وہ آئے
جو اپنے سر سے دماغ کا بوجھ اُتار کر رکھ چکا ہو پہلے
یہاں وہ آئے
جو اپنے سینے سے دل کی ایسی فضول شے کو کھُرچ چکا ہو

یہاں وہ آئے
جو اپنی آنکھوں کو نقرۂ وزر کی تابناکی میں رہن رکھ دے
یہاں وہ آئے
جو اپنے لب پر زرو جواہر کی مُہر کرلے
یہاں نہ داخل ہوں وہ
جو سر میں دماغ، سینے میں دل، لبوں پر کلام، آنکھوں میں نور لائیں
یہ شہر بھی بے دماغ و دل، بے نگاہ ولب ہے۔"
حروف بجلی کی طرح ہنستے چمکتے گرتے ہیں آنے والوں کے راستے میں
چمکتے روشن حروف کے تیرہ دل معانی برسنے لگتے ہیں ابر بن کر
دماغ و قلب و نظر کو ملتا نہیں ہے رستہ
فصیلِ کہنہ کھڑی ہوئی ہنس رہی ہے پیہم
بلند دروازہ بانہیں کھولے بُلا رہا ہے "
نگاہبانِ فصیل و در مستعد کھڑا ہے
نگاہباں کی چمکتی آنکھوں میں دو دہکتے ہوئے جواہر جڑے ہوئے ہیں
وہ سر سے پا تک چمکتے سونے کا زندہ پیکر بنا ہوا ہے
طلائی خود اُس کے سر پہ رکھا دمک رہا ہے
لہو کے مانند سُرخ چہرہ سُنہری کڑیوں کے درمیان مُسکرا رہا ہے
بجائے دندان قطارِ یاقوت و لعل و نیلم چمک رہی ہے۔
سُنہری داڑھی طلائی تاروں کا سلسلہ ہے
جو تا بہ سینہ زرہ کے اوپر بکھر گیا ہے
بدن کو جکڑے ہوئے ہیں دو دو طلائی زرہیں
جگہ پہ دل کے سیاہ پتھر جڑا ہوا ہے
گلے میں ترکش پڑا ہوا ہے
کہ جس میں ہیرے کی نوک والے سُنہرے پیکان بھرے ہوئے ہیں

اور اُس کے کاندھے پہ حُرملہ کی کماں رکھی ہے
بندھے ہیں بازو پہ دو طلائی چمکتے جوشن
ہے اُس کے اک ہاتھ میں وہ نیزہ
انی میں جس کی پرو کے رکھے ہیں ان گنت دل
ہے دوسرے ہاتھ میں وہ خنجر
ہیں جس کے قبضے پہ شمر کی انگلیوں کے خونیں نشان اب تک

قریبِ در اک عظیم بھٹّی دہک رہی ہے
غضب کی حدّت ہے، ایٹموں کے کلیجے شق ہیں
پڑے پگھلتے ہیں اس میں وہ دل دماغ جن کو
تمام نو واردانِ شہرِ ہوس کے سینوں سے اور سروں سے
کھُرچ کھُرچ کے نگاہبانِ فصیلِ در پھینکتا رہا ہے
یہیں پہ داغا گیا ہے آنکھوں کو اور زباں کو
یہیں پہ ہوتی ہے ثبت مہرِ زرد جواہر نگاہ و لب پر
کہ جو بھی داخل ہو شہر میں
وہ نگاہباں کی نظر سے دیکھے
نگاہباں کے لبوں سے بولے
خود اپنی آنکھیں، زبان و لب سب نگاہباں کے حضور رکھ دے

○

بغیر نذرِ دل و دماغ و نگاہ و لب داخلہ نہیں ہے
مگر اک انبوہِ تشنہ کاماں فصیل کے ہر چہار جانب بھٹک رہا ہے
شکستہ اینٹوں، پرانے گارے۔ سے اپنی نظریں پٹک رہا ہے
فصیل کے ہر چہار جانب سلگتا تپتا وسیع میدان دہک رہا ہے
یہ پورا میداں حدِ نظر تک ہجوم ہی سے چھلک رہا ہے
ہجوم جس کے سروں پہ آتش برس رہی ہے
قدم کے نیچے زمین سانپوں کے منھ سے اک اک کو ڈس رہی ہے
"نہ پائے ماندن نہ جائے رفتن"
سروں پہ گرتی پگھلتی آتش سے کوئی جائے پناہ ہے تو فصیل میں ہے
زمیں کے سانپوں سے کوئی جائے اماں ہے تو اس فصیل میں ہے
ہجوم لاکھوں فگار پیروں سے چل رہا ہے
ہجوم لاکھوں برہنہ جلتے سروں کی شمعیں اٹھائے آگے کو بڑھ رہا ہے
فصیل میں راستا نہیں ہے۔
فصیل و میدان کے درمیاں اک عمیق خندق کھدی ہوئی ہے
جو خوں کی ایسی رقیق گاڑھی سیاہی مایل غلیظ شے سے بھری ہوئی ہے
یہ کیسی شے ہے؟
اگر یہ خوں ہے تو کس کا خوں ہے؟
لہو کا ٹھہرا ہوا یہ جامد عمیق دریا غلاظتوں کے لبوں سے سنتا پڑا ہوا ہے
کسے ہے جرأت جو پاس آئے
فصیل کے اُس طرف سے برجوں میں چھپ کے بیٹھے ہوئے محافظ
کماں کے چلّوں میں تیر جوڑے نظر جمائے ہجوم گریاں کو تک رہے ہیں
ہزاروں روزن دہکتی آنکھوں کی تیز کرنیں بدن بدن میں چبھو رہے ہیں
عظیم جثّہ گرجتی طیّارہ مار توپیں دہانے کھولے کھڑی ہوئی ہیں
کہ آسماں کی طرف سے کوئی اُتر نہ پائے

ہجومِ آشفتہ گانِ گمرہاں بھٹک رہا ہے
چہار جانب سے نامراد و شکستہ دل آ رہے ہیں در کی طرف لپکتے
بلند دروازہ باہیں کھولے بُلا رہا ہے
نگاہبانِ فصیلِ در مستعد کھڑا ہے
تمام لوحِ دردانِ شہرِ ہوس کے سینے کھُلے ہوئے ہیں
سروں کے ڈھکنے ہٹے ہوئے ہیں
کھُرچ کھُرچ کر نکالتا ہے نگاہبانِ دل
سروں کو بارِ دماغ سے کر رہا ہے ہلکا
پھر اُن کی آنکھوں اور اُن کے ہونٹوں پہ مُہر کرتا ہے لعل و زر سے
اور اُن کے سینے میں ٹانک دیتا ہے سنگِ اسود
یہ کامراں اب فصیلِ شہرِ ہوس کے مانے ہوئے مکیں ہیں

○

راہی معصوم رضا

دو نظمیں

لفظ

میری پونجی ہیں یہی لفظ ———
یہی تھوڑے سے لفظ!
مفت کا مال سمجھ کر میں لُٹاتا رہا اِس دولتِ بے پایاں کو
جس تصوّر کے لئے ایک ہی لفظ بہت تھا اُسے سَو لفظ دیئے
میں اس اقلیمِ سخن کا کوئی آوارہ سا شہزادہ تھا
مجھ کو یہ فکر نہ تھی
مجھ کو یہ معلوم نہ تھا
لفظ بھی گھِستے ہیں، مٹتے ہیں، بکھر جاتے ہیں
لفظ بیمار بھی پڑتے ہیں
اور اک ذرا سی بیماری ہی طرح لفظ بھی مرجاتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا
کہ ہر اک لفظ کو صدیوں نے سنوارا ہوگا
یہ جو آئے ہیں تو کتنوں نے پکارا ہوگا
میں لُٹاتا رہا اس دولتِ بے پایاں کو
اور اب، جب کہ زمانے کو بتانے کے لئے
میرے دل میں کئی قصے ہیں، کئی باتیں ہیں
دیکھتا ہوں تو مرے پاس کوئی لفظ نہیں۔

احتجاج

اے خُدا
اِس حلقۂ زنجیر میں اب گھُٹ رہا ہے دم مرا
آزاد کر
آزاد کر
——— آزاد کر
اہلِ جنوں اُٹھے بگولوں کی طرح
گردِ سفر لپکی وہ شعلوں کی طرح
تیرا اُفق
اب آتشِ شوقِ فراواں سے پگھل جانے کو

خلیل الرحمٰن اعظمی

نقطۂ آغاز

اور پھر یوں ہوا:

جو پُرانی کتابیں، پُرانے صحیفے
بزرگوں سے ورثے میں ہم کو ملے تھے
انھیں پڑھ کے ہم سب یہ محسوس کرنے لگے
ان کے الفاظ سے کوئی مطلب نکلتا نہیں ہے
جو تعبیر و تفسیر اگلوں نے کی تھی
معانی و مفہوم جو ان پہ چسپاں کیے تھے
اب ان کی حقیقت کسی واہمے سے زیادہ نہیں ہے

اور پھر یوں ہوا:

چند لوگوں نے یہ آکے ہم کو بتایا
کہ اب ان پُرانی کتابوں کو تہ کر کے رکھ دو
ہمارے وسیلے سے تم پر نئی کچھ کتابیں اُتاری گئی ہیں
انھیں تم پڑھو گے
تو تم پر صداقت نئے طور سے منکشف ہوگی
بوسیدہ و منجمد ذہن میں
کھڑکیاں کھل سکیں گی
تمھیں علم و عرفان اور آگہی کے خزینے ملیں گے

اور پھر یوں ہوا:

اِن کتابوں کو اپنی کتابیں سمجھ کر
انھیں اپنے سینے سے ہم نے لگایا
ہر اک لفظ کا ورد کرتے رہے
ایک اک سطر کو گنگناتے رہے
ایک اک حرف کا رس پیا
اور ہمیں مل گیا
جیسے معنی و مفہوم کا اک نیا سلسلہ

اور پھر یوں ہوا:

اِن کتابوں سے اک دن یہ ہم کو بشارت ملی
آنے والا ہے دنیا میں اب اک نیا آدمی
لے کے اپنے جلو میں نئی زندگی
ہم اندھیری گپھاؤں سے
اوہام کی تنگ گلیوں سے نکلیں گے
ہم کو ملے گی نئی روشنی

اور پھر یوں ہوا:

لانے والے کتابوں کے
اور وہ بھی جو اُن پہ ایمان لائے تھے
سب اپنے اپنے گھروں سے نکل کر
کسی سمت کو چل پڑے
ایسے اک راستے پر جدھر سے نیا آدمی
آنے والا تھا یا ہم کو اس کا یقیں تھا
کہ وہ آئے گا اور اسی سمت سے
بس اسی سمت سے آئے گا۔

اور پھر یوں ہوا:

دیر تک ہم نئے آدمی کے رہے منتظر
دیر تک شوقِ دیدار کی اپنی آنکھوں میں مستی رہی
دیر تک اس کی آمد کا ہم گیت گاتے رہے۔
دیر تک اس کی تصویر ذہنوں میں اپنے بناتے رہے
دیر تک اس خرابے میں اک جشن ہوتا رہا

اور پھر یوں ہوا:

دیر تک اور بھی دیر تک جب نہ ہم کو ملا
آنے والے کا کوئی پتہ
اس کے قدموں کی کوئی نہ آہٹ ملی
ہم نے پھر زور سے اس کو آواز دی
"اے نئے آدمی!
اے نئے آدمی!!"
اور یہ آواز اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کے
بے نام صحراؤں سے لوٹ کر
پھر ہماری طرف آ گئی

اور پھر یوں ہوا:

چند لوگوں نے سوچا کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
دوسرے چند لوگوں نے سوچا کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
اور پھر ہر طرف قافلے قافلے
اور پھر ہر طرف راستے راستے

اور پھر یوں ہوا:

دیر تک اس نئے آدمی کی رہی جستجو
اس کو آواز دیتے رہے چارسو
کو بکو قریہ قریہ اسے ہم بلاتے رہے
منزلوں منزلوں خاک اُڑاتے رہے

اور پھر یوں ہوا:

سب کے چہرے اسی خاک میں اٹ گئے
سب کی آنکھوں میں اک تیرگی چھا گئی
سب کو ڈسنے لگی راہ کی بے حسی
اور پھر سب وہ اک دوسرے کے لئے
اجنبی ہو گئے
اور پھر سب کے سب دھند میں کھو گئے

اور پھر یوں ہوا:

ہم نے پھر گھر پہ آ کر کتابوں کے اوراق کھولے
انھیں پھر سے اک بار پڑھنے کی خاطر اُٹھایا
ہر اک سطر پر غور کرتے رہے دیر تک
اور ہر لفظ کو دوسرے لفظ سے جوڑ کر
سلسلہ حرف و نغمہ کا صوت و صدا کا ملاتے رہے
اور پھر یاس و امید کے درمیاں
ڈھونڈتے ہی رہے اُس نئے آدمی کا نشاں
اور ہمیں بس ملیں
اپنی آواز کی زرد سوکھی ہوئی پتّیاں

اور پھر یوں ہوا:

ہم سے سورج کئی روز روٹھا رہا
آسمانوں سے اُٹھتی رہیں تہ بہ تہ بدلیاں
کالی کالی نظر آئیں سب وادیاں
کالے گھر، کالی دیواریں، کالی چھتیں
کالی سڑکوں پہ چلتی ہوئی کالی پرچھائیاں
یہ زمیں کالے ساگر میں ٹوٹی ہوئی ناؤ کی طرح سے ڈگمگانے لگی
موت کی نیند آنے لگی

اور پھر یوں ہوا:

ہم نے اپنے گھروں میں جلائے خود اپنے دیئے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب، ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
بجھے جسم کی راکھ سے
سر اُٹھاتے ہوئے ایک ننھّے سے شعلے کو
اور اپنے چہرے میں اک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لیے آپ اپنی کتابیں لکھیں

پرویز شاہدی

شہرِ گفتار

شہر آشوبِ سخن
قحط معنیٰ کا، مفاہیم کا کال
کھڑکیاں آنکھوں کی، کانوں کی، بند!
ذہن کے ٹوٹے دریچوں میں فقط حبس کو بار!
دل کے دروازے میں قفل ـــــــ
ایک بیزاریٔ مبہم کا قفل!
فہم و ادراک کی منڈی سونی!
جنسِ ابلاغ سے ہونٹوں کی دکانیں خالی!

بے سُری نسکر،
ترنم سے خفا احساسات!،
نہ کہیں حرف و حکایت کا سوال!
نہ کہیں شکر و شکایت کا خیال!
نہ کسی خواب کا جادو،
نہ کسی شوق کا سحر!
خود پسندی کی گلی کوچے میں اُڑتی ہوئی گرد!
خود کلامی کا سسکتا پندار،
نرمیٔ لہجہ کی دیوار کے سائے کے تلے،
زرد رخساروں پہ خاکسترِ آواز ملے،
بھرے آنکھوں میں دھواں،
اشک فشاں!

شعلۂ روح خموش!
شررِ مُردہ کو آتش نفسی کا دعویٰ!
وہم تنہائی کا بجھتا ہوا کرب،
"حُسن بیزار"
"وفا آزردہ"
ساری دنیا سے خفا،
وضع پستی کا شکار،
ہاتھ پھیلائے ہوئے،
مانگتا،
رفعت کی بھیک ـــــــ
اوجِ تہذیبِ ہوس کی خیرات!
ہوس افروز تمدّن کے کنول،

دیتے مدقوق گدائی کو دعا!

اور.....

اس "کج طلبی" کا حاصل

کھوٹے لفظوں کے سوا کچھ بھی نہیں!

صرف "الفاظِ تہی" ———

چند "اصواتِ گرہ گیر و تنک مایہ" کا فیض

یاس افسردہ لب و "خستہ آنا" کی قسمت!

بے کسی مانگے گی،

بے سمتیِ غم مانگے گی!

اونگھتے شام و سحر!

نزع میں قلب و نظر!

دیدہ و دل کے کھنڈر ـــ مرگِ مسلسل کا ہنر

منظرِ عبرت انگیز ———

جرأت آموزِ شعور!

اور نزدیک

اسی شہر کی سرحد کے قریب

ایک شہر اور ہے، شہرِ گفتار

حرف زن ہم سخنوں کی بستی ———

جنتِ چشم و زباں ——

گوش شنوا، لبِ گویا کا ارم

دکلامی کے محلّوں کے ریگیسانِ سکوت

خس کو دیہ شک سے پس ماندہ علاقے کا خطاب

رہنے والوں کو یہاں

اپنے ذوق متعدّی پہ یقیں!

ان کی بستی سے طرب خیز ہوا ———

ہم کلامی کی نسیم ———

نکہتِ نطقِ بشر سے لبریز،

گفتگو بیز و تکلّم انگیز"

دور و نزدیک رواں،

رقص کناں!

عظمتِ انساں نگراں!!

شہریار

تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں
حصار تنہائیوں کا توڑا
ہوا میں کچھ رنگ سے اڑائے
خلا میں کچھ دائرے بنائے
کسی کی زلفوں کے خم سنوارے
کسی کے چہرے کے دھندلے دھندلے
نقوش مہتاب میں ابھارے
ادھر کسی شاخ کو ہلایا
ادھر کسی آب جو کو چھیڑا
یہاں وہاں کچھ چراغ رکھے
تمام شب غم گساریاں کیں
تھکی ہوئی آہٹوں کے ہاتھوں نے
بند آنکھوں پہ دستکیں دیں

عزیز قیسی

مواخذہ

ہمارے ساتھ جو کچھ راہ زن بھی ہیں ماخوذ
وہ اہلِ شہر کے کہنے سے چھوٹ جائیں گے

گواہِ کفر ہمیں میں ہے۔ کون پہچانے
ہمیں تو ایک سے لگتے ہیں آج سب چہرے
ہمارا جرم تو رُوپوش بھی نہیں اب کے
کسی گواہ کی حاجت نہیں سزا کے لئے

دیارِ غم کی صدائے نہفتہ پہچانو
ہوائے جبر چراغِ نفس کے درپئے ہے
یہ اور بات ہے خود کو چھپا رہا ہے مگر
"ولیِ شہر" سنبھالے ہے تاج کانٹوں کا
ہجومِ بے سر تماشا کھڑا ہے گلیوں میں
یہ عصرِ خوں کی کفالت کا مدعی ہے ابھی
صلیب ڈھونڈ رہی ہے کسی مسیح کو پھر
یہی گھڑی ہے ہر الزام اپنے سر لے لو

○

عزیز قیسی

رسولِ کاذب

رسولِ مصلوب کے دو ہزار برس بعد یہ واقعہ ہوا . . .

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب رسولِ خورشید راس الافلاک پر چمکتا تھا۔
وہ اک زمستاں کی نیم شب کا سماں تھا
(وہ نیم شب اک رقیق چادر
نہ جانے کب سے زمین کے مردار کالبد پر پڑی ہوئی ہے اور اُس کے مسموم روزنوں سے
نکلے سڑے جسم کا تعفن اُبل رہا ہے)
شجر حجر دُ ھند کے کفن میں چھپی ہوئی خامشی کے سینے میں چبھ رہے تھے
عناصرِ وقت منجمد تھے
تمام روحیں فشارِ مرقد میں مبتلا تھیں
اور ایسے ہنگام میں اک آوازِ نور افگن
ظہورِ خورشید کی بشارت سے دشت و در کو جلا رہی تھی
ہزارہا شب گزیدگاں کے ہجوم سے میں نے اس کو دیکھا
وہ خونِ آدم میں اپنی زندہ خزاں زدہ انگلیاں ڈبوئے کھڑا ہوا تھا

ہجوم سے ایک اک گنہ گار کو بلاتا، اور اس کے ماتھے پہ کلمۂ صبح لکھ رہا تھا
تمام مُردے خزاں زدہ انگلیوں کے چھونے سے جاگتے تھے۔

گناہ گار نفس تھا میں بھی
امیدوارِ شفا تھا میں بھی
پھر اُس زمستاں کی نیم شب میں ہزار لمحاتِ شاق گزرے
اور ایک لمحے نے میرے زخمِ جگر کو چھو کر کہا "مداوائے غم کی ساعت
قریب ہے سجدہ ریز ہو جا"

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب زمین کے بے شمار مُردے لہو کا بپتسمہ لے رہے تھے
(لہو کا بپتسمہ لے رہے ہیں)
رسولِ خورشید کی صدا بھی مرتی گئی، کہُر میں وہ کھو گیا، اور...

اُسی زمستاں کی نیم شب میں خبر ملی ہے
کہ اک شبستانِ نور و نکہت میں بے کفن لاش پر وہ بیٹھا ہوا ہے
کہ اپنے خزاں زدہ ہاتھ سے کسی کے لہو کی تعطیر کر رہا ہے
اور اپنے کاسے کو بھر رہا ہے
خبر ملی ہے،
لہو وہ خورشید کا لہو ہے

○

زاہدہ زیدی

"تجربہ"

(۱) رات کے سرد ہاتھوں میں اک آتشیں جام توبہ شکن
وقت کی شوخ نظروں میں اک عہدِ بے نام، ماتھے پہ اسرارِ نو کی شکن
میری نس نس میں مڑتے، بھٹکتے، سلگتے ہوئے راستوں کی تھکن

(۲) روح اور جسم کی پیاس کہتی ہے
بڑھ کر اُٹھا لو
یہی جام
جس کی ہر اک موجِ بے تاب میں
شعلۂ زیست کی بجلیاں کوندتی ہیں
پی کے اک جُرعۂ موجِ آتش نفس
دل کی تاریکیوں میں جلا لو نئی کوئی شمعِ وفا
روح کی خلوتوں میں کوئی سازِ خود آگہی چھیڑ دو
ذہن کی بے کراں وسعتوں میں مہک اُٹھیں گلہائے افکارِ نو
اور تاریک و پُر پیچ و خم راستوں میں ہزاروں دیئے جل اُٹھیں
ذہنِ بے تاب کو یونہی مل جائے شاید کسی منزلِ جستجو کا پتہ

(۳) میں نے جب بھی پیا کوئی جام مئے زیست
جامِ مئے تُندو توبہ شکن
اُس کے ہر قطرۂ جاں فزا میں کسی زہر کی تلخیاں گھُل گئیں
(زہرِ غم ہر رگِ شوق میں جو کہ تحلیل ہوتا رہا)

اور خونِ تمنا کی وہ گرم، گُلرنگ بوندیں
دامنِ وقت پر برف کی طرح سے جم گئیں

(۴) میں نے جب بھی کبھی منزلِ رنگ و نکہت کی جانب بڑھائے قدم
رنگِ لطفِ سخن
بُوئے مہر و وفا
گرمیٔ سوزِ دل
بے حسی کی اُمنڈتی ہوئی دُھند میں کھو گئی
منزلیں دور ہوتی گئیں

(۵) میں نے جب بھی سجایا کبھی خونِ دل سے کوئی قصرِ صد آرزو
خشک لمحوں کی اُڑتی ہوئی گرد سے
حُسنِ تخئیل کے نقش دھندلا گئے
اور زیرِ زمیں جیسے صدیوں کی سلگی ہوئی آگ سے
اِس حسیں قصر کے بام و دیوار و در جل گئے
ایک تُند اور سفّاک آندھی میں پھر کوئی شمعِ وفا بُجھ گئی
پھر وہی کوہ و صحرا کی پہنائیاں، پھر وہی سرد و پُرپیچ و خم راستے

(۶) آج پھر میرے ہاتھوں میں اک آتشیں جام
وقت کی شوخ نظروں میں اک عہد بے نام
سامنے شہرِ صد آرزو کے سُلگتے کھنڈر
اور پیچھے اندھیری گھنی رات ہے

وارث کرمانی

"سدِّ سکندر"

وہ سنہری صبح وہ کرنوں کی ہر جانب پھوار
جب میں اپنے گھر سے اک لمبی مسافت کے لئے
چل پڑا تھا چھوڑ کر ماں باپ کا بے لوث پیار
ساتھ میں کھیلی ہوئی معصوم شکلوں کا خلوص
جن میں آخر کوئی رضیہ کوئی رادھا بن گئی
وہ رفیقوں کی محبّت وہ بزرگوں کی نگاہ
راہ میں تیرے لئے خضر و مسیحا بن گئی
دھیرے دھیرے میں دیارِ صبح طے کرتا رہا
دوپہر ہوتے میں ایسے ملک میں داخل ہوا
جس کی صورت خواب میں بھی ذہن میں آئی نہ تھی
محوِ حیرت تھا کہ دنیا میں یہ کب شامل ہوا
اس کے طول و عرض میں آباد اک مخلوق تھی

جو بظاہر نسلِ آدم سے مشابہ تھی مگر
ذات میں اس کی چھپی تھیں کچھ جمادات صفات
یعنی وہ انساں شمائل نطق سے محروم تھے
آنکھ ہی اُن کی زباں تھی، آنکھ ہی ہتھیار تھا
آنکھ سے ہٹ کر نہ تھی کچھ ان میں حرکت یا نمود
آنکھ میں سمٹی ہوئی تھی کائناتِ ہست و بود
آنکھ ہی سے دشمنی تھی آنکھ ہی سے ہار جیت
آنکھ ہی میں کر دیں لیتی تھی اک تلوار سی
وقتِ آویزش دکھاتی تھی عجب عالم وہ آنکھ
تیز ہوتی تھی کبھی تو دھم کبھی مبہم وہ آنکھ

جس کی نظریں جھک گئیں وقتِ تصادم مر گیا
اس دیارِ بے اماں میں اپنے رہنے کی جگہ
دوسرے کے واسطے چپ چاپ خالی کر گیا
عقل حیراں تھی کہ ہے اس قوم کی تہذیب کیا
کس جگہ سر پھوڑتے ہوں گے یہاں کے داد خواہ؟
کوئی قاضی تھا نہ مفتی تھا نہ کوئی بادشاہ
اک مسلسل ابتری تھی اک منظّم انتشار
دل نے گھبرا کر کہا مجھ سے کہ اے شامت زدہ
چُپ کھڑا کیا دیکھتا ہے جلد اُلٹے پاؤں بھاگ
یہ زمیں یاجوج اور ماجوج کی ہے سر بسر
آ گیا ہے تو یہاں سدِّ سکندر پھاند کر
میں یہ سُن کر بے تحاشا دوڑتا واپس ہوا
اپنے گھر کی سمت اپنے ارضِ کنعاں کی طرف
سبزہ زاروں پر جہاں آباد تھے کچے مکاں

جنگلوں سے آتی رہتی تھی جہاں ٹھنڈی ہوا
یوسفِ آوارہ کی خوشبوئے پیراہن لیے
وہ زلیخاؤں کا مسکن وہ عزیزوں کا دیار
وہ فضا جس کی کبھی پھاگن کبھی ساون لیے
اس حسیں وادی میں اب پہنچا جو میں دم توڑتا
وہ ہوا پائی نہ وہ موسم نہ وہ نیل و بہار
میرے گھر والے مرے ماں باپ اور بھائی بہن
گردِ ماہ و سال میں لپٹے ہوئے سر تا قدم
چُپ کھڑے تھے سب اُسی مخلوق کی صورت لیے

باقر مہدی

نئی جستجو کا المیہ

تخیّل کی اونچی اُڑانوں سے پہلے
جہاں خواب ٹوٹے پڑے ہیں
مری آرزو بھی وہاں جا کے دیکھوں
رفیقوں، رقیبوں کے چہرے
مری ہر بغاوت پہ ہنستے رہے ہیں
——— میں رفتار کے دائرے توڑ کر
خدا سے پرے جا چکا ہوں

فرشتوں کی پہلی بغاوت کا منظر مجھے یاد آیا
کچھ ایسا لگا جیسے آدم کا سارا المیہ
نئی جستجو کے سہارے ہمیشہ رہے گا

ہر اک بار باغی نئے رہنما بن کے
وہ داستاں پھر سے دہرا رہے ہیں

خود ابلیس حیران ہے
خیر و شر کی نئی کشمکش میں الجھ کر ہر اک بار یہ سوچتا ہے
"خدایا ——— میں مظلوم ہوں!
میری فطرت میں جو سرکشی تھی وہ آدم سے تھی
تیرا بندہ ہوں، عاجز ہوں، تو رحم کر!
دیکھ ———
ایک مدّت سے آدم کے بیٹے۔
تجھے اور مجھے بھول کر
صرف بے نام، بے سود سی جستجو کے سہارے بڑھے جا رہے ہیں
انھیں تیری رحمت، ترا قہر کچھ بھی ڈراتا نہیں
مجھے آج پہلی دفعہ ڈر لگا ہے
کہیں یہ مجھے اور تجھے قید کر کے
صرف تخلیق کے جرم میں وہ سزا دیں
جس کو لاکھوں برس سے یہ سہتے چلے آ رہے ہیں"

راشد آذر

نئی نسل

ام رات یہی سوچتا رہا ہوں میں
بـڑوں سے یہ تشکیک کے کہوں اک بار
کہ نسلِ نَو کے خیالوں کو منتشر کر کے
تم آنے والے زمانے کے حق میں ہو غدّار
کہ نسلِ تازہ میں تشکیک و انتشار نہ تھا
تمھارے ذہن سے پیدا ہوئے تھے وہ افکار
جو سارے دَورِ کے چہرے پہ تم نے ثبت کیے
تم اپنے خواب سے اَب تک نہیں ہوئے بیدار
حسین دَور کے تم نے جو بُت تراشے تھے
تمھارے ذہن کے حجرے کی تھے وہ پیداوار
حقیقتوں سے کیا ان کو تم نے جب صیقل
تو تاب لا نہ سکے اور ہو گئے مسمار
تمھاری فکر تھی پابستۂ رسومِ کہن
تمھارے ذہن پہ چھائی تھیں مذہبی اقدار
تمھارے سامنے اک جنّتِ تصوّر تھی
اور اب شکستہ تمنّاؤں کا ہے اک انبار

تمھارے سامنے انساں کا اک "تصوّر" تھا
اور اب ہے صرف تصوّر کا بے چراغ مزار
جہانِ تازہ بنانے کا ولولہ نہ رہا
دبی زباں سے بڑھاپے کا کر چکے اقرار
مگر وہ نسلِ جواں جو ہے خالقِ فردا
تمھاری طرح نہیں ہے وہ زیست سے بیزار
وہ نسل آج بھی ہنسنے کے فن سے واقف ہے
اگرچہ وہ بھی تمھاری طرح ہے غم کا شکار
اسے حیات ہے کل سے زیادہ آج عزیز
اگرچہ "آج" ہے "کل" سے زیادہ مرگ آثار
ستارے ٹوٹ گئے آفتاب اُبھر نہ سکا
مگر جوان نظر میں ہے روشنی کا دیار

شہاب جعفری

۲ دو نظمیں

وجدان

رات کتنا نور تھا
بوجھ سے تابندگی کے جھک گیا تھا آسماں
لحظہ لحظہ گر رہی تھیں کہکشاں کی پتیاں
کھل رہی تھیں چاندنی کی کونپلیں
گھل رہی تھیں روشنی کی رفعتوں میں بستیاں
چاند کے سینے سے گویا دن نکل آیا تھا
دھرتی پر اُتر آئی تھیں میرے سورجوں کی بستیاں

سورجوں کی بستیوں میں
ہر طرف سورج ہی سورج
میرے اپنے لوگ
میری آتما کے ان گنت انجانے رُوپ
اس قدر سب آشنا
سارے روپ اک دوسرے میں نور کی مانند یوں تحلیل
جیسے
"میرے اندر میرا من"

میں

کس قدر روشن ہیں اب ارض و سما
نور ہی نور آسماں تا آسماں
میرے اندر ڈوبتے چڑھتے ہوئے سورج کئی
جسم میرا روشنی ہی روشنی
پاؤں میرے نور کے پاتال میں
ہاتھ میرے جگمگاتے آسمانوں کو سنبھالے
سر مرا ——— کاندھوں پہ اک سورج،
کتنا دیدہ خلاؤں سے پرے اُبھرا ہوا
اور زمیں کے روز و شب سے چھوٹ کر
آگہی کی تیز رَو کرنوں پہ میں اُڑتا ہوا
چار جانب اک سہانی تیرگی کی کھوج میں نکلا ہوا

حسن کمال

چاند دن میں

شب کو وہ کیسا مچلتا
مسکراتا جگمگاتا
بادلوں کو انگلیوں سے گدگداتا
ٹہنیوں کی، جوہڑوں کی، سونی سڑکوں کی گڑھوں کی
گود کو کرنوں سے بھرتا
آسماں کے صحن میں دھرتی کے آنگن میں
پہاڑوں کے دریچوں میں
مچلتا دوڑتا تھا
اور دن کو بھی وہ کتنی شان سے
کتنی بے خوفی سے کتنی آن سے
سادے کاغذ کی طرح بے رنگ و روغن
لکڑی کے بے جان ٹکڑوں کی طرح بن روپ رنگت
سامنے آکر کھڑا ہے
چاند بھی کتنا بڑا ہے
آؤ ہم بھی چاند سے جینے کا یہ انداز سیکھیں
ساری دنیا کو بتا دیں
کاروباری مسکراہٹ کی تہوں میں کیا چھپا ہے
باتوں کے رنگین غباروں کے اندر کیا بھرا ہے
اور تب دنیا سے پوچھیں
"اب بتاؤ کون ہم کو چاہتا ہے"؟

حسن کمال

یہودی

اِس طویل و عریض دنیا میں
دستبردِ زمانہ کے ہاتھوں
صرف دو شہر رہ گئے باقی
شہرِ اُمید... اور شہرِ ہراس

درمیاں اِن کے جتنی راہیں تھیں
جتنی پگڈنڈیاں تھیں رستے تھے
جتنے گاؤں تھے جتنے قصبے تھے
جتنے بازار، کھیت، میداں تھے
سب کے سب جل کے گردِ راہ ہوئے

اور اب اک خلا ہے جس میں کہیں
ہم کھڑے ہیں صدائیں دیتے ہیں
کوئی سُنتا نہیں مگر یہ صدا

ہم کبھی اُس طرف امید کی سمت
اور کبھی اِس طرف ہراس کی سمت
کچھ قدم چل کے لوٹ لوٹ آئے
جانتا ہی نہیں کوئی ہم کو

اے تجلّیِ کوہِ طور بتا
جلوہ ذوقِ نظر بنا کہ نہیں
تو نے جو کچھ بتا دیا ہم کو
وہ کسی اور نے سُنا کہ نہیں

یا ترا صرف اتنا مقصد تھا
طور زادوں کو دے کے یہ دولت
یہ گہر ہائے درک اور احساس
چھین لے اِن سے مُسکراہٹ بھی
اُن کی آنکھوں کو بے ضیا کر دے

اے تجلّیِ کوہِ طور بتا
تجھ کو وہ لوگ یاد آتے ہیں
جو خزانوں کو روند کر سرِ عام
سامری کے خدا پہ ہنستے تھے
اور موسیٰ کے حوصلوں پر بھی

طور زادے بتا کدھر جائیں
شہرِ اُمّید اور شہرِ ہراس
طور زادوں کا گھر کہیں بھی نہیں
طور زادوں سے سب ہی منکر ہیں

ساجدہ زیدی

دو نظمیں

"خلا کے دامن میں"

ملاقات کی رات بھی ڈھل چکی ہے۔
امیدِ ملاقات بھی نیم خوابیدہ ہے
آخرِ شب کی بوجھل فضا میں
اک ایسے عجب موڑ پر کارواں وقت کا
رُک گیا ہے
نگاہوں کے ساغر جہاں سرنگوں ہیں۔
جہاں جنبشِ لب کو نیند آ گئی ہے۔
جہاں یادِ رخسار و لب، چشم و گیسو۔
خلاؤں کے دامن میں دم توڑتی ہے
جہاں رات کے دامنِ سُرمگیں سے
دھواں سوزِ ایام کا اُٹھ رہا ہے
جہاں گفتگوؤں کے رقصاں سفینے
بُتوں کی طرح مُنجمد ہو گئے ہیں۔
جہاں حُسنِ احساس اور رنگِ فطرت۔
زمانہ پرستی کی بے حس چٹانوں سے
ٹکرا کے جانے کہاں منتشر ہو گئے ہیں۔
جہاں فکر و تخئیل کے پیکرِ شوخ،
اندھیروں کی یورش میں گم ہو گئے تھے۔
جہاں رُوح کے داغ،
اپنی ہی آتش میں
جل کر بھسم ہو گئے ہیں۔
جہاں شعلہ ہائے نظر،
شعلہ ہائے زباں
شعلہ ہائے بدن
جھوٹی اقدار کی راکھ کے ڈھیر ہیں
چند بے مایہ چنگاریوں کی طرح سسکیاں لے
رہی ہیں
جہاں کشتیٔ شوق و احساس و مستی۔
حوادث کے گرداب میں
خار و خس کی طرح بے نشاں ہو گئی ہے

اک ایسے عجب موڑ پر کارواں وقت کا رک گیا ہے
جہاں زندگی کی تمنا۔
خود اپنی ہی بے چارگی،
بے بسی اور واماندگی پر
کبھی خندہ زن ہے
کبھی گریہ ساماں
کبھی چشم حیراں، کبھی نوحہ خواں ہے۔
جہاں ایک ایسے سکوتِ مکمل میں لپٹا ہوا
ذہن کا سارا ماحول
جذبات کی ساری بوجھل فضا ہے

کہ ہر ایک لمحے کی آوازِ پا چیرتی جا رہی ہے
خموشیٔ کامل
(یعنی تنہائیِ دل کا حاصل)

یہ کیسے عجب موڑ پر کارواں وقت کا رک گیا ہے؟
یہاں توڑ ڈالیں بھی زنجیرِ پا، گر،
تو منزل نہ رستہ
جہاں دوستوں، مونسوں،
دلبروں، ہمدموں،
اور عزیز و اقارب کے دمساز و مانوس چہروں
کے بدلے،
بڑی دور تک اک بھیانک خلا ہے
خلاؤں میں مبہم ہیولے ہیں رقصاں،
ہیولوں کی رفتار پر،
اور تنفّس کی آواز پر،
یوں گماں ہو رہا ہے۔
کہ جیسے کوئی سوزشِ قلب سے کہہ رہا ہو!
"شبِ ہجر کب کس سے کاٹے کٹی ہے؟
امیدِ سحر واہمہ ہے،
فریبِ تخیل ہے۔
اور ان دھندلکوں کے
گہرے، گھنے اور مٹیالے دامن میں
سورج کی بیباک، چنچل شعاعوں کو پانے کی
بے سود سی جستجو ہے۔

"ایک سوال"

اس اژدہامِ نظر سے دور
اپنی آرزو کے مزار پر،
شامِ خامشی کی رفیق بن کر
یہ کس دیئے کی نحیف لو تھرتھرا رہی ہے

وہ صبحِ صد آرزو۔
شبِ انتظار کی بے کلی،
وہ سوزِ دردوں کی شعلۂ جامِ محفل،
وہ ایک بے تاب زندگی کے
ہزار ہا رائگاں سے لمحے،
فضا کی خاموش وسعتوں کو
شکستِ پرواز کا فسانہ سنا رہے ہیں
کہ سوز و سازِ وفا کا عنوانِ تو نہ بنے ہیں

نسرین رضوی

دو نظمیں

ایازِ عصرِ حاضر

بڑے لوگ تھے وہ
جو آسائشوں کے سجیلے دیاروں
چمکتی ہوئی خوش نما عیش گاہوں
کے زینوں پہ چڑھتے اُترتے ہوئے
خاکساروں کی طاعت گزاری سے
خوش ہو کے فرما رہے تھے
بہت پُرکشش خال و خد ہیں تمھارے
بڑے خوش ادا ہو
لبوں پر سدا شوخیاں کھیلتی ہیں
تمھیں بات کرنے
نگاہوں سے دل تک پہنچنے کا
اچھا سلیقہ ملا ہے
یہ خوش پوش آبادیوں کی طلسمی فضاؤں کا منظر
تمھارے تبسم سے کچھ اور بھی دلربا ہو گیا ہے

بڑے لوگ تھے وہ
انھیں کیا خبر ہے
یہاں خاکساروں کو اظہارِ غم کی اجازت نہیں ہے
وگرنہ تبسم کی شادابیوں کا بھرم ٹوٹ جائے!!

بازدید

وہ سورج کی پہلی کرن لے کے
اپنے گھروں سے چلے جب
تو چہرے گلابوں کی صورت کھلے تھے
جبینوں پہ سجدوں کی تابندگی تھی
لباسوں کی شائستگی زیبِ تن تھی
نگاہوں میں شوقِ سفر کی چمک
اور قدموں میں تھی آبشاروں کی مستی
مجھے یوں لگا زندگی
آسمانوں پہ گایا ہوا گیت دہرا رہی ہے

سرِ شام سورج کی ڈھلتی کرن
ساتھ اپنے لئے جب گھروں کو وہ لوٹے
تو چہروں کی لالی
لباسوں کی شائستگی
مر چکی تھی
نگاہوں میں گہری تھکن تھی
تو قدموں سے ٹھکرا رہی تھی
مجھے یوں لگا زندگی
پھر گناہوں کی پاداش میں
آسماں کی حدوں سے نکالی گئی ہے۔

مظفر حنفی

تین نظمیں

اس کی سوچ کا سایہ

مستقبل میری گود میں ہے،
اور ماضی لیٹا کھانس رہا ہے،
یہ ضدی ہے۔
وہ بیمار۔
سوچ رہا ہوں
اُسکو انجکشن لگوا دوں،
یا اس کو جوتے پہنا دوں ؟
دُور اندیشی کہتی ہے :
مستقبل کو ناراض نہ کر،
کل ماضی کے بستر پہ تو لیٹا ہوگا۔
ماضی کہتا ہے :
بیٹا !
میں نے بھی یوں ہی سوچا تھا !!!

بلیک آؤٹ کی تیسری آنکھ

خوف نے بازو بڑھائے،
کھڑکیوں نے ڈر سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں،
روشن دان،
دروازے،
سیہ ملبوس میں لپٹے کھڑے ہیں
روشنی کونے میں دبکی رو رہی ہے۔
روشنی !
جو زندگی اور جہدِ پیہم کی علامت تھی،
مسرت اور خوش آیند مستقبل کی ضامن تھی
ہمارے عہد میں،
موت کی پیغام بر ہے !!

ایک پرانی داستان کے بیچ سے

.... پھر گلِ خورشید بھی مُرجھا گیا،
ہر طرف گہرا اندھیرا چھا گیا۔
اپنے اپنے طور پر،
سب ہی کوشاں تھے،
کسی صورت ذرا سی روشنی ہو۔
جگمگائے،
مفلسوں کے دل، امیروں کے ایاغ
اور یہ سارے چراغ،
ایک دو پل ٹمٹما کر بجھ گئے
لوگ مایوسی کی چادر تان کر سونے لگے۔
خشک سورج کی کلی پر
خامشی کے ساتھ
پیہم،
رات، شبنم کی طرح گرتی رہی !

عتیق حنفی

قبل از وقت

ڈھونڈنے والے
پتیاں، یکساں، گھنیری چھاؤں
پھول، پھل، رس، ذائقہ
سب ابھی سے ڈھونڈتا ہے؟
میں ابھی تو ایک ننھا بیج ہوں۔

دُور رکھ
خورد بینی آنکھ
اپنے نشتر، رگ تراش و دل خراش
کیمیا کے تیز نسخے
دُور رکھ — بے درد مجھ کو مت کرید
ٹھیک ہے جو کچھ مرے بارے میں تو نے سن رکھا ہے
میں گھنا —— اور تناور پیڑ ہوں
روح افزا خوشبوؤں کے چشمے میرے پھول ہیں
میری شاخوں میں وہی شعلے نہاں —
جن کو اولمپس سے لایا تھا کبھی پرومی تھیس[1]

میرے پھل اس ذائقے کی لوٹ ہیں
جو عدن کے سیب میں تھا، جس کو آدم نے چکھا تھا[2]
میں نئی تہذیب کا بے شک تناور پیڑ ہوں
لیکن ابھی تو ایک ننھا بیج ہوں۔
بے درد، مجھ کو مت کرید۔

ڈھونڈ اُپجاؤ زمیں
آب پاشی کے لئے
لا کہیں سے جوئے خوں
مجھ کو بو دے
سینچ —— کیڑوں سے بچا
نیلگوں اونچائیوں میں زینہ زینہ چڑھنے دے
اور پھر سائے کی، پھولوں کی، پھلوں کی
آرزوؤں کی لکیریں
ذہن کی تختی پہ کھینچ

---

[1] ایک یونانی ہیرو جو دیوتاؤں کے یہاں سے آگ چرا کر لایا تھا۔

[2] انجیل کی روایت کے مطابق آدم نے سیب کھایا تھا۔ اسلامی روایت میں سیب کی جگہ گیہوں ہے۔

سردار جعفری

تشنہ لبی

خشکیِ لب ہے نہ اب دیدۂ تر باقی ہے
جانے کیا ہو گئے وہ عہدِ گزشتہ کے رفیق
وقت نے چھین لیا بھوک کا، فاقوں کا غرور

وہ جو اُٹھے تھے زمانے کو بدلنے کے لئے
ایسے بدلے ہیں کہ حیراں ہیں نگاہیں سب کی
زیرِ پا مخملِ آسودہ خرامی کا ہے فرش
زیبِ تن خلعتِ پشمینۂ دریوزہ گری
دل ہے یا تحفۂ خوں گشتۂ آوازِ ضمیر

جن میں تلوار تھی اُن ہاتھوں میں اب ساغر ہیں
جن میں شفقت تھی اُن آنکھوں میں رعونت اب ہے
اور ان سوکھے ہوئے ہونٹوں کو تر رکھتے ہیں
چند خیرات میں بخشی ہوئی مے کے جرعے
چند مانگے ہوئے، چھلکے ہوئے، ٹوٹے ہوئے جام

آج پھر جراُتِ شعلہ طلبی لے اُٹھو
دوستو آرزوئے تشنہ لبی لے اُٹھو

میری لِس
ترجمہ نگار خلیل

ایٹم بم اور انسان

The Image of God

جب ایٹم نے دھرتی کو چھلنی کیا
تو اک چیخ اٹھی:
ہیولے کی مانند جلتی زمیں، سیاہ لکۂ ابر کی طرح حیران
دھواں بن کے افلاک کی سمت لپکی
سحر کی بشارت کا مظہر فرشتہ
بہت غم زدہ اور بہت دل گرفتہ
لرزتے ہوئے گرم اشکِ ندامت
سجل، خوب صورت پروں کو سمیٹے
بڑی کرب آگیں نگاہوں سے دیکھا
فلک بوس لندن کے دیوار و در کو
تو کتنے ہی تاریخ و تہذیب کے باب کھلنے لگے

سسکتا ہوا اک جہاں سامنے تھا
زمیں جل رہی تھی، زمیں جل چکی تھی
فرشتے نے جب اپنے لب وا کیے
تو اک طنزیہ قہقہہ پھوٹ نکلا
فلک گونج اٹھا، فضا تھرتھرائی
تو پھر ———
مرمریں نور کی کچھ صلیبیں اٹھیں
اور بلندی سے پستی کی جانب جھکیں

فرشتے نے ہمزادِ ان نور زادوں سے اتنا کہا:
"وہ دیکھو وہ دھرتی کے بیٹوں کا اک کارنامہ
کہ جو تم یزداں کے تصور کا اک عکس ہیں"

ہند و پاک کا مقبول و معروف ادبی جریدہ "صبا" حیدرآباد

"جشنِ مخدوم" (۱۰ اور ۱۱ دسمبر ۱۹۶۶ء) کے یادگار موقع پر

پیش کرتا ھے

- جس میں مخدوم محی الدین کی ادبی و سماجی زندگی، ان کی منفرد شخصیت اور ہمہ گیر فن کا بھرپور اور مستند جائزہ لیا گیا ہے۔
- مخدوم کی ادبی و علمی خدمات پر مختلف مشاہیر اہلِ قلم کے تاثرات اور پیامات
- مخدوم اپنی شخصیت کے آئینے میں (تصاویر کے ذریعہ)
- مخدوم کے مکمل کلام کا بہترین انتخاب
- مخدوم کا عکسِ تحریر

اس یادگار اور اہم نمبر میں

اُردو کے واحد انقلابی اور مایۂ ناز شاعر مخدوم محی الدین کی بوقلموں شخصیت اور اُن کے فن کے ہر پہلو کو اسیر کرنے کی کوشش کی گئی ہے

مدیر و مرتب : سلیمان اریب

صفحات : (۳۰۰) قیمت : صرف چار روپے

ایجنٹ اور اہلِ ذوق حضرات حسبِ ذیل پتہ سے "مخدوم نمبر" حاصل کر سکتے ہیں :

دفتر ماہ نامہ "صبا"، ۱۷- مجرد گاہ۔ حیدرآباد۔ ۱

حبیب ماموں

مصنّف:۔ انٹون چیخوف

آزاد ترجمہ:۔ زاہدہ زیدی

حبیب ماموں

افراد :-

کلیم الدین احمد	ایک ریٹائرڈ پروفیسر	
دُردانہ فرحت	پروفیسر کی دوسری بیوی	(۲۷ سال)
سلیمہ	پروفیسر کی بیٹی	(۲۵ سال)
فخرالنساء بیگم	پروفیسر کی پہلی بیوی کی ماں	
حبیب	فخرالنساء کا بیٹا	(۴۷ سال)
ڈاکٹر سلمان دُرّانی	پروفیسر کا دور کا رشتہ دار	(۳۷ سال)
محمد شریف	جاگیر پر کام کرتا ہے	

پس منظر :- یوپی کا ایک قصبہ

پروفیسر کی پہلی بیوی کی جاگیر پر ایک بڑا اور شاندار مگر پرانی وضع کا مکان

(فخرالنساء بیگم کے گھر کا صحن۔ پیچھے ایک شاندار برآمدے کے در نظر آ رہے ہیں۔
صحن میں کچھ مونڈھے پڑے ہیں اور ایک جھولنے والی کرسی رکھی ہوئی ہے۔ بیچ
میں میز پر کچھ چائے اور کھانے کا سامان رکھا ہوا ہے۔ حکیمن ایک مونڈھی
پر بیٹھی ہے اور ڈاکٹر سلمان درانی صحن میں ٹہل رہے ہیں۔)

حکیمن :۔ (چائے بناتے ہوئے) صاحبزادے ایک پیالی چائے تو پی لو۔

ڈاکٹر سلمان :۔ (مجبوراً لیتے ہوئے) خیر تمہاری خاطر سہی۔ لیکن اس وقت بالکل خواہش نہیں۔

حکیمن :۔ لو میاں یہ حلوہ میں نے صبح ہی بنایا ہے۔

سلمان :۔ نہیں بوا اس وقت نہیں

حکیمن :۔ اے ذرا دیکھو تو صحت کا کیا حال ہوا جا رہا ہے۔ ہم نے تو خیر سے تمہیں گودوں میں کھلایا ہے۔ اور اب تمہاری باتوں سے یہ لگتا ہے کہ جیسے اچھے خاصے بزرگ ہو۔

سلمان :۔ کیوں بوا کیا میں بہت بدل گیا ہوں۔

حکیمن :۔ اے نہیں تو اور کیا۔ دس برس ادھر جب تمہاری اسپتال میں نوکری لگی تھی تو ماشاء اللہ کتنے تندرست گورے چٹے جوان تھے۔ اور اب کتنے دبلے ہو گئے ہو۔ رنگت بھی کیسی ماند پڑ گئی ہے۔

سلمان :۔ ہاں بوا دس سال میں بہت بدل گیا ہوں۔ میرا کام ہی ایسا سخت ہے۔ صبح سے شام تک ایک چکّر لگا رہتا ہے۔ ان دس سالوں میں شاید ہی کوئی دن خالی ملا ہو۔ اور پھر زندگی بھی تو کچھ خوشگوار نہیں۔ جدھر دیکھو بے ایمانی، حماقت اور بیزاری اور پھر ہر وقت عجیب و غریب لوگوں سے واسطہ۔ شاید میں خود بھی کچھ عجیب ہو گیا ہوں۔ یہی شکر ہے کہ میں اب تک بے وقوف نہیں ہوا لیکن میں اب اپنے جذبات میں وہ تازگی نہیں محسوس کرتا۔ مجھے کسی سے گہری دلچسپی نہیں کسی سے محبت نہیں (کچھ سوچتے ہوئے) سوائے شاید تمہارے۔ میری بھی بچپن میں ایک انّا تھیں۔

حکیمن :۔ اے میاں خدا تمہیں خوش رکھے۔

ڈاکٹر :۔ تمہیں یاد ہوگا۔ پچھلے سال کتنا سخت ٹائیفائڈ پھیلا تھا۔ گاؤں کے ایک ایک گھر میں چار چار بیمار تھے۔ گھروں میں چلنے پھرنے تک کی جگہ نہ تھی۔ پھر گندگی اور غلاظت خدا کی پناہ۔ ایک ہی کوٹھری میں بیمار۔ تندرست، مویشی اور اُن کی گندگی۔ (وقفہ) ایسے حالات میں اگر انسان بے حس ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔ لیکن جب پچھلے سال میرے ایک مریض نے آپریشن ٹیبل پر بے ہوشی کے عالم میں دم توڑ دیا تو میرے سوئے جذبات جاگ اُٹھے اور مجھ سے ضمیر کی ملامت نہ سہی گئی۔ میں سوچنے لگا کیا آنے والی نسلیں ہم لوگوں کو عزت اور محبت سے یاد کریں گی۔

حکیمن :۔ خیر میاں، چاہے لوگ بھول جائیں۔ لیکن خدا تو یاد رکھے گا۔

سلمان :۔ ہاں "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔"

(حبیب کمرے سے داخل ہوتے ہیں۔ وہ کھانے کے بعد سوئے ہیں اور کچھ پریشان سے معلوم ہوتے ہیں)

سلمان :۔ کہیئے خوب سوئے۔

حبیب :۔ (جمائی لیتا ہے) جب سے پروفیسر اور اُن کی بیگم صاحبہ تشریف لائے ہیں۔ اور کام ہی کیا ہے۔ پہلے مجھے ایک منٹ کی فرصت نہ ملتی تھی اور میں اور سلیمہ دن بھر بیلوں کی طرح کام میں جُتے رہتے تھے اور اب صرف سلیمہ کام کرتی ہے اور میں صرف کھاتا ہوں پیتا ہوں اور سوتا ہوں۔

حکیمن :۔ ہاں میاں کیا ٹھکانہ ہے۔ پروفیسر صاحب دن چڑھے اُٹھتے ہیں لیکن نماز کے وقت سے چائے کا پانی چولہے پر چڑھا رہتا ہے کہ نہ معلوم کس وقت حکم دے دیں پہلے تو دن کے گیارہ بجے تک کھانا پکا کر فارغ ہو جاتے تھے اور اب دو تین بجے سے پہلے فرصت نہیں ہوتی۔ رات کو پروفیسر صاحب بارہ ایک بجے تک پڑھتے لکھتے ہیں یا خدا جانے کیا کرتے ہیں اور پھر ایک بجے آوازیں پڑتی ہیں۔ میں پریشان ہو جاتی ہوں کہ یا اللہ کیا ماجرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے پروفیسر صاحب کو چائے کی ضرورت ہے۔ ہاں میاں بڑے لوگوں کی باتیں بھی بڑی ہی ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر :۔ کیا اُن لوگوں کا یہاں زیادہ دن ٹھہرنے کا ارادہ ہے۔

حبیب :۔ (سیٹی بجاتے ہوئے) شاید ایک سو سال تک۔۔۔۔ پروفیسر صاحب یہیں سکونت اختیار کریں گے۔

حکیمن :۔ اب دیکھئے دو گھنٹے سے چائے کا پانی کھول رہا ہے اور وہ لوگ باہر سیر کو گئے ہیں۔

حبیب :۔ (ڈیوڑھی کی طرف دیکھتے ہوئے جہاں سے کچھ آوازیں آرہی ہیں) گھبراؤ نہیں وہ لوگ آرہے ہیں۔

(پروفیسر۔ دُردانہ۔ محمد شریف ڈیوڑھی سے داخل ہوتے ہیں)

پروفیسر :۔ واہ کیا حسین منظر تھا۔

محمد شریف :۔ جی ہاں جناب والا یہاں مناظر بہت خوب صورت ہیں۔

حبیب :۔ چائے تیار ہے۔

پروفیسر :۔ میری چائے اسٹڈی میں بھجوا دی جائے۔ مجھے کچھ کام ختم کرنا ہے (پروفیسر اور دُردانہ دوسرے دروازے سے اندر جاتے ہیں۔ محمد شریف حکیمن کے قریب ایک مونڈھے پر بیٹھ جاتے ہیں)

حبیب :۔ دھوپ کتنی تیز ہے۔ لیکن ہمارے عظیم پروفیسر صاحب اپنا اوور کوٹ زیب تن کئے ہیں۔

ڈاکٹر :۔ ہاں پروفیسر صاحب کو اپنی صحت کا بڑا خیال رہتا ہے۔

حبیب :۔ لیکن فرحت کتنی خوب صورت ہے۔ میں نے تمام عمر میں اتنی حسین عورت نہیں دیکھی۔

حکیمن :۔ کہیئے شریف صاحب کیا حال ہے۔

شریف :۔ تمہاری دُعا ہے۔ زندگی گزر رہی ہے۔ مجھے کسی بات کی شکایت نہیں

ڈاکٹر سلمان :۔ حبیب بھائی کوئی نئی بات سناؤ۔

حبیب :- کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہر بات پرانی ہے۔ اپنی وہی رفتار ہے۔ اماں جان کا تقوی نسواں کا جوش و خروش اسی طرح ہے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے ہیں۔ لیکن کوئی نیا رسالہ ایسا نہیں نکلتا جسے وہ ذوق و شوق سے نہ پڑھتی ہوں۔ اور پھر وہ عالمانہ بحثیں اور نئی زندگی کے خواب!

پروفیسر صاحب دن بھر سٹڈی میں بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اُن تصانیف کا کوئی پڑھنے والا نہ ہو۔ مجھے تو اس کاغذ کی قسمت پر افسوس ہوتا ہے جس پر پروفیسر صاحب اپنے زرّیں خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اِس سے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اپنی سوانح حیات لکھیں۔ کتنی دلچسپ ہوگی وہ کہانی۔ ایک ریٹائرڈ پروفیسر کی جیون کہانی۔ جو اپنی خواہش کے خلاف اپنی پہلی بیوی کی جاگیر پر رہتا ہے۔ کیونکہ وہ خود شہر میں رہنے کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتا اور ہر وقت قسمت کی شکایت کرتا ہے جس کا اُسے کوئی حق نہیں۔ وہ بے حد خوش قسمت ہے۔ (جوش سے) ذرا سوچو ایک معمولی مولوی کا لڑکا جو یونیورسٹی کی ڈگری لے کر لیکچرری حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اور پھر جناب پروفیسر ہو جائیں اور علامہ کہلانے لگیں اور صاحب ثروت ڈپٹی کلکٹر کے داماد بن جائیں..... اور یہ پروفیسر صاحب پچھلے پچیس سال سے دوسروں کے خیالات کو دہرا رہے ہیں۔ رُوح اور مادّے کے تعلق۔ منطقی موشگافیوں اور مابعد الطبیعاتی بحثوں میں اُلجھے ہوئے ہیں۔ پچیس سال سے وہ جن مسائل پر لکھتے اور لیکچر دیتے رہے ہیں۔ ذہین لوگ اُنھیں اچھی طرح سمجھے ہیں اور بے وقوف لوگ اُن کی پروا نہیں کرتے اور پھر اُس پر یہ حسنِ ظن اور علمیت کے یہ دعوے۔ اور اب جب جناب ریٹائرڈ ہوئے ہیں تو کوئی آپ کا نام لیوا نہیں۔ کوئی آپ کے وجود سے بھی واقف نہیں۔ اِس سے صرف ایک ہی نتیجہ نکل سکتا ہے وہ یہ۔ پچیس سال سے وہ جس اعزاز پر قبضہ کئے تھے اس کے وہ بالکل مستحق نہ تھے لیکن اس کے باوجود اِس قبضے میں اِس انداز سے رہتے ہیں گویا خدائے تعالیٰ کی گدی آپ ہی نے سنبھال رکھی ہے۔

ڈاکٹر :- حبیب بھائی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم پروفیسر سے حسد کرتے ہو۔

حبیب :- ہاں میں اُس سے حسد کرتا ہوں۔ اُس میں ایسی کون سی بات ہے کہ ہر شخص اُس سے متاثر ہو۔ یہاں تک کہ سب حسین عورتیں بھی۔ میری بہن نے جو ایک حسین اور نیک دوشیزہ تھی اور جس سے شادی کرنے کے سینکڑوں خواستگار تھے۔ اس کی بیوی بننا پسند کیا۔ اور تمام عمر اس سے فرشتوں کی سی ایک ادمعصوم محبت کرتی رہی۔ میری ماں اب تک اس کے نام کی عاشق ہیں اور اس کی قابلیت سے بے انتہا متاثر ہے۔ اس کی دوسری بیوی نے جو ذہین بھی ہے اور بے انتہا حسین بھی۔ اُس وقت اُس سے شادی کی جب وہ کافی بڈھا ہو چکا تھا اور اپنی آزادی اور اپنی دلکش شخصیت کو اس پر قربان کر دیا۔ آخر کیوں؟ کس لئے؟

ڈاکٹر سلمان :- پروفیسر کی بیوی کیا بہت وفا شعار ہے۔

حبیب :- مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہ وفادار ہے۔

سلمان :- افسوس کے ساتھ کیوں؟

حبیب :- کیونکہ یہ وفاداری شروع سے آخر تک بے معنی ہے۔ ایک ایسے شوہر سے بے وفائی کرنا، جس سے محبت کرنا ممکن ہی نہ ہو، یہ تو آپ کے نزدیک اخلاق سے گری ہوئی بات ہے اور اس کی خاطر اپنی جوانی، زندہ دلی اور جذبات کا گلا گھونٹنا اخلاق کی معراج!!

محمد شریف :۔ حبیب میاں تمہاری یہ باتیں مجھے پسند نہیں۔ جو انسان اپنی بیوی یا شوہر سے بے وفائی کرے، وہ اپنے ملک سے غداری کر سکتا ہے۔

حبیب :۔ بکواس، سراسر بکواس۔

محمد شریف :۔ خیر میاں، میں نئے زمانے کا آدمی نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔

(سلیمہ اور دردانہ داخل ہوتی ہیں کچھ دیر بعد فخر النساء بیگم داخل ہوتی ہیں ہاتھ میں ایک کتاب ہے جسے وہ پڑھ رہی ہیں۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ چائے ان کے سامنے رکھ دی جاتی ہے۔ جسے وہ بغیر دیکھے پیتی ہیں اور پڑھتی رہتی ہیں۔)

سلیمہ :۔ (حکیمن سے) نانی بوا دروازے پر کچھ کاشتکار کھڑے ہیں۔ ذرا جا کر معلوم کرو کیا چاہتے ہیں۔ میں سب کو چائے دوں گی (حکیمن باہر جاتی ہیں) دُردانہ جھولنے والی کرسی پر بیٹھ کر چائے پیتی ہے۔

ڈاکٹر سلمان :۔ (دُردانہ سے) میں اس وقت آپ کے شوہر کو دیکھنے آیا تھا۔ آپ نے لکھا تھا کہ وہ بہت بیمار ہیں۔ اُنھیں کی شکایت ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ بالکل ٹھیک ہیں۔

دُردانہ :۔ جی ہاں! کل رات اُن کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ٹانگوں کے درد کی شکایت کرتے رہے۔ اس وقت تو ٹھیک ہیں۔

سلمان :۔ اور میں اسّی یا بیس میل کی مسافت طے کر کے یہاں آیا ہوں۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ آج رات یہیں ٹھہر جاؤں۔

سلیمہ :۔ یہ تو بہت ہی خوشی کی بات ہے۔ ورنہ آپ بھلا کب یہاں رات گزارتے ہیں۔ (چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے) چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔

محمد شریف :۔ جی ہاں! چائے کا ٹمپریچر بہت گر گیا ہے۔

دُردانہ :۔ رفیق صاحب، کوئی بات نہیں ہم ٹھنڈی ہی چائے پی لیں گے۔

محمد شریف :۔ معاف کیجئے گا میرا نام رفیق نہیں محمد شریف ہے۔ میں آپ کی جاگیر ہی پر کام کرتا ہوں اور روز شام کو یہاں ہوتا ہوں۔

سلیمہ :۔ یہ ہمارے بڑے اچھے ہمسائے ہیں۔ ان کی مدد کے بغیر ہمارا کام نہیں چل سکتا تھا اور چائے دوں شریف چچا۔؟

فخر النساء :۔ ارے میں تو بھول ہی گئی تھی۔

سلیمہ :۔ کیا نانی اماں۔

فخر النساء :۔ واقعی میرا حافظہ بالکل خراب ہوتا جا رہا ہے۔ ارے بھئی سید وقار الدین نے اپنا نیا رسالہ بھیجا ہے۔

سلمان :۔ کیا بہت دلچسپ ہے۔

فخر النساء :۔ ہاں! لیکن یہ عجیب بات ہے کہ پانچ سال پہلے اُنھوں نے تعلیم نسواں کے مسئلے پر جن خیالات کا اظہار کیا تھا۔

سب کو غلط ثابت کر دیا ہے۔ یہ واقعی بہت پریشان کن بات ہے۔

جبیب :۔ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں اماں۔ آپ اپنی چائے پیجئے۔

فخرالنساء :۔ مگر میں اس اہم مسئلے پر تبادلۂ خیالات کرنا چاہتی ہوں۔

جبیب :۔ پچھلے پچاس سال سے ہم لوگ صرف تبادلۂ خیالات کرتے رہتے ہیں۔ اس کی کوئی انتہا بھی ہونی چاہیئے۔

فخرالنساء :۔ معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ تم میری باتوں میں بالکل دلچسپی نہیں لیتے۔ معاف کرنا جبیب۔ پچھلے دو سال میں تم بالکل بدل گئے ہو۔ تم تو ایک اُصول پرست آدمی تھے۔ تمہاری شخصیت کتنی پُرکشش تھی۔

جبیب :۔ بجا فرماتی ہیں۔ میری شخصیت کتنی پُرکشش تھی۔ جس نے کبھی کسی کو متاثر نہیں کیا۔ اس سے زیادہ گہری چوٹ آپ نہیں کر سکتی تھیں اماں۔ اس وقت میں ۴۳ سال کا ہوں۔ دو سال پہلے تک..... میں بھی جان بوجھ کر اپنے کو دھوکہ دیتا رہا۔ تاکہ تلخ حقائق کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ جیسا کہ آپ اب تک کرتی ہیں۔ لیکن اب اس کوفت اور غصّے میں میری راتیں آنکھوں میں کٹ جاتی ہیں کہ میں نے زندگی کا لُطف اُٹھائے بغیر اپنی عمر کا سب سے قیمتی حصّہ ضائع کر دیا اور اب وقت ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

سلیمہ :۔ جبیب ماموں ایسی باتیں نہ کیجئے۔

فخرالنساء :۔ تم اپنے پُرانے اُصولوں پر کیوں الزام رکھتے ہو۔ قصور تمہارا ہے، تمہیں کوئی اہم اور بامعنی کام کرنا چاہیئے تھا۔

جبیب :۔ اہم اور بامعنی کام۔ لیکن ہر شخص آپ کے لائق پروفیسر کی طرح تصانیف کا انبار تو نہیں لگا سکتا۔

فخرالنساء :۔ (سختی سے) اس سے تمہارا کیا مطلب ہے۔

سلیمہ :۔ نانی اماں۔ جبیب ماموں خدا کے لئے کوئی اور بات کیجئے۔

جبیب :۔ اچھا میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ مجھے معاف کیجئے۔

(وقفہ)

دُردانہ :۔ موسم کتنا خوشگوار ہے۔

جبیب :۔ ہاں ایسے موسم میں خودکشی بھی خوشگوار ہوگی

(باہر سے حکیمن کی آواز آتی ہے وہ مُرغیوں کو بُلا رہی ہیں۔)

سلیمہ :۔ (دروازے کے پاس جاکر) نانی بوا کاشتکار کیوں آئے تھے۔

حکیمن :۔ (باہر سے) وہی پُرانی بات، اسی بنجر زمین کا جھگڑا ہے (باہر سے بانسری کی آواز آتی ہے۔ سب لوگ خاموشی سے سُنتے ہیں

ایک مزدور داخل ہوتا ہے۔

مزدور :۔ ڈاکٹر صاحب آپ کو بُلانے ہسپتال سے آدمی آیا ہے۔

ڈاکٹر :۔ اچھا..... تو مجھے جانا ہی ہوگا۔ لعنت ہے ایسی زندگی پر (مزدور واپس جاتا ہے)

سلیمہ :۔ یہ واقعی بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ اچھا آپ ہسپتال ہو آیئے۔ لیکن رات کا کھانا یہیں کھایئے گا۔

ڈاکٹر :- نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے.... آغا حشر کے ڈرامے میں ایک کردار ہے' جس کی مونچھیں بہت لمبی ہیں اور دماغ میں عقل بہت کم ہے۔ میں وہی کردار ہوں۔

(وقفہ)

ڈاکٹر :- اچھا اب میں آپ سب سے اجازت چاہتا ہوں۔ (دُردانہ سے) اگر آپ کبھی سلیمہ کے ساتھ میرے گھر آنے کی تکلیف کریں تو مجھے بہت خوشی ہوگی..... میری ایک چھوٹی سی جاگیر ہے۔ یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر اس میں نے ایک موڈل باغ اور پودوں کی نرسری بھی بنائی ہے۔ اس کے پاس ہی سرکاری جنگل ہے۔ جس کی دیکھ بھال زیادہ تر میں ہی کرتا ہوں۔

دُردانہ :- ہاں! میں نے سُنا ہے آپ کو جنگلات سے بہت دلچسپی ہے۔ مشغلہ تو اچھا ہے۔ لیکن یہ آپ کے اصل پیشے میں حارج تو نہیں ہوتا۔ آخر آپ ایک ڈاکٹر ہیں نا۔

ڈاکٹر :- خدا ہی جانتا ہے۔ میرا اصل پیشہ کیا ہے۔

دُردانہ :- کیا یہ دلچسپ مشغلہ ہے۔

ڈاکٹر :- ہاں بہت۔

حبیب :- (طنز سے) اس میں کیا شک ہے۔

دُردانہ :- (ڈاکٹر سے) مجھے بھی تعجب ہوتا ہے۔ آخر آپ ایک جوان آدمی ہیں۔ کیا واقعی یہ ایک دلچسپ مشغلہ ہو سکتا ہے۔ درختوں کا ایک لامتناہی سلسلہ اور بس۔

سلیمہ :- نہیں یہ کام واقعی دلچسپ ہے سلیمان صاحب کو اس سلسلے میں ایک تمغہ بھی مل چکا ہے۔ اگر آپ اِن سے اس مسئلے پر تفصیلی بات چیت کریں تو مجھے یقین ہے کہ آپ ان سے اتفاق کریں گی۔ وہ کہتے ہیں کہ جنگلات سے زندگی کی خوب صورتی میں اضافہ ہوتا ہے اور وہ انسان میں احساسِ حسن پیدا کرتے ہیں اور جذبات کو پاکیزہ بناتے ہیں۔ جن ملکوں میں جنگلات کی حفاظت کی جاتی ہے وہاں کے لوگ خوبصورت اور حساس ہوتے ہیں اُن کی گفتگو شستہ ہوتی ہے اور طور طریق مہذب۔ اُن کا فلسفۂ حیات رجائی ہوتا ہے اور عورتوں کی طرف اُن کا رویہ نہایت شائستہ ہوتا ہے۔

حبیب :- (ہنستے ہوئے) بہت خوب۔ بہت خوب۔ کس قدر خوبصورت خیالات ہیں۔ لیکن کس قدر ناممکن۔ اس لئے عزیزمن مجھے اس بات کی اجازت دو کہ لکڑیاں جلاتا رہوں اور مکان بنانے میں لکڑی کا استعمال کرتا رہوں۔

ڈاکٹر :- آپ لکڑی کی بجائے کوئلہ بھی جلا سکتے ہیں۔ اور پھر کم سے کم لکڑی کو ضائع تو نہ کیجئے۔ اس وقت ہمارے ملک کے جنگلات کسمپرسی کے عالم میں دم توڑ رہے ہیں اور جو لوگ اس حسن کو تباہ کر دیں۔ جسے وہ تخلیق نہیں کر سکتے وہ میرے خیال میں مہذب کہلانے کے مستحق نہیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے بیگم فاروقی۔ انسان کو عقل اس لئے دی گئی ہے کہ وہ قدرتی وسائل کا صحیح استعمال کرے۔ لیکن اب تک وہ صرف تخریب کی طرف مائل رہا ہے (حبیب سے) تم طنزیہ انداز سے مسکرا رہے ہو تم سمجھتے ہو جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ مجذوب کی بڑ ہے۔ لیکن میں جب کبھی اس جنگل کے پاس سے گزرتا ہوں' جسے میں نے کسی سے بچایا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے مستقبل

کو جیت لیا ہے۔ جب میں ان درختوں کے سر سرانے کی آواز سنتا ہوں جنھیں میں نے اپنے ہاتھ سے بویا تھا تو میرا دل خوشی سے سرشار ہو جاتا ہے اور میں سوچنے لگتا ہوں کہ اگر ایک ہزار سال بعد ایک حسین اور مسرت کی زندگی کی تعمیر ہوئی تو اس میں میرا بھی ایک حصہ ہوگا۔ ایک حقیر اور نامعلوم سا حصہ ہی لیکن ہوگا ضرور . . . . جب میں ان ننھے پودوں کو سر اٹھاتے دیکھتا ہوں تو میں ــــ (مزدور پر نظر پڑتی ہے، جو دوبارہ داخل ہوا ہے۔) (گھڑی دیکھتا ہے) اب مجھے جانا ہی ہوگا۔ معاف کیجئے گا۔ ممکن ہے آپ اسے میری انتہا پسندی سمجھیں..... (دروازے کی طرف جاتا ہے)

سلیمہ :۔ اب آپ کب یہاں آئیں گے۔

سلمان :۔ کہہ نہیں سکتا۔

(سلمان اور سلیمہ باتیں کرتے ہوئے باہر جاتے ہیں)

(محمد شریف اور فخر النساء اپنی جگہ بیٹھے رہتے ہیں۔ حبیب اور دُردانہ ٹہلتے ہوئے اسٹیج کے سامنے کی طرف آتے ہیں)

دُردانہ :۔ آج تم پھر وہی بے سروپا باتیں کرنے لگے۔ اماں جان کے سامنے تصانیف کے انبار کا ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ اور آج کھانے پر تم کلیم صاحب سے بے وجہ اُلجھ پڑے۔

حبیب :۔ میں اس سے نفرت کرتا ہوں۔

دُردانہ :۔ تمہیں اُن سے نفرت کرنے کا کوئی حق نہیں۔ آخر اُن میں ایسی کون سی بُرائی ہے۔ تم خود اُن سے کس بات میں بہتر ہو۔

حبیب :۔ کیوں اپنے کو دھوکا دیتی ہو فرحت۔ مجھے تمہاری حالت پر افسوس ہوتا ہے۔

دُردانہ :۔ ہاں تمہیں میری حالت پر افسوس ہوتا ہے ہر شخص میرے شوہر کو الزام دیتا ہے اور کو میرے ساتھ ہمدردی ہے لیکن تمہاری یہ ہمدردی مجھے تباہ کر کے چھوڑے گی۔ جیسا کہ ابھی ڈاکٹر سلمان کہہ رہے تھے کہ اگر لوگ اندھا دھند جنگلات کاٹتے رہے تو فطرت کا تمام حسن تباہ ہو جائے گا جس کی تخلیق انسان نہیں کر سکتا۔ اسی طرح تم انسانوں کو بھی تباہ کرتے رہتے ہو اور بہت جلد تم لوگوں کی عنایت سے وفاداری محبت اور قربانی کی اعلیٰ قدریں دنیا سے ناپید ہو جائیں گی۔ جیسا کہ ڈاکٹر نے کہا تمہاری رگ رگ میں تخریب کا جذبہ سرایت کر گیا ہے۔ تم نہ جنگلات کو معاف کر سکتے ہو، نہ عورتوں کو نہ ایک دوسرے کو۔

حبیب :۔ میں اس قسم کا فلسفہ پسند نہیں کرتا۔

دُردانہ :۔ ڈاکٹر کا چہرہ کچھ سُتا ہوا ہے۔ لیکن اُس کے چہرے میں کتنی گہرائی ہے۔ سلیمہ یقیناً ڈاکٹر کو پسند کرتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ میری اب تک اُن سے اچھی طرح بات نہیں ہوئی۔ میں اپنی جھجک سے مجبور ہو جاتی ہوں۔ حبیب مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دونوں میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اسی لئے تو ہم ایک دوسرے کو اتنی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں..... میری طرف اس طرح نہ دیکھو۔

حبیب :۔ اور کس طرح دیکھوں۔ کیا تم میری زندگی نہیں ہو۔ کیا میری خوشی تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم میری محبت کا جواب نہیں دو گی۔ لیکن کم سے کم اپنی طرف دیکھنے تو دو۔

دُردانہ :۔ خدا کے لئے چپ رہو لوگ سُن لیں گے۔ (اندر جاتی ہے)

حبیب :۔ (اُس کے پیچھے جاتے ہوئے) آج مجھے اپنی محبت کا اظہار کرنے دو۔ یہ بھی میرے لئے باعثِ تسکین ہے۔
دُردانہ :۔ لیکن میرے لئے انتہائی تکلیف دہ۔

(دونوں جاتے ہیں)

(پردہ)

دوسرا ایکٹ

(کھانے کا کمرہ رات کا وقت ہے۔ باہر سے پہرے دار کی آوازیں آرہی ہیں۔ پروفیسر کلیم احمد کھڑکی کے پاس ایک آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ دُردانہ پاس ہی دوسری کرسی پر بیٹھی ہے۔
دونوں اونگھ رہے ہیں۔

کلیم احمد :۔ (ہوشیار ہوتے ہوئے) کون سلیمہ؟
دُردانہ :۔ نہیں میں ہوں۔
کلیم :۔ اچھا تم ہو دُردانہ۔ یہ درد ناقابلِ برداشت ہے۔
دُردانہ :۔ آپ کا کمبل گر گیا ہے (اُٹھا کر ٹانگوں پر ڈالتی ہے) میں کھڑکی بند کئے دیتی ہوں۔
کلیم :۔ نہیں رہنے دو۔ میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ ابھی چند لمحے کے لئے میری آنکھ لگ گئی تھی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ایک ٹانگ غائب ہو گئی ہے اور درد کی شدّت سے میری آنکھ کھل گئی...... کیا وقت ہو گا۔
دُردانہ :۔ بارہ بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔

(وقفہ)

کلیم :۔ تم صبح میری لائبریری میں ابنِ خلدون کی تیسری جلد تلاش کرنا میرا خیال ہے وہ ہمارے پاس ضرور ہے.... لیکن اُف میرا سانس گھٹا جا رہا ہے۔
دُردانہ :۔ آپ بہت تھکے ہوئے ہیں۔ دو رات سے آپ کو نیند نہیں آئی۔
کلیم :۔ کہتے ہیں، حکیم بو علی سینا کو قلب کی شکایت تھی۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مجھے بھی بہت جلد ہونے والی ہے۔ خدا لعنت کرے اس ضعیفی پر۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی ہے اور غالباً تم لوگوں کو بھی۔
دُردانہ :۔ اب اِس انداز سے اپنے بڑھاپے کا ذکر کیوں کرتے ہیں۔ گویا اُس کے لئے ہم سب قابلِ الزام ہیں۔
کلیم :۔ اِس لئے کہ تم مجھ سے یقیناً نفرت کرنے لگی ہو۔

(دُردانہ ناگواری سے کچھ دُور جاتی ہے)

کلیم :۔ میں خوب سمجھتا ہوں تم جوان ہو خوبصورت ہو۔ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں۔ ایک زندہ لاش ایں تم سمجھتی ہو میں ان باتوں کو خود

نہیں جانتا لیکن بس کچھ دن اور انتظار کرو۔ میں تم سب کو بہت جلد آزاد کر دوں گا۔ میں خود زندہ رہنا نہیں چاہتا۔

دُردانہ :۔ اُف میرا سر پھٹا جا رہا ہے۔

کلیم :۔ ہر شخص پریشان ہے۔ معلوم ہوتا ہے بس میں ہی آرام سے ہوں اور زندگی کا لطف اُٹھا رہا ہوں۔

دردانہ :۔ خدا کے لئے ختم کیجئے۔ میں تنگ آ چکی ہوں۔

کلیم :۔ ہاں ہاں! تم بھی مجھ سے تنگ آ چکی ہو۔

دُردانہ :۔ (روتی ہوئی آواز میں) آخر آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

کلیم :۔ کچھ نہیں۔

دُردانہ :۔ تو پھر خاموش رہیئے۔

کلیم :۔ عجیب بات ہے۔ جب حبیب یا فخرالنساء بیگم بات کرتے ہیں تو ہر شخص غور سے سنتا ہے۔ یہاں تک کہ سکینہ کی اُلٹی سیدھی باتیں بھی تم لوگ سُن لیتے ہو۔ لیکن جہاں میں نے بات شروع کی ہر شخص بیزار نظر آنے لگتا ہے۔ میری آواز تک سے تم لوگوں کو نفرت ہے میں مانتا ہوں کہ میں دوسروں سے خدمت لیتا ہوں۔ میں خود غرض ہوں۔ لیکن کیا مجھے اس عمر میں اس کا بھی حق نہیں کہ ایک پُر آرام زندگی گزارنے کا حق نہیں۔ بولو۔ کیا میں ان مراعات کا مستحق نہیں ہوں۔

دُردانہ :۔ آپ کے حقوق سے کسی کو انکار نہیں (ہوا سے کھڑکی کھڑکھڑا رہی ہے) ہوا تیز ہو گئی ہے۔ میں کھڑکی بند کئے دیتی ہوں۔ بارش ہونے والی ہے ..... آپ کے حقوق سے کسی کو انکار نہیں۔

کلیم :۔ میں نے تو اپنی تمام زندگی علم کی خدمت کے لئے وقف کر دی تھی۔ کہاں وہ یونیورسٹی کی تعلیمی فضا اور کہاں یہ جاہلوں کی بستی۔ جہاں ہر وقت بے وقوف لوگوں کی فضول باتیں سُننی پڑتی ہیں۔ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں کامیابی چاہتا ہوں شہرت چاہتا ہوں۔ اور یہاں میں ایک قیدی سے زیادہ نہیں۔ اِس سے زیادہ تکلیف دہ بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ میں دوسروں کو کامیابی حاصل کرتے دیکھوں اور خود کچھ نہ کر سکوں۔ میں اب اور زیادہ برداشت نہیں کر سکتا اور تم لوگ میری ضعیفی برداشت نہیں کر سکتے۔

دُردانہ :۔ کچھ دن اور صبر کیجئے۔ ۵۔۶ سال میں میں خود بوڑھی ہو جاؤں گی۔

(سلیمہ داخل ہوتی ہے)

سلیمہ :۔ ابا جان آپ نے ڈاکٹر کو بلوایا تھا اور اب سلمان صاحب آئے ہیں تو آپ نے اُن سے ملنے سے انکار کر دیا۔ یہ بات نامناسب ہے۔ ہم نے انھیں خواہ مخواہ تکلیف دی۔

کلیم :۔ مجھے تمہارے سلمان دُرّانی کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے خیال میں ڈاکٹر کہلانے کا مستحق ہی نہیں ہے۔

سلیمہ :۔ لیکن اب یہ توقع کیسے کر سکتے ہیں کہ آپ سے درد کے علاج کے لئے دُنیا کے بہترین ڈاکٹر حاضر ہو جائیں۔

کلیم :۔ اس نیم حکیم سے تو میں بات ہی نہیں کرنا چاہتا۔

سلیمہ :۔ بہرحال آپ کا خود اراده ہے کچھ ... اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔

کلیم :- کیا وقت ہے۔
دُردانہ :- ساڑھے بارہ بج چکے ہیں۔
کلیم :- میرا دم گھٹا جارہا ہے۔ سلیمہ ذرا مجھے وہ دوا اُٹھا دینا۔
(سلیمہ دوا اُٹھاکر دیتی ہے)

کلیم :- مجھے اس دوا کی ضرورت نہیں۔ کوئی میری بات نہیں سمجھتا سب بیکار ہیں۔
(حبیب ہاتھ میں شمع لئے داخل ہوتا ہے۔ وہ شب خوابی کا لباس پہنے ہے)

حبیب :- بہت سخت طوفان آنے والا ہے۔ سلیمہ اور فرحت اب تم جاکر سو رہو۔ میں تمہاری جگہ لے لوں گا۔
کلیم :- نہیں نہیں خدا کے لئے مجھے اس کے ساتھ تنہا نہ چھوڑو۔ یہ اپنی باتوں سے میرا خاتمہ کر دے گا۔
حبیب :- لیکن آخر ان لوگوں کو بھی تو آرام کی ضرورت ہے۔ دو راتوں سے یہ نہیں سوئیں۔
کلیم :- یہ لوگ بڑی خوشی سے جا سکتی ہیں۔ لیکن مہربانی سے تم بھی چلے جاؤ۔ پُرانی دوستی ہی کی خاطر سہی۔ اس وقت مجھ سے بات کرو
حبیب :- پُرانی دوستی کی خاطر .... پُرانی .....
سلیمہ :- حبیب ماموں خدا کے لئے اس وقت رہنے دیجئے۔
کلیم :- (بیوی سے) جانِ من مجھے اس کے ساتھ تنہا نہ چھوڑو۔ یہ ضرور مجھے ختم کر دے گا۔
حبیب :- یہ تو کسی ناٹک کا ایک مضحکہ خیز سین معلوم ہوتا ہے۔
(حکیمن بوا ہاتھ میں شمع لئے داخل ہوتی ہیں)

سلیمہ :- نانی بوا۔ اب تم جاکر سو رہو۔ بہت رات ہوگئی ہے۔
حکیمن :- ابھی تو چائے کے برتن بھی نہیں اُٹھے۔ کیسے سو سکتی ہوں۔
کلیم :- ہر شخص تھکا ہوا ہے۔ ہر شخص جاگ رہا ہے۔ بس ایک میں ہی زندگی کا لُطف اُٹھا رہا ہوں۔
حکیمن :- کیوں کیا بات ہے کلیم میاں۔ کیا بہت تکلیف ہے۔ میری بھی ٹانگوں میں اب بہت درد رہنے لگا ہے۔ تمہاری تو یہ پُرانی شکایت ہے سلیمہ کی ماں، جمیلہ بیوی کتنی پریشان ہو جاتی تھیں۔ ان کی راتوں کی نیند اُڑ جاتی تھی۔ خدا اُنھیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے تمہیں کتنا چاہتی تھیں۔ بڑے بھی بچّوں کی طرح ہو جاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ہر ایک اُن پر ترس کھائے ..... لیکن بڈھوں کے ساتھ کون ہمدردی کرتا ہے۔ چلو بس اب چل کے سو رہو۔ میں ابھی تمہارے لئے چائے بنا کر لاتی ہوں اور تمہارے لئے گرم پانی کی بوتل لے آتی ہوں۔ اور پھر اپنے اللہ سے تمہاری صحت کے لئے دُعا کروں گی۔
کلیم :- (متاثر ہو کر) چلو حکیمن۔
حکیمن :- کتنا درد ہوتا ہے میری ٹانگوں میں .... (وہ اور سلیمہ پروفیسر کو سہارا دے کر اُٹھاتی ہیں) جمیلہ بیوی کتنی پریشان ہو جاتی تھیں تم تو ذرا سی تھیں سلیمہ بیٹی۔ ان باتوں کو کہاں سمجھتی تھیں .... اچھا میاں اب چل کے سو رہو۔

(تینوں جاتے ہیں)

دُردانہ :- میں تو اب بالکل تھک چکی ہوں۔ یہاں سے جانے کی بھی ہمت نہیں۔

حبیب :- تم اپنے شوہر سے تھک چکی ہو اور میں اپنے آپ سے۔

دُردانہ :- اس گھر میں ہر ایک کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ تمہاری اماں کو سوائے اپنی کتابوں اور پروفیسر صاحب کے دنیا میں ہر چیز سے نفرت ہے۔ کلیم صاحب اب مجھ پر بھی بھروسہ نہیں کرتے۔ سلیمہ اپنے باپ کے ساتھ چڑچڑاپن کرتی ہے اور آج دو ہفتے ہو گئے اُس نے مجھ سے بھی بات نہیں کی۔ تم میرے شوہر سے نفرت کرتے ہو اور اپنی ماں کے لئے کھلم کھلا حقارت کا اظہار کرتے ہو۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ چیخ چیخ کر رو دوں۔ اس گھر میں ہر ایک کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔

حبیب :- اچھا اب فلسفہ رہنے دو۔

دُردانہ :- حبیب تم ذہین اور پڑھے لکھے ہو۔ تمہیں یہ محسوس کرنا چاہیئے کہ دنیا آگ اور بارود سے نہیں بلکہ نفرت، حسد، اور آپس کے لڑائی جھگڑوں سے تباہ ہو رہی ہے۔ ہمیں تو دنیا میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ بجائے نفرت کی اس آگ کو بھڑکانے کے۔

حبیب :- مجھے خود اپنے اندر ہم آہنگی پیدا کرنے کا موقع تو دو (اس کی طرف پُر معنی انداز سے دیکھتا ہے۔)

دُردانہ :- میں یہ باتیں پسند نہیں کرتی۔

حبیب :- چند منٹ میں بارش رک جائے گی اور فطرت کی ہر شے پر تازگی اور نکھار آ جائے گا۔ صرف مجھ میں اس طوفان کے بعد بھی تازگی نہیں آئے گی۔ یہ سوچ کر میرا دم گھٹا جاتا ہے کہ میری تمام زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ میرا کوئی ماضی نہیں، کیونکہ وہ فضول باتوں کی نذر ہوا۔ اور میرا حال بے معنی ہے۔ میری زندگی اور میری محبّت کی کوئی منزلِ مقصود نہیں۔ تم سے میری محبت یوں ضائع جاتی ہے جیسے روشنی کی ایک کرن کوئیں میں گر کر ضائع ہو جاتی ہے۔

دُردانہ :- جب تم اپنی محبّت کا اظہار کرتے ہو تو میری سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں۔ (جانے کے لئے اُٹھتی ہے)

حبیب :- (اس کا راستہ روکتے ہوئے) اور پھر مجھے یہ احساس ہر وقت ستاتا ہے کہ اس گھر میں ایک اور انسان کی زندگی ضائع ہو رہی ہے..... تمہاری زندگی فرحت۔ تم کس بات کا انتظار کر رہی ہو۔ کون سا منحوس فلسفۂ زندگی تمہیں روک رہا ہے۔ کچھ سوچ سمجھو۔

دردانہ :- (اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے) حبیب صاحب آپ پئے ہوئے ہیں۔

حبیب :- ہو سکتا ہے ۔ ہو سکتا ہے۔

دُردانہ :- ڈاکٹر کہاں ہے۔

حبیب :- ساتھ والے کمرے میں، آج رات وہ یہیں ٹھہرے گا۔

دردانہ :- تو آپ لوگوں نے آج پھر شراب پی۔ آخر کیوں؟

حبیب :- اپنے کو بھول جانے کے لئے۔ زندگی نہیں تو فریبِ زندگی ہی سہی۔ کیا مجھے اس کا حق بھی نہیں جانِ من (اس کا ہاتھ پکڑتا ہے)

دردانہ :۔ (ہاتھ کھینچتے ہوئے) میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔ (ناگواری سے اُٹھ کر جاتی ہے)

حبیب :۔ (اکیلے میں) وہ چلی گئی۔ دس سال پہلے میں اُسے اپنی بہن کے ہاں دیکھا کرتا تھا۔ وہ ۱۷ سال کی تھی۔ اس وقت مجھے اس سے محبت کیوں نہیں ہو گئی۔ میں نے اُس سے شادی کی درخواست کیوں نہیں کی۔ اس وقت یہ کتنا آسان تھا۔ آج وہ میری بیوی ہوتی اور پھر شاید یہ طوفان ہم دونوں کو جگا دیتا۔ وہ ڈر کر مجھ سے قریب تر ہو جاتی اور میں اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیتا... کتنا حسین ہے یہ خیال۔ لیکن یہ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میرا ذہن اتنا پراگندہ کیوں ہے۔ میں کیوں اتنا بڈھا ہو گیا ہوں۔ وہ میری بات کیوں نہیں سمجھتی۔ اُس کی روائتی وفاشعاری اُس کے حسین مگر سطحی اخلاقی تصورات میرے لئے کتنے تکلیف دہ ہیں...... میرے ساتھ زندگی نے دھوکا کیا۔ میں پروفیسر کو ایک عظیم شخصیت سمجھتا رہا۔ اُس کے آرام و آسائش کی خاطر میں اور سلیمہ جان توڑ کر محنت کرتے رہے۔ ہم نے ہر ممکن کوشش کی کہ جائداد سے زیادہ سے زیادہ روپیہ حاصل کیا جا سکے۔ ہم کنجوسوں کی طرح ایک ایک پائی بچاتے رہے۔ تاکہ اُسے ہزاروں روپے بھیجے جا سکیں۔ میں اُس سے کس قدر متاثر تھا۔ مجھے اس کی علمیت پر کتنا ناز تھا۔ وہ جو کچھ بھی لکھتا میں اُسے ایک عظیم دماغ کا نتیجۂ فکر سمجھتا تھا۔ اور اب..... اُف خدایا...... اب جب وہ ریٹائر ہو کر یہاں آیا ہے تو اُس کی تمام زندگی میرے سامنے آئینے کی طرح روشن ہے۔ اب میں خوب جانتا ہوں کہ اُس کی تصانیف میں سے ایک ورق بھی زندہ نہیں رہے گا۔ اس کی شخصیت گمنام ہے اور اُس کی شہرت پانی کے بلبلے کی طرح بیٹھ چکی ہے۔ میں نے دھوکہ کھایا اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ میں نے (کتنا) بڑا دھوکہ کھایا

(ڈاکٹر سلیمان داخل ہوتا ہے۔ وہ شب خوابی کے لباس میں ہے اور کچھ پئے ہوئے)

سلمان :۔ کیا تم تنہا ہو حبیب بھائی ...... طوفان سے میری آنکھ کھل گئی۔

اے موجِ حوادث اُن کو بھی دو چار تھپیڑے ہلکے سے
کچھ لوگ ابھی تک ساحل سے طوفاں کا نظارہ کرتے ہیں

کیا وقت ہوگا؟

حبیب :۔ مجھے نہیں معلوم۔

سلمان :۔ میرا خیال ہے میں نے دُردانہ کی آواز سنی تھی۔

حبیب :۔ ہاں وہ ابھی یہیں تھی۔

سلمان :۔ غیر معمولی حسین عورت ہے (میز پر دواؤں کو دیکھتے ہوئے) خدا کی پناہ کہاں کہاں سے دوائیں آئی ہیں۔ لندن ماسکو دی آنا۔ برلن۔

...... تمہارا کیا خیال ہے۔ پروفیسر واقعی بیمار ہے یا صرف بنتا ہے۔

حبیب :۔ واقعی بیمار ہے۔

سلمان :۔ تم بہت اُداس معلوم ہوتے ہو.... کیا پروفیسر کی بیماری کی وجہ سے اُداس ہو۔

حبیب :۔ خدا کے لئے مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔

سلمان:۔ تو پھر کیا تمھیں پروفیسر کی بیوی سے محبت ہوگئی ہے۔

حبیب:۔ وہ میری دوست ہے۔

سلمان:۔ ابھی سے۔

حبیب:۔ کیا مطلب ؟

سلمان:۔ بھائی صاحب دوستی کی منزل تو بہت بعد میں آتی ہے یعنی جب ایک عورت سے طبیعت سیر ہو چکی ہو۔

حبیب:۔ کس قدر غیر شائستہ فلسفہ ہے۔

سلمان:۔ ہاں۔ میں شاید خود بھی غیر شائستہ ہوگیا ہوں اور پھر میں اس وقت کچھ زیادہ پی گیا ہوں۔ ایسی حالت میں میں ذرا اکھڑ ہو جاتا ہوں۔ لیکن مجھ میں ہمت بھی پیدا ہوگئی ہے۔ میں بڑے سے بڑا آپریشن کر سکتا ہوں۔ معاف کرنا میں ذرا زیادہ پی گیا ہوں۔ (لڑکھڑاتا ہے) یارو مجھے معاف کرو، میں نشے میں ہوں۔

کیوں حبیب بھائی ۔ ایک جام اور . . . . . کیا خیال ہے (سلیمہ پر نظر پڑتی ہے گڑبڑا کر) معاف کرنا حبیب بھائی میں ابھی آتا ہوں (تیزی سے اپنے کمرے کے اندر جاتا ہے۔)

سلیمہ:۔ (اندر آتے ہوئے) اچھا حبیب ماموں تو آپ لوگوں نے آج پھر شراب پی۔ کم سے کم اپنی عمر ہی کا خیال کیجیے۔

حبیب:۔ اِس کا عمر سے کیا تعلق۔ جن لوگوں کی اپنی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ اُنھیں خوابوں کی دنیا ہی میں رہنا پڑتا ہے۔ کچھ نہ ہونے سے تو یہی بہتر ہے۔

سلیمہ:۔ کھیت سے اناج آیا پڑا ہے اور کسی وقت بھی بارش ہو سکتی ہے۔ آپ آج کل ہر کام کی طرف سے لاپرواہی برت رہے ہیں مجھے اکیلے ہر بات کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ میں بالکل تھک چکی ہوں . . . . . (اس کی طرف دیکھتی ہے گھبرا کر) ماموں جان آپ کی آنکھوں میں آنسو کیوں ؟

حبیب:۔ آنسو. . . . کچھ نہیں تمہارا خیال ہے۔ اس وقت مجھے تمہاری صورت دیکھ کر تمہاری ماں یاد آگئیں. . . . (اس کی پیشانی کو بوسہ دیتا ہے) میری عزیز ترین بچی. . . . میری پیاری بہن. . . . اب وہ کہاں ہے۔ کاش اُسے معلوم ہو سکتا۔

سلیمہ:۔ کیا ماموں جان ۔ کیا معلوم ہوتا۔

حبیب:۔ کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ اچھا اب میں جاتا ہوں۔ (باہر جاتا ہے) (سلیمہ کچھ دیر پریشان اِدھر اُدھر دیکھتی ہے۔ سلمان اپنے کمرے سے باہر آتا ہے۔ سلیمہ کو دیکھ کر جھجکتا ہے۔)

سلیمہ:۔ مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔

سلمان:۔ . . . . . . ہاں . . . . . کہو۔

سلیمہ:۔ اگر آپ کو شراب سے نفرت نہیں تو شوق سے پیجیے۔ لیکن مہربانی سے میرے ماموں کو نہ پلایئے. . . . اُن کی صحت برباد ہو رہی ہے۔

سلمان:۔ (پشیمانی سے) میں شرمندہ ہوں۔ اب ہم کبھی شراب نہیں پئیں گے۔ مجھے اب فوراً چلا جانا چاہیئے۔ میں ابھی گاڑی تیار کرنے کے لئے کہتا ہوں۔

سلیمہ:۔ اس وقت بارش ہو رہی ہے۔ صبح ہونے تک انتظار کیجئے۔

سلمان:۔ طوفان صرف ہمارے قریب سے گزر رہا ہے۔ بس چند چھینٹے پڑیں گے۔ ہاں مہربانی سے اب مجھے اپنے آبا کی بیماری کے سلسلے میں کبھی نہ بلانا۔ وہ میری کوئی بات نہیں سنتے۔ میں کہتا ہوں انھیں اعصابی درد ہے۔ وہ کہتے ہیں گٹھیا ہے۔ میں نے انھیں لیٹنے کی ہدایت کی ہے۔ اور وہ بیٹھنے پہ مصر ہیں اور اب تو وہ مجھ سے بات کرنے کے بھی روادار نہیں... یہاں پانی ہے۔

(سلیمہ صراحی میں سے پانی انڈیل کر دیتی ہے)

سلمان:۔ تمہارے باپ اپنے معالج کو بالکل پریشان کر دیتے ہیں اس وقت یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں صاف صاف اپنے دل کی بات کہہ سکتا ہوں۔ میرا تو اس فضا میں دم گھٹتا ہے۔ تمہارے باپ ہر وقت اپنی بیماری کا رونا روتے ہیں۔ تمہاری نانی چوبیس گھنٹے حقوق نسواں کے مسائل میں غرق رہتی ہیں اور تمہارے حبیب ماموں اپنی مایوسی میں اور تمہاری سوتیلی ماں.....

سلیمہ:۔ میری سوتیلی ماں میں کیا بات ہے۔

سلمان:۔ انسان کی ہر چیز خوبصورت ہونی چاہیئے۔ روح، جسم، خیالات اور احساسات۔ دُردانہ بہت حسین ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ کرتی کیا ہے۔ سوائے کھانے پینے، سونے اور ہم سب کو اپنے حسن سے مسحور کرنے کی..... لیکن میں شاید ضرورت سے زیادہ درشت ہو گیا ہوں۔ شاید میں بھی تمہارے حبیب، ماموں کی طرح زندگی سے غیر مطمئن ہوں۔ اس لئے ہم ہر وقت قسمت کی شکایت کرتے ہیں۔

سلمان:۔ مجھے زندگی سے محبت ہے۔ لیکن یہ ہماری روزمرہ کی زندگی ناقابلِ برداشت ہے۔ اور اپنی ذاتی زندگی میں بھی مجھے کوئی قابلِ قدر بات نظر نہیں آتی ــ اگر کسی جنگل سے گزرتے ہوئے دُور بہت دُور کوئی روشنی کی کرن نظر آ جائے تو تھکن اور اندھیرے کا احساس باقی نہیں رہتا۔ لیکن مجھے اپنی زندگی میں ایسی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ مجھے کسی چیز کا انتظار نہیں۔ مجھے کسی سے محبت نہیں۔

سلیمہ:۔ کسی سے بھی نہیں۔

سلمان:۔ ہاں..... تمہاری بوا سے مجھے ایک قسم کا اُنس ضرور ہے۔ اُنھیں دیکھ کر بعض پرانی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں لیکن بس۔ غریب اور اَن پڑھ لوگ سب غیر دلچسپ ہیں۔ اُن کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کی نشوونما ہی نہیں ہوتی۔ اور پڑھے لکھے لوگ... اُن کے ساتھ گزارا کرنا اور بھی مشکل ہے۔ ان کے خیالات اور جذبات سطحی ہوتے ہیں اور اُنھیں اپنے سوا کسی چیز سے دلچسپی نہیں جو لوگ اوروں سے زیادہ ذہین ہیں۔ وہ انتہائی پرخود غلط اور شکی ہیں۔ اُنھیں انسانوں سے بحیثیت انسان کے کوئی دلچسپی نہیں وہ ہر شخص پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالتے ہی فیصلہ سُنا دیتے ہیں ـــ "یہ شخص ذہنی مریض ہے" وہ شخص صرف الفاظ سے کھیلتا ہے اور جب اُن کی سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک آدمی پر کیا لیبل لگائیں۔ مثال کے طور پر مجھ پر تو وہ کہہ دیتے ہیں "یہ آدمی عجیب ہے"

ہے۔" میں گوشت نہیں کھاتا ہوں اس لئے میں عجیب ہوں مجھے جنگلات سے عشق ہے اس لئے میں عجیب ہوں...... ان لمحوں کو دُور کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے (بوتل کی طرف ہاتھ بڑھاتا ہے)

سلیمہ:۔ نہیں نہیں خدا کے لئے۔

سلمان:۔ کیوں؟

سلیمہ:۔ اس لئے کہ آپ عام انسانوں سے بہت مختلف ہیں۔ آپ اُن سے کہیں زیادہ حساس ہیں۔ آپ کی شخصیت میں ایک وقار ہے ایک دلکشی ہے۔ آپ کو عام آدمیوں کی طرح شراب پینا یا تاش کھیلنا زیب نہیں دیتا۔ آپ اکثر اس بات پر افسوس کرتے ہیں کہ لوگ تخلیق کے بجائے فطرت کے حسن کو برباد کرتے رہتے ہیں۔ آپ کیوں اپنے آپ کو برباد کر رہے ہیں.... کچھ تو خیال کیجیے۔

سلمان:۔ (اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے) میں اب کبھی شراب نہیں پیوں گا۔

سلیمہ:۔ وعدہ کیجئے۔

سلمان:۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ (سلیمہ آہستہ سے اُس کا ہاتھ دباتی ہے)

سلمان:۔ (گھڑی دیکھتے ہوئے) ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ میرا وقت گذر چکا ہے۔ میں ضرورت سے زیادہ کام کرتا رہا ہوں۔ شاید اسی لئے میں اکھڑ اور بدمزاج ہو گیا ہوں اور میرے جذبات کے سوتے خشک ہو گئے ہیں۔ میں اب شاید کسی سے محبت نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اب بھی حسن کا پرستار ہوں۔ مثلاً دُردانہ فرحت اگر چاہے تو مجھے ایک دن میں دیوانہ بنا سکتی ہے۔ (اپنے ہاتھوں سے منہ چھپا لیتا ہے)

سلیمہ:۔ کیا بات ہے سلمان صاحب!

سلمان:۔ کچھ نہیں — پچھلے سال میرا ایک مریض آپریشن ٹیبل پر بیہوشی کے عالم میں مر گیا۔

سلیمہ:۔ آپ اسے بھول جائیے۔ (وقفہ) اچھا یہ بتائیے کہ اگر میری کوئی دوست ہوتی جو آپ سے والہانہ محبت کرتی تو آپ کیا کرتے۔

سلمان:۔ میں اُسے بتا دیتا کہ میں اُس سے محبت نہیں کر سکتا...... اچھا اب مجھے جانا چاہیئے۔ صبح تک اسپتال پہنچنا ہے۔ اچھا خدا حافظ۔

(سلیمہ سے ہاتھ ملا کر جاتا ہے)

سلیمہ:۔ (اکیلے میں) اُس نے مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ پھر میرا دل اتنا مسرور کیوں ہے (ہنستی ہے) میں نے کہا آپ کی شخصیت میں وقار ہے اور دلکشی ہے..... یہ کچھ نامناسب بات تو نہیں تھی۔ اس کی آواز کتنی خوبصورت ہے۔ اس کی لہریں میں اب بھی محسوس کر سکتی ہوں — لیکن جب میں نے اُس سے دوست والی بات کی تو وہ کچھ نہیں سمجھا۔ (ہاتھ ملتی ہے) اُف خدا میں حسین کیوں نہیں ہوں میں اتنی بدصورت کیوں ہوں! اس دن جب میں میلاد میں گئی تھی تو میں نے خود ایک عورت کو اپنی ساتھن سے کہتے سُنا یہ بڑی نیک اور سمجھدار لڑکی ہے۔ لیکن بیچاری کی صورت کتنی معمولی ہے۔

(دُردانہ داخل ہوتی ہے)

دُردانہ :۔ طوفان ختم ہوگیا۔ ہوا کتنی خوشگوار ہے۔ ڈاکٹر کہاں ہے۔

سلیمہ :۔ چلے گئے۔

دُردانہ :۔ سلیمہ۔

سلیمہ :۔ ہاں

دُردانہ :۔ تم کب تک مجھ سے خفا رہوگی۔ ہم نے ایک دوسرے کو کوئی دُکھ نہیں پہنچایا۔ پھر ہم کیوں دشمنوں کی طرح رہیں۔ میری طرف سے اپنا دل صاف کرلو۔

سلیمہ :۔ میں خود یہی چاہتی تھی۔ (دونوں گلے ملتے ہیں) ..... کیا آبا جان سو گئے

دُردانہ :۔ نہیں صوفے پر بیٹھے ہیں۔ اب ہفتوں وہ مجھ سے کھل کر بات نہیں کرتے۔ سلیمہ تم ہی مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔

سلیمہ :۔ میں مدت سے یہی چاہتی تھی۔ لیکن ہمت نہیں پڑی۔ (روتی ہے)

دُردانہ :۔ تم روکیوں رہی ہو۔

سلیمہ :۔ کچھ نہیں کوئی بات نہیں۔

دُردانہ :۔ (اُسے گلے لگاتی ہے) پیاری سلیمہ (آنسو پونچھتی ہے) مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں کیوں رو رہی ہوں ..... تم شاید سمجھتی ہو کہ میں نے تمہارے باپ سے کسی لالچ میں شادی کی۔ لیکن میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ مجھے اِن سے محبت ہوگئی تھی۔ میں اُن کی علمیت اور شہرت سے متاثر ہوگئی تھی۔ یہ شاید سچّی محبت نہیں تھی۔ لیکن میں نے یہی سمجھا ..... لیکن تم نے ہمیشہ مجھ پر شک کیا۔ اِس کا مجھے بہت رنج ہے۔

سلیمہ :۔ پُرانی باتیں بھول جاؤ

(وقفہ)

سلیمہ :۔ اچھا سچ سچ ایک بات بتاؤ ــــ کیا تم خوش ہو۔

دُردانہ :۔ نہیں۔

سلیمہ :۔ مجھے معلوم تھا۔ ایک بات اور ــ کیا تمھارا یہ دل نہیں چاہتا کہ تمہارے شوہر جوان ہوتے۔

دُردانہ :۔ سلیمہ تم تو بالکل بچّی ہو۔ ظاہر ہے کہ میرا دل یہی چاہتا ہے (ہنستی ہے) اچھا کوئی اور بات پوچھو۔

سلیمہ :۔ کیا تم ڈاکٹر کو پسند کرتی ہو۔

دُردانہ :۔ ہاں بہت۔

سلیمہ :۔ اُس کی آواز اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اس کا چہرہ میں اب بھی اپنے سامنے تصوّر کرسکتی ہوں ..... معاف کرنا میری باتیں بہت مضحکہ خیز تو نہیں۔

دُردانہ :۔ نہیں! کیا بات ہے؟

سلیمہ :- ڈاکٹر ہوشیار ہے۔ وہ بیماروں کا علاج بھی کر سکتا ہے اور درخت بھی لگا سکتا ہے۔

دُردانہ :- یہ درخت لگانے یا علاج کرنے کا سوال نہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ ڈاکٹر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ اُس کی نظر وسیع اور ہمت بلند ہے۔ وہ درخت لگاتا ہے اور سوچتا ہے کہ آنے والی نسلوں کو ان سے کیا فائدہ ہوگا۔ وہ انسانیت کے سُنہرے مستقبل کے خواب دیکھتا ہے۔ ایسے لوگ دُنیا میں خال خال ہوتے ہیں اور ہمیں اُن کی عزت کرنی چاہیئے اور اُن سے محبت کرنی چاہیئے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ کبھی کبھی شراب پیتا ہے۔ لیکن ہمارے ملک کے کتنے ذہین لوگ اس قسم کے عیبوں سے پاک ہوں گے۔ اُس کی زندگی پر غور کرو۔ ہر طرف گندگی، غربت اور جہالت۔ ان حالات میں ایک حساس آدمی کے لئے ذہنی توازن قائم رکھنا مشکل ہے (سلیمہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) سلیمہ مجھے اُمید ہے کہ تم اپنی زندگی کو کامیاب بنا سکوگی۔ (اُٹھتی ہے) میری زندگی تو یوں ہی گزری جا رہی ہے۔ میں ایک بہت ہی غیر معمولی اور غیر اہم ہستی ہوں۔ پڑھنے لکھنے۔ موسیقی۔ رومانس، ہر چیز میں ایک معمولی عورت ثابت ہوئی۔ واقعی سلیمہ۔ میں بڑی بدنصیب ہوں (سلیمہ جو اپنے خیالات میں گم ہے مسکراتی ہے) تم کیوں ہنس رہی ہو۔

سلیمہ :- (اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے) آج میں کتنی خوش ہوں — کتنی

دُردانہ :- آج بہت دن بعد نجانے کیوں میرا دل ستار بجانے کو چاہ رہا ہے۔

سلیمہ :- (اُسے گلے لگاتے ہوئے) ہاں ہاں کوئی نرم اور پُرکیف دُھن چھیڑو۔

دردانہ :- ہاں ضرور — لیکن اپنے ابا سے پوچھ لو۔ بیماری میں اُنھیں ستار کی آواز سے کوفت ہوتی ہے۔

سلیمہ :- اچھا جاتی ہوں۔ (جاتی ہے)

دُردانہ :- مدت سے میں نے ستار نہیں بجایا۔ آج میں ستار بجاؤں گی — اور روؤں گی — ایک پاگل لڑکی کی طرح (باغ سے پہرے دار کے چلم صاف کرنے کی آواز آتی ہے — (دُردانہ کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے) کیا تم ہو وزیرا پہرے دار کی آواز — جی ہاں بیگم صاحب۔

دُردانہ :- کھٹکا نہ کرو۔ صاحب کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

پہرے دار :- بس بیگم صاحب۔ اب میں جا ہی رہا ہوں (کتے کو آواز دیتا ہے) موتی — موتی — موتی — چلو اب گھر چلتے ہیں۔

(وقفہ)

سلیمہ :- (واپس آکر) ہم ستار نہیں بجا سکتے۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا ایکٹ

(گھر کا بڑا ڈرائنگ روم — دن کا وقت ہے)

(حبیب اور سلیمہ بیٹھے ہیں۔ دُردانہ اپنے خیالات میں گم کھڑکی کے پاس کھڑی ہے)

حبیب :۔ پون بجا ہے ۔ ہمارے عظیم پروفیسر نے فرمایا تھا کہ ہم سب لوگ ایک بجے تک اس ہال میں جمع ہوجائیں۔ معلوم ہوتا ہے وہ کوئی معرکتہ الآرا اعلان کرنے والے ہیں۔

دُردانہ :۔ کسی کاروباری سلسلے میں بُلایا ہوگا۔

حبیب :۔ اُسے کاروبار سے کیا واسطہ۔ وہ تو صرف نکواس لکھتا ہے۔ قسمت کی شکایت کرتا ہے اور دوسروں سے حسد کرتا ہے۔ اس کے علاوہ اُس کا کیا کام ہے۔

سلیمہ :۔ (زمینی انداز میں) ماموں جان۔

حبیب :۔ بہت اچھا معافی چاہتا ہوں، (دُردانہ کی طرف اشارہ کرتا ہے) آپ سے ملئے آپ کا واحد شغل ہے بیکاری ۔ یہ بھی خدا کی شان کا ایک کرشمہ ہیں۔

دُردانہ :۔ اور تم دن بھر صرف بھنبھناتے ہو ۔ تھکتے بھی نہیں (قابلِ رحم آواز میں) خدایا میں زندگی سے بور ہوچکی ہوں ۔ میں کیا کروں ؟

سلیمہ :۔ کام تو دنیا میں بہت ہیں اگر کوئی کرنا چاہے۔

دردانہ :۔ مثلاً۔

سلیمہ :۔ مثلاً یہ کہ تم جاگیر کے انتظام میں ہاتھ بٹا سکتی ہو۔ بچوں کو پڑھا سکتی ہو۔ بیماروں کی دیکھ بھال کرسکتی ہو۔ میں اور حبیب ماموں گھر اور جائداد کا سب کام خود ہی کرتے ہیں۔

دردانہ :۔ میں تو سمجھتی ہوں۔ صرف مثالی ناولوں کی ہیروئن ہی کسانوں کے بچوں کو پڑھاتی اور بیماروں کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ زندگی میں تو میں نے یہ کہیں نہیں دیکھا اور پھر یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے کہ میں یکایک کسانوں کے بچوں کو پڑھانا شروع کردوں

سلیمہ :۔ تم کرکے تو دیکھو، کچھ دن میں تم خود ہی عادی ہوجاؤ گی۔ (گلے لگاتی ہے) دیکھو تمہاری کاہلی دوسروں میں بھی سرایت کرتی جارہی ہے (ہنستی ہے) حبیب ماموں کو دیکھو تمہارے آنے سے پہلے یہ دن رات کام کرتے تھے۔ اور اب صرف سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہتے ہیں۔ ڈاکٹر سلمان بھی روز یہاں آتے ہیں۔ اور اپنے مریضوں اور جنگلات کی طرف سے لاپرواہی کرتے ہیں۔

حبیب :۔ تم اُداس کیوں ہو جانِ من۔ تمہاری رگوں میں تو کسی جل پری کا خون گردش کررہا ہے۔ تم کیوں کسی سمندری شہزادے سے عشق نہیں کرتیں۔ کیوں اپنی جرأت رندانہ سے ہم سب کو حیرت میں نہیں ڈالتیں۔

دُردانہ :۔ خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو ...... یہ باتیں ناقابلِ برداشت ہیں۔ (جانا چاہتی ہے)

حبیب :۔ (اُس کا راستہ روکتے ہوئے) اچھا اچھا معاف کرو۔ میں صلح کا خواستگار ہوں۔

دُردانہ :۔ تمہاری باتیں تو فرشتوں کے لئے بھی صبر آزما ہوں گی۔

حبیب :۔ اِس صلح کی خوشی میں میں انہیں گلاب کے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے صبح سے تمہارے لئے توڑ کر رکھے ہیں ۔ خزاں کے پھول ۔ حسین اور اُداس پھول ...... (باہر جاتا ہے)

سلیمہ :۔ خزاں کے پھول حسین اور اداس پھول بار دونوں کھڑکی سے باہر دیکھتی ہے)

دُردانہ :۔ ابھی سے ہوا سائیں سائیں کر رہی ہے۔ فضا کتنی اداس ہے۔ یہاں جاڑے میں کیسے گزارا ہوگا..... ڈاکٹر کہاں ہے۔

سلیمہ :۔ حبیب ماموں کے کمرے میں کچھ لکھ رہے ہیں۔ اچھا ہوا ماموں چلے گئے۔ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔

دُردانہ :۔ کس سلسلے میں۔

سلیمہ :۔ کس سلسلے میں (اپنا سر دُردانہ کے کندھے پر رکھ دیتی ہے)

دُردانہ :۔ (اُس کے بالوں میں اُنگلی پھیرتے ہوئے) کہو سلیمہ کیا بات ہے۔

سلیمہ :۔ میں خوبصورت نہیں ہوں۔

دُردانہ :۔ نہیں تمہارے بال خوبصورت ہیں۔

سلیمہ :۔ (مڑکر اپنی شکل آئینے میں دیکھتی ہے) ہاں جب کوئی عورت بدصورت ہوتی ہے تو لوگ یہی کہتے ہیں تمہارے بال خوبصورت ہیں۔ تمہاری آنکھیں خوبصورت ہیں۔ میں ان سے پودے پھول سے محبت کرتی ہوں۔ نہ تنہائی میں ان کا تصور میرے ساتھ رہتا ہے۔ میری آنکھیں ہر وقت دروازے پر لگی رہتی ہیں۔ مجھے ہر لمحہ ان کا انتظار رہتا ہے اور وہ ہر روز یہاں آتے ہیں لیکن وہ میری طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ سوچو مجھ پر کیا گزرتی ہوگی۔ اب میرے لئے زندگی میں کوئی اُمید نہیں۔ کوئی امید نہیں خدایا مجھے برداشت کی قوت دے..... میری خودداری پامال ہوچکی ہے۔ میں اکثر اُن کے پاس جا کر بات کرنے لگتی ہوں۔ اُن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتی ہوں۔ مجھے اپنے جذبات پر قابو نہیں رہا۔ کل میں نے حبیب ماموں کے سامنے اپنی محبت کا اعتراف کرلیا۔ نوکروں تک کو معلوم ہوگیا ہے کہ میں اُنھیں چاہتی ہوں۔

دُردانہ :۔ اور ڈاکٹر کو۔

سلیمہ :۔ اُنھیں میری موجودگی کا احساس بھی نہیں۔

دُردانہ :۔ وہ عجیب آدمی ہیں۔ اچھا میں نے ایک بات سوچی ہے..... میں اُن سے اس سلسلے میں بات کروں گی کسی مناسب طریقے سے۔ آخر کب تک تم اس طرح رہ سکتی ہو۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں۔

(سلیمہ اقرار میں سر ہلاتی ہے) بس یہ ٹھیک ہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ میں اُنھیں معلوم نہیں ہونے دوں گی کہ میں تمہاری مرضی سے بات کر رہی ہوں۔ بس ہمیں تو یہ معلوم کرنا ہے کہ ڈاکٹر کے تمہارے لئے کیا جذبات ہیں اور اگر انھیں تم سے محبت نہیں تو پھر یہاں اُن کا آنا جانا ٹھیک نہیں..... ٹھیک ہے نا۔ شاید اس طرح تم آسانی سے برداشت کرسکو۔ دیکھو اُن سے جا کر کہو کہ میں وہ چارٹ دیکھنا چاہتی ہوں جو اُنہوں نے مجھے دکھانے کو کہا تھا۔

سلیمہ :۔ اچھا..... (جانے لگتی ہے) مگر نہیں اندھیرے ہی میں رہنا بہتر ہے۔ اُمید کا ایک تار تو باقی ہے..... وہ بھی ٹوٹ جائے گا۔

دُردانہ ۔ کیا کہہ رہی ہو۔

سلیمہ :۔ کچھ نہیں۔ (چلی جاتی ہے)

دُردانہ :۔ (اکیلے میں) ڈاکٹر کو سلیمہ سے محبت نہیں یہ بات تو بالکل صاف ہے۔ لیکن وہ اس سے شادی تو کر سکتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ سلیمہ خوبصورت نہیں ہے۔ لیکن وہ ذہین ہے۔ ہمدرد ہے۔ اُس کی محبت کتنی معصوم ہے۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے (وقفہ) میں اُس کے جذبات کو خوب سمجھتی ہوں۔ اس غیر دلچسپ اور بے رنگ فضا میں جہاں لوگوں میں کوئی اُمنگ نہیں۔ زندگی کا کوئی سلیقہ نہیں۔ جب ڈاکٹر آتا ہے تو زندگی اور دلچسپی کی ایک لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ سب لوگوں سے کتنا مختلف ہے۔ دلچسپ اور خوبصورت ـــ میں خود شاید اُسے پسند کرنے لگی ہوں، جب وہ کمرے میں نہیں ہوتا تو ہر چیز کچھ پھیکی پھیکی سی معلوم ہوتی ہے..... میں خوب جانتی ہوں کہ وہ روز یہاں کیوں آتا ہے۔ کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ سلیمہ سے ہر بات کا اعتراف کرلوں اور رُو رُو کر اُس سے معافی مانگوں۔

ڈاکٹر :۔ (آتے ہوئے) آپ میرے چارٹ دیکھنا چاہتی تھیں۔ لیکن شاید آپ کو ان میں دلچسپی نہ آئے۔

دُردانہ :۔ نہیں ضرور آئے گی۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کبھی دیہات میں نہیں رہی۔ لیکن میں نے گاؤں اور جنگلات کے متعلق کافی کتابیں پڑھی ہیں

ڈاکٹر :۔ (چارٹ کھولتے ہوئے) یہ میرے لئے نُزہت کا مشغلہ بھی ہے اور روزمرّہ کی بے رنگ زندگی سے فرار بھی..... اب یہ دیکھئے یہ ہمارے ضلع کا نقشہ ہے۔ جیسا وہ پچاس سال پہلے تھا۔ جہاں جنگل تھے وہاں میں نے گہرا سبز رنگ بھرا ہے۔ یہ جو آپ سُرخ رنگ کا جال دیکھ رہی ہیں۔ یہاں شکار کثرت سے ملتا تھا۔ اس جھیل میں بطخیں اور راج ہنس وغیرہ رہتے تھے۔ اس حصّے میں ہر قسم کی چڑیاں پائی جاتی تھیں اور یہ ۲۵ سال ادھر کا نقشہ ہے۔ کافی درخت کٹ چکے ہیں۔ شکار کم ہو گیا ہے۔ اور چڑیاں بہت کم ہو گئی ہیں۔ اور یہ ضلع کا موجودہ نقشہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ اور کچھ یہ بھی نہیں کہ ان جنگلات کے کٹنے سے صنعتی ترقی ہوئی ہو اور غریبی اور بے روزگاری میں کمی ہوئی ہو۔ نہیں۔ اس کی وجہ صرف لوگوں کی جہالت اور بے حسی ہے۔ فطرت کا اتنا حسن برباد ہو چکا ہے اور اس کی جگہ کسی قابلِ قدر چیز کی تخلیق نہیں کی گئی۔

دُردانہ :۔ معاف کیجئے۔ میں اِن مسائل کو ذرا کم ہی سمجھتی ہوں۔

سلمان :۔ جی نہیں۔ اس میں سمجھنے کی بات نہیں۔ اصل میں آپ دلچسپی ہی نہیں لے رہی ہیں۔

دُردانہ :۔ اصل بات یہ ہے کہ میرا دماغ کسی اور اُلجھن میں پھنسا ہوا ہے۔ مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔

سلمان :۔ مجھ سے۔

دُردانہ :۔ جی ہاں! آپ سے۔ اگر آپ وعدہ کریں کہ یہ بات کسی کو نہیں بتائیں گے۔

سلمان :۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ لیکن بات کیا ہے۔

دردانہ :۔ اس بات کا تعلق سلیمہ سے ہے۔ کیا آپ اُسے پسند کرتے ہیں۔

سلمان :۔ میں اُس کی عزّت کرتا ہوں۔

دردانہ :۔ کیا آپ اُسے ایک عورت کی حیثیت سے پسند کرتے ہیں۔

سلمان :۔ (ایک مختصر وقفہ کے بعد) نہیں۔

دُردانہ :- لیکن کیا آپ نے یہ بھی محسوس نہیں کیا کہ وہ آپ کو کتنا چاہتی ہے۔ اور اُس کے دل پر کیا گزر رہی ہے۔ خدا کے لئے یہ بات سمجھنے کی کوشش کیجئے اور یہاں آنا جانا بند کر دیجئے۔

سلمان :- میرا وقت گزر چکا ہے (اُٹھتے ہوئے) اچھا اب آپ سے کب ملاقات ......

دُردانہ :- (نظر انداز کرتے ہوئے) خدا کے لئے اِن باتوں کا کسی سے ذکر نہ کیجئے گا۔ شاید مجھے خود یہ بات نہ کرنا چاہیئے تھی..... میرا دل دھڑک رہا ہے۔

سلمان :- صرف ایک بات پوچھنا چاہتا ہوں...... آخر تم نے مجھ سے یہ سوال کیوں کیا۔ (آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر) واقعی تم بہت ہوشیار ہو۔

دُردانہ :- میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔

سلمان :- تم خوب سمجھتی ہو۔ تم جانتی ہو کہ میں ایک مہینے سے اپنا ہر کام چھوڑ کر صرف تمہیں دیکھنے کے لئے یہاں آتا ہوں۔ اور تم اس بات سے اپنے دل میں خوش ہو۔ اسے حسین شکاری چڑیا تیرا شکار پھنس چکا ہے۔ اب کس بات کا انتظار ہے۔

دُردانہ :- آپ کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔

سلمان :- شرماتی کیوں ہو (دُردانہ باہر جانا چاہتی ہے) سلمان اُس کا راستہ روک لیتا ہے) ہاں جلدی بتا دو کب اور کہاں تم سے ملاقات ہوگی..... اُف تم کس قدر حسین ہو۔ اِس حُسن کی تاب کون لا سکتا ہے۔ (اپنا ہاتھ اُس کی کمر میں حمائل کرتا ہے اور رُخ قریب لاکر بوسہ لینا چاہتا ہے۔ دُردانہ مدافعت نہیں کرتی)

(حبیب گلاب کے پھولوں کا گلدستہ لئے داخل ہوتا ہے)

دُردانہ :- (حبیب کو دیکھ کر الگ ہوتے ہوئے) مجھے جانے دو۔

سلمان :- کل شام محکمۂ جنگلات میں میں تمہارا انتظار کروں گا۔ (حبیب پر نظر پڑتی ہے)

(حبیب گلاب کا گلدستہ ایک کرسی پر رکھ دیتا ہے۔ رومال سے منھ اور گردن پونچھتا ہے)

حبیب :- کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔

سلمان :- (رواداری اور بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے) آج موسم بہتر ہے۔ کل تک ہوا بہت تیز تھی۔ پچھلے سال اس سے زیادہ سخت جاڑا پڑا تھا۔ اِس سال فصل بھی بہتر ہوئی ہے۔ ہاں آج کل دن بہت چھوٹے ہو گئے ہیں۔ کام پورا نہیں ہوتا .... (جاتا ہے)

دُردانہ :- (تیزی سے حبیب کی طرف آتی ہے) ہمیں آج ہی یہاں سے چلے جانا چاہیئے۔ آپ بھی اس بات کی کوشش کیجئے۔

حبیب :- (اپنا چہرہ پونچھتا ہے) کیا...... اچھا...... بہت اچھا۔

(پروفیسر کلیم، سلیمہ، کلیمن اور محمد شریف داخل ہوتے ہیں)

پروفیسر :- اور لوگ کہاں ہیں۔ مجھے اس گھر سے نفرت ہے۔ بیس پچیس چھوٹے بڑے کمروں کا ایک گورکھ دھندا ہے۔ یہاں کسی کو ڈھونڈ

نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔ فخرالنساء بیگم اور دُردانہ کو بلاؤ۔

دُردانہ:۔ میں یہاں ہوں۔

سلیمہ:۔ (دُردانہ کے قریب جاتے ہوئے) اُس نے تم سے کیا کہا (غور سے دیکھتے ہوئے) مگر یہ تمہارا کیا حال ہے۔ تم کانپ رہی ہو ...... میں سمجھ گئی۔ اُس نے تمہیں صاف صاف بتا دیا۔ اُس نے وعدہ کر لیا کہ اب یہاں نہیں آئے گا۔ (دُردانہ سر ہلاتی ہے)

پروفیسر:۔ میں اپنی بیماری برداشت کر سکتا ہوں۔ لیکن قیصر کی یہ زندگی ناقابلِ برداشت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے زمین سے اُٹھا کر کسی غیر آباد سیارے میں پھینک دیا گیا ہے ..... اچھا بھئی تم سب لوگ بیٹھ جاؤ۔ سلیمہ اِدھر آؤ۔ (سلیمہ نہیں سنتی) اب میری لڑکی بھی میری بات نہیں سنتی (حکیمن سے) بوا تم بھی بیٹھ جاؤ (حکیمن ایک پیڑھی پر بیٹھتی ہے)

حبیب:۔ (پریشان ہے) میرے خیال میں میری موجودگی ضروری نہیں۔ کیا میں جا سکتا ہوں۔

پروفیسر:۔ نہیں تمہاری موجودگی سب سے زیادہ ضروری ہے۔

حبیب:۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں۔

پروفیسر:۔ کیا چاہتا ہوں۔ تم کچھ خفا معلوم ہوتے ہو۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہو تو معاف کرو۔

حبیب:۔ اس تکلف کی ضرورت آپ کو کیوں پیش آئی ...... مہربانی سے کام کی بات شروع کیجئے۔

(فخرالنساء بیگم داخل ہوتی ہیں)

پروفیسر:۔ اب میں شروع کر سکتا ہوں (ڈرامائی انداز میں) خواتین و حضرات! میں نے آپ سب کو اس لئے یہاں جمع کیا ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بہت جلد قیامت آنے والی ہے۔ (اس مذاق کی کوئی داد نہیں دیتا) خیر مذاق برطرف، میں نے اس لئے آپ لوگوں کو یہاں بلایا ہے کہ میں ایک اہم مسئلہ میں آپ سے رائے لینا چاہتا ہوں۔ ہر ایک جانتا ہے کہ میں ایک علمی آدمی ہوں۔ میری تمام زندگی پڑھنے لکھنے کی نذر ہوئی۔ عملی زندگی سے مجھے زیادہ سروکار نہیں رہا۔ اِس لئے اس میدان میں میرا تجربہ محدود ہے اور مجھے ان لوگوں کی صلاح کی ضرورت ہے، جو اس زندگی کا زیادہ تجربہ رکھتے ہیں۔ والدہ صاحبہ آپ، حبیب میاں اور محمد شریف مجھے اس سلسلے میں مفید مشورہ دے سکتے ہیں۔ میں ایک ضعیف اور بیمار آدمی ہوں اور چاہتا ہوں کہ میری جائداد کا مسئلہ جلد سے جلد طے ہو جائے۔ مجھے اپنی فکر نہیں، کیونکہ میری تو اب چند دنوں کی زندگی باقی ہے لیکن اپنے خاندان کی بہبودی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے مجھے کوئی فیصلہ کرنا ہے۔ مثلاً میری بیوی اور بیٹی (توقف) میں اس قصبے میں اور زیادہ نہیں رہ سکتا لیکن دوسری طرف جاگیر کی آمدنی سے شہر کی رہائش کے اخراجات پورے ہونا ناممکن ہیں۔ اگر جائداد کا کوئی حصہ بیچ دیا جائے تو کچھ دن کام چل سکتا ہے۔ مگر دو ڈھائی سال بعد پھر وہی سوال پیدا ہوگا۔ اس لئے ہمیں کوئی ایسا حل نکالنا ہے، جو مستقل ہو۔ میرے ذہن میں ایک ایسی ہی تجویز ہے، جو میں آپ لوگوں کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ..... اب میری جائداد کو لیجئے اِس سے مجھے تقریباً ...۹ روپے سالانہ کی آمدنی ہے، جبکہ اس وقت جاگیر کی قیمت دو ڈیڑھ لاکھ سے اوپر ہے۔ اب اگر اسے بیچ کر اس روپے سے کسی اچھی کمپنی میں حصے خرید لئے جائیں تو اس سے ...۱۳۰۰۰ تک کی آمدنی ہو سکتی ہے جس سے شہر کی رہائش کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں۔ حصے خریدنے کے علاوہ اتنا روپیہ بچ سکتا ہے جس

دہلی میں ایک معقول کوٹھی خریدی جا سکے ۔

جلیب :- ایک منٹ ٹھہریئے ۔ بیچ شاید ٹھیک نہیں سنا ۔ ذرا دہرا دیجئے ۔

پروفیسر :- میں نے کہا کمپنی میں حصہ خریدنے کے بعد اتنا روپیہ بچ سکتا ہے جس سے دہلی میں ایک کوٹھی خریدی جا سکے ۔

جلیب :- اس کے علاوہ بھی آپ نے کچھ کہا تھا ۔

پروفیسر :- میں نے کہا کہ ہمارے لئے یہ بات زیادہ مناسب ہوگی کہ یہ جائداد بیچ دی جائے ۔

جلیب :- بجا فرمایا ۔ بہت خوب ۔ بہت خوب ۔ لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ میں اپنی ضعیف ماں اور سلیمہ کو لے کر کہاں جاؤں گا ۔

پروفیسر :- ہاں ۔ ہاں ۔ آپ صبر تو کیجئے ۔ اس مسئلے پر بھی غور کیا جائے گا ۔

جلیب :- معاف کیجئے ۔ یہ میرے لئے یہ ایک بالکل نیا انکشاف ہے کہ یہ جائداد آپ کی ہے ۔ میں اسے اب تک سلیمہ کی ملکیت سمجھتا رہا ۔ کیونکہ یہ میرے والد نے میری بہن کی شادی کے موقع پر جہیز میں دی تھی ۔ یہ شاید میری بیوقوفی تھی کہ میں نے اسے سلیمہ کا حق سمجھا ۔ آپ کی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے مالک و مختار آپ ہیں ۔

پروفیسر :- ہاں ہاں جاگیر سلیمہ ہی کی ہے ۔ اس سے کس کو انکار ہے سلیمہ کی اجازت ہی سے یہ قدم اٹھایا جائے گا ۔ اور یہ بات بھی میں سلیمہ ہی کے مفاد کو ذہن میں رکھ کر کہہ رہا ہوں ۔

جلیب :- مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا یا تو میں پاگل ہوگیا ہوں ۔ یا پھر ......

فخرالنساء :- (تنبیہی لہجہ میں) جلیب کلیم کی بات مت کاٹو ۔ وہ ان مسائل کو خوب سمجھتے ہیں اور وہ جو قدم اٹھائیں گے وہ ہماری بھلائی ہی کے لئے ہوگا ۔

جلیب :- مجھے ذرا سا پانی دو (پانی پیتا ہے) اچھا اچھا آپ لوگوں کا جو دل چاہے کیجئے ۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گا ۔

پروفیسر :- میں تو اپنی رائے دے رہا ہوں ۔ میں نے یہ تو نہیں کہا کہ یہ میرا آخری فیصلہ ہے ۔

محمد شریف :- جناب والا مجھے عالموں سے ہمیشہ سے گہری عقیدت رہی ہے ۔ علم سے ہمارا خاندانی تعلق بہت گہرا ہے ۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ میرے بڑے بھائی کی بیوی کا بھائی شفیق احمد ایم ۔ اے پاس تھا ۔

جلیب :- یہ فضول باتیں اس وقت رہنے دیجئے ۔ ہم کاروباری باتیں کر رہے ہیں ۔ ہاں آپ انھیں سے پوچھئے ۔ ان کے چچا ہی کے ذریعہ یہ جائداد خریدی گئی تھی ۔

پروفیسر :- میں ان سے کیوں پوچھوں ۔ میں خود سب کچھ جانتا ہوں ۔

جلیب :- یہ جائداد ۹۰۰۰۰ روپے میں خریدی گئی تھی ۔ جس میں سے صرف ۰۰۰۰ ۷ روپے کی ادائیگی ہوئی تھی اور باقی روپیہ میں نے دن رات کام کر کے قسطوار ادا کیا ہے ۔ دوسرے میرے والد کے لئے اس جائداد کا خریدنا ناممکن ہوتا اگر میں اپنی پیاری بہن کی خاطر اپنے حصے سے دست بردار نہ ہو جاتا ۔

پروفیسر :- مجھے افسوس ہے کہ میں نے یہ بحث شروع کی ۔

حبیب :۔ یہ میری ہی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ اس وقت جاگیر کا قرضہ اُتر چکا ہے۔ اور وہ اتنی اچھی حالت میں ہے اور جب میں بڈھا ہو
رہا ہوں تو مجھے دُودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینکا جا رہا ہے۔

پروفیسر :۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم یہ باتیں کیوں کر رہے ہو۔

حبیب :۔ بیس سال سے میں اِس جاگیر کا انتظام کر رہا ہوں۔ اور میں زیادہ سے زیادہ روپیہ وصول کر کے بھیجتا رہا ہوں۔ لیکن اس عرصے
میں تم نے ایک مرتبہ بھی شکر گزاری کا اظہار نہیں کیا۔ جب سے میں نے یہ کام شروع کیا تم مجھے ۵۰۰ روپے سالانہ معاوضہ دیتے رہے
ہو اور تم نے اس وقت تک اس میں ایک پیسے کا اضافہ نہیں کیا۔

پروفیسر :۔ اگر تم معاوضہ بڑھوانا چاہتے تھے تو تمہیں مجھے بتا دینا چاہیئے تھا۔ تم جانتے ہو مجھے ان کاروباری باتوں سے کوئی سروکار
نہیں۔ تم خود اپنا معاوضہ بڑھا سکتے تھے۔

حبیب :۔ بجا فرمایا۔ میں نے بے ایمانی نہیں کی، دھوکہ نہیں دیا۔ اِس لئے میں بے وقوف ہوں۔ گدھا ہوں۔

فخر النساء :۔ (سختی سے) حبیب۔

محمد شریف :۔ حبیب میاں۔ نہیں، ایسا مت کہو۔ تم کیوں اپنا دل میلا کرتے ہو۔

حبیب :۔ پچیس سال سے میں اپنی ماں کے ساتھ اِس چار دیواری میں قید ہوں۔ ہمارے جذبات اور خیالات ہمیشہ تمہارے گرد گھومتے
رہتے تھے۔ ہمارے دل میں تمہاری کتنی قدر اور محبت تھی۔ ہم نے اپنی کتنی ہی شامیں تمہاری ان کتابوں اور مضامین کے پڑھنے
میں ضائع کیں۔ جن کی طرف اب میں دیکھنا بھی گوارا نہیں کر سکتا۔

پروفیسر :۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم چاہتے کیا ہو۔

حبیب :۔ ہمارے لئے تم ایک غیر معمولی ہستی تھے اور تمہاری تصانیف ادب اور فلسفے کی دنیا میں حرفِ آخر۔ لیکن اب میری آنکھیں کھل
چکی ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ تم تمام عمر ان مسائل پر لکھتے رہے ہو۔ جنہیں تم خود بالکل نہیں سمجھتے۔ تمہاری تمام کتابیں ردی کی ٹوکری میں
پھینکنے کے قابل ہیں۔ تم ہمیں دھوکہ دیتے رہے۔

پروفیسر :۔ اس شخص کو خاموش کر دو میں یہ برداشت نہیں کر سکتا۔

حبیب :۔ میں خاموش نہیں رہوں گا۔ (پروفیسر کا راستہ روکتے ہوئے) ٹھہرو میں نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی ہے۔ تم نے میری زندگی
تباہ کی ہے۔ میں نے زندگی کا کوئی لطف نہیں اُٹھایا۔ کوئی حق ادا نہیں کیا۔ میں نے اپنی عمر کے بہترین سال تمہارے لئے تباہ کر دیئے
تم میرے بدترین دشمن ہو۔

محمد شریف :۔ ارے بھئی یہ کیا ہو رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کیا کیا جائے۔

پروفیسر :۔ (غصّہ سے) تمہیں مجھ سے اِس طرح بات کرنے کا کیا حق ہے۔ اگر جاگیر تمہاری ہے تو اسے لے لو اور یہاں سے دفع ہو
جاؤ۔ میں ایسے جنگلی اور گمنام آدمی سے بات بھی نہیں کرنا چاہتا۔

دُردانہ :۔ اُف میں پاگل ہو جاؤں گی۔ میں اب اس دوزخ میں نہیں ٹھہر سکتی۔

حبیب:۔ میری زندگی برباد ہوچکی ہے۔ میں ذہین تھا۔ مجھ میں بہت سی صلاحیتیں تھیں۔ اگر میں نے اچھی زندگی گزاری ہوتی تو شاید میں بھی کوئی غالب یا اقبال یا ٹیگور ہوتا..... اوہ یہ مجھے کیا ہوگیا ہے۔ میں کیسی باتیں کر رہا ہوں..... اماں..... اماں..... میرا سر چکرا رہا ہے۔ میں شاید پاگل ہوگیا ہوں۔ اُف میں کیا کروں۔

فخر النساء:۔ تمہیں کلیم کے حکم کی تعمیل کرنی چاہیئے۔

سلیمہ:۔ (جو کانپ رہی ہے۔ دوزانو ہوجاتی ہے اور کلیمن کے گھٹنوں پر سر رکھ دیتی ہے) نانی بوا..... نانی بوا۔

حبیب:۔ اماں میں کیا کروں...... اچھا مجھے معلوم ہوگیا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ (پروفیسر سے) تم بھی یاد کروگے (درمیانی دروازے سے باہر جاتا ہے۔ فخر النساء بیگم بھی اُس کے بعد باہر جاتی ہیں۔)

پروفیسر:۔ یہ شخص اپنے کو سمجھتا کیا ہے..... پاگل انسان۔ میں اس کے ساتھ ایک گھر میں نہیں رہ سکتا۔ یا تو اسے گاؤں یا کم سے کم شاگرد پیشہ میں بھیجو، نہیں تو میں یہاں سے جاتا ہوں۔ میں اس کے ساتھ ایک منٹ نہیں رہ سکتا۔

دُردانہ:۔ ہم آج ہی یہاں سے چلے جائیں گے۔ ہمیں فوراً تیاری شروع کردینی چاہیئے۔

پروفیسر:۔ یہ حقیر اور گمنام انسان۔

سلیمہ:۔ (کلیمن کے زانو سے سر اُٹھاکر پروفیسر کی طرف دیکھتی ہے۔ آنسو بھری آواز میں) ابا جان ہم پر رحم کیجئے۔ میں اور حبیب ماموں بہت دُکھی ہیں۔ انھیں سمجھنے کی کوشش کیجئے اور اُن پر رحم کیجئے..... (جذبات کی شدت کو روکتے ہوئے) یاد تو کیجئے۔ حبیب ماموں اور نانی اماں نے آپ کی کتنی خدمت کی ہے۔ یہ دونوں کتنی ہی راتیں آپ کے کاغذات نقل کرنے اور آپ کی نئی کتابوں کا ترجمہ کرنے میں گزار دیتے تھے۔ اُنہوں نے کتنی ہی راتیں اس طرح گزاری ہیں..... کتنی ہی راتیں..... میں اور حبیب ماموں دن رات کام کرتے رہے ہیں۔ ہم ایک دھیلا اور ایک پیسہ بھی خرچ کرتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں آپ کو تکلیف نہ اُٹھانی پڑے۔ ہم کسی پر بار نہیں ہیں ہم نے اپنے خون پسینے کی روٹی کمائی ہے...... یہ میں کیا کہہ رہی ہوں — پتہ نہیں میں کیا کہنا چاہتی تھی۔ ابا جان آپ سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ خدا کے لئے ہم لوگوں پر رحم کیجئے۔

دُردانہ:۔ (اپنے شوہر سے پریشانی سے) کلیم صاحب خدا کے لئے حبیب سے صلح کی کوشش کیجئے۔ میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔

پروفیسر:۔ اچھا میں اُس سے بات چیت کروں گا۔ میں اُسے کوئی الزام نہیں دے رہا۔ لیکن اُس کا یہ رویہ عجیب وغریب ہے..... اچھا میں جاتا ہوں۔

(درمیانی دروازے سے باہر جاتا ہے)

دُردانہ:۔ ذرا نرمی سے پیش آیئے گا اور اُنھیں اطمینان دلانے کی کوشش کیجئے گا۔

سلیمہ:۔ (کلیمن کی گود میں سر رکھتے ہوئے) نانی بوا..... نانی۔

کلیمن:۔ میری بچی تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔ یہ لوگ چیخ چلاکر خود ہی ٹھیک ہوجائیں گے۔ اور چلے جائیں گے۔

سلیمہ:۔ نانی.....

حکیمن :۔ تم تو کانپ رہی ہو۔ میری مظلوم بچی۔ خدا بڑا رحیم و کریم ہے۔ میں ابھی تمہارے لئے چائے بناتی ہوں میری بچی تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔

(اسٹیج کے باہر سے پستول کی آواز آتی ہے اور چیخنے کی آواز بھی ساتھ ساتھ آتی ہے۔ سلیمہ اچھل پڑتی ہے۔)

(پروفیسر پریشان حال دوڑتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے)

(دردانہ اور حبیب دروازے کے قریب دکھائی دیتے ہیں۔ دُردانہ حبیب سے پستول چھیننے کی کوشش کر رہی ہے)

دُردانہ :۔ یہ مجھے دیدو۔ مجھے دیدو۔ خدا کے لئے۔

حبیب :۔ مجھے چھوڑو۔ جانے دو۔ (اپنے کو اُس سے چھڑا کر کمرے میں داخل ہوتا ہے) وہ کہاں ہے (پروفیسر کو دیکھتا ہے) اچھا یہ ہے (فائر کرتا ہے) افسوس یہ وار بھی خالی گیا لعنت ہے۔ (ریوالور پھینک دیتا ہے) اور ایک کرسی پر گر پڑتا ہے۔ پروفیسر گم سم چاروں طرف دیکھتا ہے۔ دُردانہ دیوار کا سہارا لیتی ہے۔

دُردانہ :۔ مجھے یہاں سے لے جاؤ۔ میں ایک منٹ یہاں نہیں ٹھہر سکتی۔

سلیمہ :۔ (آہستہ سے) نانی ــــ پیاری نانی

(پردہ گرتا ہے)

چوتھا ایکٹ

حبیب کا کمرہ۔ فرنیچر بہت معمولی۔ پلنگ میز کرسی ایک آدھ مونڈھا۔ محمد شریف اور حکیمن ایک طرف کام میں مصروف ہیں۔

محمد شریف :۔ حکیمن بوا جلدی کرو۔ وہ لوگ روانہ ہونے والے ہیں۔

حکیمن :۔ کچھ پتہ چلا وہ لوگ کہاں جارہے ہیں۔

محمد شریف :۔ ہاں وہ لوگ لکھنؤ جارہے ہیں۔ وہیں سکونت اختیار کرنے کا ارادہ ہے۔

حکیمن :۔ چلو ٹھیک ہے دوپہر کے ہنگامے سے میرے تو اوسان خطا ہوگئے۔

محمد شریف :۔ شکر ہے بات گھر سے باہر نہیں نکلی ورنہ بڑی جگ ہنسائی ہوتی۔

حکیمن :۔ کل سے تم، میں، حبیب میاں، سلیمہ سب اپنے اپنے کام میں لگ جائیں گے اور ہماری وہی پرانی زندگی شروع ہوگی۔ صبح چھ بجے چائے۔ پھر کام۔ بارہ بجے کھانا۔ کھانے کے بعد پھر کام..... سلیمہ کہاں ہے

محمد شریف :۔ وہ اور ڈاکٹر صاحب ہر جگہ حبیب میاں کو تلاش کر رہے ہیں۔ انھیں ڈر ہے کہ رنج اور غصے میں وہ ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھیں۔

حکیمن :۔ (گھبرا کر) حبیب میاں کی بندوق کہاں ہے۔

شریف :۔ اطمینان رکھو وہ تو میں نے توشہ خانے میں چھپا دی ہے۔

حکیمن :- اللہ تیرا شکر ہے۔

(حبیب اور ڈاکٹر باغ کے دروازے سے داخل ہوتے ہیں)

حبیب :- خدا کے لئے تم سب لوگ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ میں یہ نگرانی برداشت نہیں کر سکتا۔

(حکیمن اور شریف کام سمیٹ کر خاموشی سے جاتے ہیں)

حبیب :- (سلمان سے) اب تم بھی مجھ پر رحم کرو اور چلے جاؤ۔

سلمان :- بڑی خوشی سے۔ لیکن آپ نے میری جو چیز لے لی ہے وہ مہربانی سے واپس کر دیجئے۔

حبیب :- میں نے تمہاری کوئی چیز نہیں لی۔

سلمان :- انجان نہ بنو۔ اور میری چیز فوراً دے دو۔

حبیب :- میرے پاس تمہاری کوئی چیز نہیں۔

سلمان :- اچھی طرح سوچ لو۔ ورنہ پھر مجبوراً ہمیں تمہاری تلاشی لینی پڑے گی۔

(دونوں بیٹھتے ہیں۔ وقفہ)

حبیب :- میں اپنی آج کی حماقت کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ دو بار میرا نشانہ خطا ہوا۔ میں دنیا میں کسی کام کے قابل نہیں۔

سلمان :- اگر تمہیں نشانہ بازی کا اتنا شوق ہے تو جنگل میں جا کر شکار کیوں نہیں کھیلتے۔

حبیب :- (نظر انداز کرتے ہوئے) عجیب بات ہے۔ میں نے ایک آدمی کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے لیکن مجھے کوئی گرفتار نہیں کرتا۔ اس کا مطلب ہے کہ تم سب مجھے پاگل سمجھتے ہو۔ ہاں میں پاگل ہوں۔ لیکن جو لوگ اپنی بیوقوفی جہالت اور سخت دلی کو علمیت کے پردے میں چھپاتے ہیں اور پروفیسری کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ پاگل نہیں۔ وہ عورتیں جو بڈھوں سے شادی کرتی ہیں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اُن سے بے وفائی کرتی ہیں۔ پاگل نہیں ..... (سلمان) آج میں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

سلمان :- مجھے اس سے انکار نہیں۔ تم جلتے ہو تو جلتے رہو۔

حبیب :- (اپنا چہرہ چھپاتے ہوئے) مجھے شرمندگی کا شدید احساس ہے۔ میں کسی کو اپنی صورت نہیں دکھا سکتا۔ میں کیا کروں۔ بتاؤ میں اب کیا کروں۔

سلمان :- جہنم میں جاؤ۔

حبیب :- خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔ میں ۴۷ سال کا ہوں۔ اور اگر میں ۶۰ سال کی عمر تک زندہ رہا تو ابھی زندگی کے تیرہ سال اور باقی ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ یہ تیرہ سال کیسے گزریں گے۔ ان تیرہ سالوں کا ایک ایک دن میرے لئے کٹھن ہوگا۔ (سلمان کا ہاتھ اضطراری طور پر دباتا ہے) ہم ایک نئی زندگی کیوں نہیں شروع کر سکتے۔ ہمارا ماضی کیوں ہر جگہ ہمارا پیچھا کرتا ہے۔

سلمان :- (طنز سے) نئی زندگی! بھائی صاحب اب خواب دیکھنا بند کرو۔ ہمارا کوئی مستقبل نہیں۔ سنتے ہو میرا اور تمہارا کوئی مستقبل نہیں۔

حبیب :۔ خدا کے لئے مجھے کچھ دو۔ (اپنے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) میرے یہاں ایک آگ دہک رہی ہے۔

سلمان :۔ (غصے سے) بکواس بند کرو۔ (نرم پڑتے ہوئے) جو لوگ ہم سے سو سال بعد اس دنیا میں آئیں گے۔ وہ شاید اس زندگی میں خوشی کی کوئی راہ ڈھونڈلیں۔ ہم لوگوں کو تو شاید مرکر ہی چین ملے۔ (آہ بھرتے ہوئے) ہاں میرے بھائی اس قصبے میں دو ہی معقول اور مہذب انسان تھے۔ تم اور میں۔ لیکن دس سال کی اس قابلِ نفرت زندگی نے ہمیں تباہ کردیا۔ اب ہم بھی اوروں کی طرح ہیں (کچھ سوچ کر تیزی سے) لیکن مجھے باتوں میں نہ اڑاؤ۔ میری چیز واپس کردو۔

حبیب :۔ میں نے تمہاری کوئی چیز نہیں لی۔

سلمان :۔ تم نے میرے دواؤں کے تھیلے میں سے مارفیا کی ایک شیشی نکالی ہے۔ وہ مجھے فوراً واپس کردو (وقفہ) اگر تم مرنا چاہتے ہو تو جنگل میں جاکر اپنے کو شوٹ کرلو۔ مجھے کیوں پھنساتے ہو۔ تمہارا پوسٹ مارٹم کرنا ہی کیا کم ہوگا کہ لوگوں کے شک کا مرکز بھی بنوں۔

(سلیمہ داخل ہوتی ہے)

حبیب :۔ میرا پیچھا چھوڑ دو۔

سلمان :۔ سلیمہ تمہارے ماموں نے میرے تھیلے میں سے مارفیا کی ایک شیشی نکال لی ہے۔ اور اب انکار کر رہے ہیں..... ان سے کہو...... ان سے کہو یہ کوئی اچھا مذاق نہیں۔ اب میرے پاس وقت بھی نہیں، مجھے فوراً چلا جانا چاہیئے۔

سلیمہ :۔ ماموں جان کیا یہ ٹھیک ہے۔

سلمان :۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انھیں کے پاس ہے۔

سلیمہ :۔ واپس کردیجئے۔ کیوں ہمیں پریشان کرتے ہیں۔ واپس کردیجئے حبیب ماموں۔ میں آپ کو یقین دلاتی ہوں..... میں بھی آپ ہی کی طرح دکھی ہوں۔ لیکن اب تک سب کچھ برداشت کیا ہے اور کرتی رہوں گی۔ آپ کو بھی برداشت کرنا ہوگا (وقفہ) (اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر) میرے پیارے ماموں واپس دے دیجئے (روتی ہے) مجھے معلوم ہے آپ ہمیں کتنا چاہتے ہیں۔ اور ہمیں کوئی دکھ نہیں دے سکتے۔ مجھے یقین ہے آپ ضرور واپس کردیں گے۔ ماموں جان آپ کو برداشت کرنا ہی ہوگا۔

حبیب :۔ (اپنے ڈسک سے ایک شیشی نکال کر سلمان کو دیتا ہے) لو (سلیمہ سے) ہمیں اب اپنے کام میں لگ جانا چاہیئے۔ ان تلخیوں کو بھولنے کا شاید یہی طریقہ ہو۔

سلیمہ :۔ ہاں ضرور، ان لوگوں کو رخصت کرتے ہیں۔

سلمان :۔ اچھا اب مجھے جانا چاہیئے۔

سلیمہ :۔ حبیب ماموں ابّا جان یہاں آرہے ہیں۔ اُن لوگوں کے جانے سے پہلے آپ کو ان سے صلح کرلینی چاہیئے۔

(پروفیسر ڈیوڈ لال، فخر النساء بیگم (اُن کے ہاتھ میں ایک کتاب ہے) اور محمد شریف داخل ہوتے ہیں)

(حبیب ... [illegible]

پروفیسر: (سامنے آتے ہوئے) اب پُرانی باتوں کو بھول جاؤ۔ میں نے تو پچھلے چند گھنٹوں میں اتنا سوچا اور محسوس کیا ہے کہ اب میں اس مسئلے پر ایک کتاب لکھ سکتا ہوں کہ زندگی کس طرح گزارنی چاہیئے...... مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں۔ اُمید ہے کہ تم بھی مجھے معاف کروگے۔

(دونوں گلے ملتے ہیں)

حبیب: آپ کو سالانہ اتنی ہی رقم ملتی رہےگی جتنی پہلے ملتی تھی۔ سب معاملات پہلے ہی کی طرح طے ہوتے رہیں گے۔

(پروفیسر فخرالنساء بیگم کو سلام کرکے رخصت چاہتا ہے)

فخرالنساء بیگم: کلیم لکھنؤ جاکر اپنی نئی تصویر کی کاپی ضرور بھیجدینا۔

محمد شریف: خدا حافظ پروفیسر صاحب، وہاں جاکر ہم غریبوں کو نہ بھول جایئےگا۔

پروفیسر: (بیٹی کو گلے لگاتا ہے) خدا حافظ (ڈاکٹر سے ہاتھ ملاتا ہے) تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں تمہارے خیالات اور مقاصد کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن ایک معمر انسان کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے کی اجازت دو کہ اب تمہیں واقعی کچھ کام کرنا چاہیئے کوئی اہم کام...... اچھا خدا حافظ اُمید ہے کہ آپ سب اپنے مقاصد میں کامیابی حاصل کریں گے۔ (باہر جاتا ہے۔ سلیمہ اور فخرالنساء بھی جاتی ہیں)

حبیب: (دُردانہ سے) خدا حافظ اب ہم ایک دوسرے سے کبھی نہیں ملیں گے۔

دُردانہ: (متاثر ہے) خدا حافظ حبیب (ڈاکٹر کی طرف جاتی ہے)

ڈاکٹر: کیا واقعی تمہارا جانا نہیں ٹل سکتا۔

دُردانہ: نہیں، جو کچھ صبح ہوا اُسے بھول جایئے (باہر جاتی ہے)

ڈاکٹر: اب مجھے بھی جانا چاہیئے۔ حبیب بھائی تم ان لوگوں کو رخصت کرنے باہر نہیں جاؤگے۔

حبیب: نہیں بھئی مجھے معاف کرو۔ میرا دل بہت اُداس ہے اب تو شاید کام ہی میں سکون مل سکے۔

(وقفہ ــ گھوڑا گاڑی کے جانے کی آواز آتی ہے)

سلمان: معلوم ہوتا ہے وہ لوگ روانہ ہوگئے۔ اب پروفیسر یقیناً یہاں کبھی نہیں آئے گا۔

حکیمن: (اندر آتے ہوئے) وہ لوگ رخصت ہوگئے۔

سلیمہ: (داخل ہوتے ہوئے) وہ لوگ چلے گئے۔ حبیب ماموں اب ہمیں کچھ کام شروع کرنا چاہیئے۔

حبیب: ہاں کام ــ مسلسل کام

فخرالنساء بیگم: (آہستہ آہستہ داخل ہوتے ہوئے) چلے گئے (بیٹھ جاتی ہے اور پڑھنے میں غرق ہوجاتی ہے)

(سلیمہ اور حبیب میز کے گرد کام میں مصروف ہوجاتے ہیں۔ سلیمہ کچھ بل وغیرہ دیتی ہے۔ حبیب رجسٹر میں نوٹ کرتا ہے۔)

سلمان :- کتنا سکون ہے کس قدر خاموشی ہے قلم چلنے کی آواز بھی سنائی دیتی ہے۔ اس پُرسکون فضا کو چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا۔
(دروازے پر گاڑی آنے کی آواز) تانگہ تیار ہو گیا ہے۔ اب مجھے جانا ہی ہوگا۔
(ایک مزدور اندر آتا ہے سلمان اُسے اپنا تھیلا اور چائے وغیرہ پکڑاتا ہے۔ مزدور باہر جاتا ہے)

سلمان :- اچھا خدا حافظ

سلیمہ :- اب آپ سے کب ملاقات ہوگی۔

سلیمہ :- شاید اگلی گرمی سے پہلے ممکن نہ ہو۔ البتہ اگر میری ضرورت ہو تو اطلاع دے دینا (حکیمن کی طرف جاتے ہوئے) اچھا بوا خدا حافظ (حکیمن اُسے گلے سے لگاتی ہے۔ ڈاکٹر باہر جاتا ہے۔ (سلیمہ اُسے چھوڑنے دروازے تک جاتی ہے)

جلیب :- (کام میں مصروف ہے) ۲۸ جنوری ...... ۲۹ جنوری ...... ۱۰ فروری۔

سلیمہ :- (واپس آتے ہوئے) ڈاکٹر چلے گئے۔

جلیب :- (سلیمہ سے) میرا دل ایک پھوڑے کی طرح دُکھ رہا ہے۔ کاش کہ میں تمہیں دکھا سکتا۔

سلیمہ :- ماموں جان ہم کیا کر سکتے ہیں۔ ہمیں زندہ رہنا ہی ہوگا۔۔۔ اور ہم زندہ رہیں گے۔ ہماری زندگی میں بہت سے تھکا دینے والے دن اور طویل راتیں آئیں گی۔ اور ہم پر جو مشکلات پڑیں گی ہم انہیں خاموشی اور صبر سے برداشت کریں گے اور ہم ہمیشہ دوسروں کی خدمت کرتے رہیں گے۔ اور جب ہمارا وقت آئے گا تو ہم خاموشی سے اپنی جان موت کے سپرد کر دیں گے۔ اور پھر اس دوسری دنیا میں ہم بتائیں گے کہ ہم نے کتنی تکلیفیں اُٹھائی ہیں اور ہماری زندگی کتنی تلخ تھی اور پھر شاید خدا ہماری بات سمجھے گا اور ہم پر ترس کھائے گا اور پھر پیارے ماموں ہم بھی شاید ایک حسین مسرور اور پُرسکون زندگی گزارنا شروع کریں گے۔ اس وقت جب ہم اپنی اس زندگی کو یاد کریں گے تو اس میں تلخی کا کوئی احساس نہیں ہوگا..... اور پھر آرام کریں گے ــــ مجھے یقین ہے ماموں جان۔ میں اس میں دل سے یقین کرتی ہوں..... ہم آرام کریں گے۔

(محمد شریف ستار بجاتا ہے)

ہم آرام کریں گے۔ تاروں بھرے نیلے آسمان کی چھاؤں میں ایک حسین روحانی فضا میں اور اس نور اور مسرت کے سیلاب میں اس زندگی کی تمام برائیاں، تمام رنج اور تکلیفیں تنکوں کی طرح بہہ جائیں گی اور ہماری زندگی پُرسکون، خوبصورت اور پاک ہوگی۔ مجھے یقین ہے۔ مجھے یقین ہے۔ (اُس کے آنسو پونچھتی ہے) ماموں جان آپ رو رہے ہیں۔ آپ کو زندگی میں کوئی خوشی نہیں ملی ــ کوئی آرام نہیں ملا۔ ابھی اور انتظار کیجئے۔ ہمیں ضرور سکون ملے گا۔ ہم آرام کریں گے (اُس کے گلے میں باہیں ڈالتی ہے)
فخر النساء بیگم کتاب کے حاشیہ پر پنسل سے نشان لگاتی ہے۔ حکیمن اپنی چادر میں پیوند لگانے کے بعد دھاگا توڑتی ہے۔

(پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے)

والٹ وھٹ مین
(انیسویں صدی کا عظیم امریکی شاعر)

کھلی سڑک کا گیت

ترجمہ: سردار جعفری

پا پیادہ اور سُبک بار، مطمئن اور مگن
میں کھلی ہوئی سڑک پر چل رہا ہوں۔
تندرست و توانا، آزاد و سربلند،
میرے سامنے ایک دُنیا پھیلی ہوئی ہے۔
طول طویل مٹیالی راہ میرے قدموں کے نیچے بچھی ہوئی ہے
اور میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں۔

مجھے اب خوش نصیبی کی تلاش نہیں، میں آپ اپنا نصیب ہوں۔
اب نہ کُڑھنے کی ضرورت ہے نہ غم کھانے کی
اب میں ہر ضرورت سے بے نیاز ہوں۔
اب کون شکایت کرے، کون کُتب خانوں میں بیٹھ کر سر کھپائے
چڑچڑی اور چھچھوری تنقیدیں بیکار ہیں
میں مضبوط اور مطمئن ہوں اور کھلی ہوئی سڑک پر محوِ خرام

زمین، بس یہ زمین ہی میرے لئے کافی ہے
اوپر آسمان پر ستاروں کے جھرمٹ ہیں تو ہوا کریں
مجھے اُن کی قربت نہیں چاہیئے۔
وہ جہاں چمک رہے ہیں وہیں اچھے ہیں

وہ اپنے چاہنے والوں پر اپنا نور برساتے رہیں

(پھر بھی میرے شانوں پر ایک پرانا ناخوشگوار بوجھ ہے
میں جہاں بھی جاتا ہوں اس بوجھ کو لے کر جاتا ہوں
اِس سے نجات حاصل کرنا ناممکن ہے
وہ میرے وجود میں سرایت کر چکا ہے اور میں اُس کے وجود میں سرایت کر جاؤں گا)

۲۔ اے کھلی ہوئی سڑک، میں تجھ پر قدم رکھ کر چاروں طرف دیکھتا ہوں
مجھے یقین ہے کہ تو صرف اتنی نہیں جتنی دکھائی دیتی ہے۔
تو بہت کچھ ہے جو ابھی تک میری نگاہوں سے اوجھل ہے

یہاں پذیرائی ہی پذیرائی ہے،
تو کسی کو ترجیح نہیں دیتی، کسی سے انکار نہیں کرتی
سیاہ فام اور گھونگھریلے بالوں والے،
رند، اوباش، روگی، جاہل، سب کے لئے تیرا دل کشادہ ہے
نیا جنم، معالج کا تعاقب، بھکاری کے بھاری قدم
لڑکھڑاتے شرابی، کاریگروں کی ہنستی ہوئی ٹولیاں
گریزاں نوجوان، رئیسوں کی سواریاں، بانکے ٹیڑھے چھیل چھبیلے، مغرور عاشق اور معشوق،
صبح کی پہلی کرن کے ساتھ بازاروں کی طرف لپکتے ہوئے لوگ،
گزرتی ہوئی تابوت گاڑیاں
شہر کی طرف جاتا ہوا گھریلو سامان
اور شہر سے واپسی
یہ سب گزر رہے ہیں، میں بھی گزر رہا ہوں، ہر چیز گزر رہی ہے۔
کسی کا راستہ نہیں روکا جا سکتا
ہر شے قابلِ قبول ہے، ہر شے مجھے عزیز ہے۔

۳۔ اے موجِ نفس جس سے میرے لب نوا پیرا ہیں
اے اشیا جن کا انتشار میرے لئے بامعنی شکلوں میں نمایاں ہوتا ہے
اے روشنی جو میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہے اور ہر چیز پر نازک اور باریک پھوار کی طرح برس رہی ہے۔
اے کنارے کے راستو، جن میں چھوٹے بڑے گڑھے بن گئے ہیں۔
مجھے یقین ہے تم میں نہ جانے کتنے اَن دیکھے وجود نہاں ہیں
تم سب مجھ کو بے حد عزیز ہو۔

اے شہر کی گلیو کہ تمہارے فرش پتھریلے اور موڑ ڈھلوان ہیں
اے کشتیو اور کشتیوں کے ساحلو
لکڑی لگے کنارو، دُور جاتے ہوئے جہازو
اے گھروں کی قطارو، دریچوں، جھروکو اور چھتو
اے برساتیو اور ڈیوڑھیو، منڈیرو اور آہنی سلاخو،
اے شفاف شیشوں کی کھڑکیو کہ تم اپنے اندر کچھ نہیں چھپا سکتیں،
اے دروازو اور چڑھتی ہوئی سیڑھیو،
اے محرابو،
اے سُرمئی پتھروں کے لامتناہی راستو،
اے روندے اور کچلے ہوئے چوراہو
مجھے یقین ہے کہ جس چیز نے تمہیں چھوا ہے اُن سے تم نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا ہے
اور تم وہ سب کچھ چپکے سے مجھے دے دوگے
تمہاری متین سطحیں زندوں اور مُردوں سے آباد ہیں
اور اُن کی روحیں مجھ پر ظاہر ہوں گی اور التفات اور مہربانی سے پیش آئیں گی۔

۴۔ میرے دائیں اور بائیں پھیلتی ہوئی زمین
ایک جیتی جاگتی تصویر، ہر حصّہ روشن اور منوّر
جہاں ترنم ہونا چاہیئے وہاں ترنم ہے اور جہاں نہیں ہونا چاہیئے وہاں خاموشی

شارعِ عام کی ہنستی ہوئی خوشگوار آواز، سڑک کا تازہ مسرت بخش احساس

اے شارعِ عام میں پیادہ رو سفر ہوں؟ کیا تو یہ کہہ رہی ہے کہ مجھے چھوڑ کر نہ جانا؟
کیا تو یہ کہہ رہی ہے کہ ایسی جسارت نہ کرنا، مجھے چھوڑا تو تم گم ہو جاؤ گے؟
کیا تو یہ کہہ رہی ہے کہ میں بالکل تیار ہوں، قدموں کے نیچے روندی جا چکی ہوں، مجھ سے کسی نے انحراف نہیں
کیا، اور ہر قدم پر مجھ سے وابستہ رہنا؟

اے شارعِ عام میرا جواب یہ ہے کہ میں تجھے چھوڑتے ہوئے ڈرتا نہیں ہوں۔ پھر بھی میں تجھے پیار کرتا ہوں
تو مجھ کو مجھ سے بہتر ادا کرتی ہے
تو میرے لئے میری نظم سے بھی زیادہ ہے

میرا خیال ہے کہ بہادری کے سارے کارنامے کھلی فضا میں پیدا ہوتے ہیں
تمام آزاد نظموں کی تخلیق یہیں ہوئی ہے۔
میں یہاں رک کر معجزے دکھا سکتا ہوں

میرا خیال ہے کہ اس سڑک پر مجھے جو کچھ ملے گا پسند آئے گا
اور جو کوئی مجھے دیکھے گا، پسند کرے گا
میری نظر جس پر اٹھے گی وہ خوش و خرم نظر آئے گا۔

۵ اس لمحے سے میں اپنی ذات کو تمام پابندیوں اور فرضی سرحدوں سے آزاد کرتا ہوں
میں جہاں چاہوں جا سکتا ہوں، میں آپ اپنا مالک ہوں
میں دوسروں کی سنتا ہوں، اُن کے کہے پر غور کرتا ہوں۔
رکتا ہوں، تلاش کرتا ہوں، قبول کرتا ہوں، سوچتا ہوں
لیکن پھر بھی نہایت نرمی سے، مگر پختہ ارادے کے ساتھ، اپنے آپ کو ہر اس قید سے آزاد کر لیتا ہوں، جو میری
راہ میں حائل ہو سکتی ہے۔

میں فضائے بسیط کے جام پی رہا ہوں
پورب اور پچھم میرے ہیں، اُتر اور دکن میرے ہیں
میں اپنے قیاس سے زیادہ عظیم ہوں، اپنے خیال سے زیادہ بہتر
مجھے اب تک نہیں معلوم تھا کہ میں کتنی خوبیوں کا مالک ہوں

یہ دنیا کتنی حسین ہے
میں مردوں اور عورتوں کے سامنے یہ بات دُہرا سکتا ہوں کہ تم نے جیسی میری قدر کی ہے، ویسی ہی میں تمہاری قدر کروں گا۔
میں چلتے چلتے اپنے اور تمہارے لئے دوست فراہم کروں گا۔
میں چلتے چلتے اپنی ہستی کو مردوں اور عورتوں کے درمیان بکھیر دوں گا
میں اُن کے درمیان ایک نئی مسرّت اور توانائی لٹا دوں گا
اگر کوئی مجھے رَد کر دے گا تو مجھے اس کا دُکھ نہ ہوگا۔
اور جو کوئی مجھے قبول کرے گا اُس پر برکتیں نازل ہوں گی اور وہ میرے لئے باعثِ برکت ہوگا

اب اگر اس وقت ایک ہزار کامل انسان میرے سامنے آ کھڑے ہوں تو مجھے حیرت نہ ہوگی۔
اب اگر اس وقت ہزار عورتوں کی حسین شکلیں رونما ہوں تو مجھے تعجب نہ ہوگا۔
اب میں نے بہترین شخصیت کی تخلیق کا راز پالیا ہے۔
یہ پیکر کھلی فضا میں جوان ہوتے ہیں اور دھرتی کے پہلو میں سوتے ہیں

یہاں انفرادی کارنمایاں کے لئے جگہ موجود ہے
(ایسا کارنمایاں ساری انسانیت کے دل کو جیت لیتا ہے
اس میں اتنی طاقت ہوتی ہے، اتنا عزم ہوتا ہے کہ وہ ہر قانون پر حاوی ہو جاتا ہے اور ہر اقتدار اور مخالف دلیل کا مذاق اُڑاتا ہے)

یہاں حکمت اور دانائی کی کسوٹی ہے۔

دانائی کا آخری امتحان مدرسوں میں نہیں ہوتا
دانائی ایک سے دوسرے کو منتقل نہیں کی جا سکتی
دانائی رُوح کی ہوتی ہے، دلیل کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ آپ اپنی دلیل ہے
ہر منزل، ہر شے اور ہر کیفیت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔
یہ قائم ہے
حقیقت کا ایقان اور اشیاء کی ابدیت ہے
اور اشیاء کی فضیلت ہے
مظاہرِ نظارے میں کچھ ایسی بات ہوتی ہے جو دانائی کو رُوح کی گہرائیوں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیتی ہے

اب میں فلسفوں اور مذاہب کا جائزہ لیتا ہوں
ہو سکتا ہے کہ مدرسوں اور خانقاہوں میں وہ سچے ثابت کر دیئے جائیں۔
لیکن پھیلے ہوئے بادلوں کے نیچے قدرتی مناظر اور بہتے ہوئے دھاروں کی زد میں آ کر سچے ثابت نہ ہو سکیں۔

یہاں عمل پذیری اور وصول یابی ہے
یہاں آدمی کا حساب ہوتا ہے۔ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس میں کیا ہے
ماضی ہو کہ مستقبل، عظمت ہو کہ محبت، اگر وہ تم سے عاری ہیں تو تم اُن سے عاری ہو
سو
نشوونما کا باعث صرف، طنز ہوتا ہے
وہ کہاں ہے جو تمہارے اور میرے لئے چھلکے کو چھیل کر پھینک دے؟
وہ کہاں ہے جو میرے اور تمہارے لئے مکر و فریب کے لبادے اُتار دے؟

یہاں محبت اور لگاؤ ہے، جس کا پہلے وجود نہیں تھا، جسے موقع اور محل نے پیدا کیا ہے
کیا تمہیں معلوم ہے کہ راہ چلتے اجنبی کا پیار کیسا ہوتا ہے؟
کیا تم اُن کی مُڑتی ہوئی نظروں کی گفتگو سمجھتے ہو؟

۷. یہاں رُوح کی بیداری ہے

رُوح کی بیداری وجود کے اندر سے ہوتی ہے،
ہمیشہ پیدا ہونے والے سوالات اُسے جگاتے ہیں
یہ اشتیاق، یہ خواہشیں، یہ اُمیدیں کیوں ہیں ؟
اندھیرے میں چمکتے ہوئے یہ خیالات کیوں ہیں ؟
یہ مرد اور یہ عورتیں کیوں ہیں، جن کی قربت سے میرے خون میں سورج کی روشنی گھل جاتی ہے
اور جب وہ مجھے چھوڑ جاتے ہیں تو میری مسرت کے پرچم بے جان اور سرنگوں ہو جاتے ہیں
ایسے درخت کیوں ہیں، جن کے نیچے سے گزرتے ہوئے مجھ پر عظیم اور سُریلے خیالات کا نزول ہوتا ہے
(میرا خیال ہے کہ وہ خیالات گرمی اور جاڑے ہمیشہ ان درختوں پر آویزاں رہتے ہیں اور جب میں ادھر سے گزرتا ہوں تو درخت اپنے پھل مجھ پر برسا دیتے ہیں)
وہ کیا شے ہے جس کا تبادلہ میں اجنبیوں سے اس قدر جلد کر لیتا ہوں
وہ کیا شے ہے جس کا تبادلہ میں گاڑی چلانے والے سے اس کے برابر کی نشست پر بیٹھ کے
اور سمندر کے کنارے جال کھینچنے والے مچھیروں سے کر لیتا ہوں. جب میں اُن کے قریب سے گزرتا ہوں یا رُک جاتا ہوں.
وہ کیا شے ہے جو مردوں اور عورتوں کی خیر اندیشی کا یقین دلا کے مجھے اُن سے بے تکلف کر دیتی ہے اور اُنہیں مجھ سے بے تکلف کر دیتی ہے.

۸. رُوح کی بیداری مسرّت ہے، اور یہاں اس سڑک پر مسرّت ہی مسرّت ہے.
میرا خیال ہے کہ وہ کھُلی فضا میں سرایت کر جاتی ہے اور ہر لمحہ منتظر رہتی ہے.
اور اب وہ ہم تک پہنچ گئی ہے اور ہم بجا طور سے سرشار ہیں

یہاں سیّال اور محبّت کرنے والا کردار اُبھرتا ہے.
سیّال اور محبّت کرنے والے کردار میں مرد کی تازگی اور عورت کی مٹھاس ہے
(صبح کے وقت پھوٹنے والی کونپلیں جڑوں سے اتنی شادابی اور شیرینی لے کر نہیں آتیں جتنی تازگی اور مٹھاس اس کردار میں ہوتی ہے)

اِس سیّال اور محبت کرنے والے کردار پر بوڑھوں اور جوانوں کا پیار برستا ہے
اور اس کردار سے کشید ہوکر وہ جادو ٹپکتا ہے جو حسن اور تحصیلِ کمال پر ہنستا ہے
اور اس کی طرف لرزتی ہوئی آرزو کا در دلمس کے لئے کھنچتا ہے۔

۹۔ تم کون ہو اور کیا ہو اس سے کیا بحث
آؤ اور میرے ہم سفر بن جاؤ
میرے ساتھ سفر کرکے نہیں وہ کچھ ملے گا جس سے تم کبھی نہیں اکتاؤ گے۔

زمین کبھی نہیں اکتاتی
زمین پہلے گستاخ، خاموش، ناقابلِ فہم محسوس ہوتی ہے
فطرت بھی پہلے گستاخ، خاموش، ناقابلِ فہم محسوس ہوتی ہے
اِس سے بد دل نہ ہونا، سفر جاری رکھنا
تمہیں حجابات کے اندر مقدس اور الوہی چیزیں ملیں گی۔
ایسی مقدّس اور الوہی چیزیں جن کا حُسن الفاظ کے احاطے سے باہر ہے

بڑھے چلو، ہمیں یہاں نہیں رکنا چاہئے
یہ خزانے اور ذخیرے کتنے ہی حسین کیوں نہ ہوں
ہم یہاں ہرگز نہیں رُک سکتے
یہ بندرگاہ کتنی ہی محفوظ کیوں نہ ہو
یہ پانی کتنا ہی پُرسکون کیوں نہ ہو
ہمیں یہاں اپنا لنگر نہیں ڈالنا ہے
ہمارے لئے مہماں نوازی اور فیّاضی کی کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو
ہمیں اس کے قبول کرنے کے لئے چند لمحوں سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہیں ہے

۱۰۔ بڑھے چلو

ترغیب بہت زیادہ ہوگی
ہمیں اُن جانے اور طوفانی سمندروں سے گزرنا ہے
ہم وہاں جائیں گے جہاں ہوائیں تیز چلتی ہیں اور موجیں موجوں سے ٹکراتی ہیں
جہاں تیز رو امریکی کشتیاں پورے بادبان کھولے ہوئے آگے بڑھتی ہیں

بڑھے چلو، قوت اور آزادی کے ساتھ
زمین اور عناصر کو جلو میں لئے ہوئے
صحت، سرکشی، شوخی، خود بینی اور تجسس ہم رکاب ہیں
بڑھے چلو، تمام اصولوں کو توڑتے ہوئے
کور چشم، مادہ پرست پادریوں اور راہبوں کے سدھانتوں کو ٹھکراتے ہوئے

سڑا ہوا مُردہ راہ روکے کھڑا ہے — اب اس کو دفنانے میں دیر نہیں کرنی چاہیئے۔

بڑھے چلو،
لیکن یہ یاد رکھو کہ جو کوئی میرا ہم سفر ہے
اس کو تازہ خون، قوت اور تحمل کی ضرورت ہے
میرے ہم سفر کو تازہ دم، جفاکش اور صابر ہونا چاہیئے
اس آزمائش کے لئے وہ نہ آئے جس کے پاس ہمت اور صحت کا زادِ راہ نہ ہو
اگر تم اپنی بہترین صلاحیتیں ضائع کر چکے ہو تو میری طرف نہ آنا
صرف وہ آسکتے ہیں جن کے لطیف پیکر عزم و استقلال سے بنے ہیں
کسی بیمار شخص، بدمست شرابی یا سوزاک و آتشک کے مریض کو یہاں آنے کی ضرورت نہیں ہے

(میں اور میرا جیسے الفاظ کسی دلیل، تشبیہہ یا استعارے سے اپنے وجود کا جواز پیش نہیں کرسکتے
ہم اپنے وجود سے اپنا جواز پیش کرتے ہیں)

۱۱۔ سنو، تم سے خلوص اور ایمانداری کے ساتھ بات کروں گا۔
میں انعام کے طور پر کوئی ایسی چیز پیش نہیں کروں گا، جو گھس گھس کر چکنی ہو گئی ہو۔
میں نئے ناتراشیدہ تحفے پیش کروں گا
یہ نئے دنوں کی شکل میں تمہارے سامنے آئیں گے
تم دولت کے انبار نہیں لگاؤ گے
تم جو کچھ کماؤ گے یا حاصل کرو گے اُسے دونوں ہاتھوں سے لٹا دو گے
تم اس شہر میں پہونچو گے، جو تمہاری منزل مقصود تھا، لیکن قبل اس کے کہ تم اپنا بار کھولو اور اطمینان کا سانس لو، جرس کی بیتابانہ آواز تمہیں پھر چلنے پر مجبور کر دے گی۔
تم اپنے ان درماندہ ہم سفروں کے طنز و تشنیع کا نشانہ بنو گے، جو تھک کر پیچھے رہ گئے ہیں
محبت کے پرشوق اشارے اور بلاوے تمہاری راہ روکیں گے لیکن تم صرف رخصتی بوسوں کے آتشیں لمس سے ان کا جواب دو گے
تم اس کی اجازت نہیں دو گے کہ تمہاری طرف پھیلے ہوئے ہاتھ پیروں کی زنجیر بن جائیں۔

۱۲۔ بڑھے چلو
اپنے عظیم ساتھیوں کی تقلید کرو، اُن سے مل کر ایک ہو جاؤ
وہ سب سڑک پر محوِ خرام ہیں
وہ تیز گام اور سربلند مرد ہیں، وہ عظیم الشان عورتیں ہیں
وہ سمندر کے سکون اور سمندر کے طوفان سے لطف اندوز ہونے والے

اَن گنت جہازوں کے کھیون ہار، زمین پر میلوں پا پیادہ چلنے والے
دور دراز ملکوں کے باسی، دور دراز مکانوں کے مکین
مرد اور عورتوں پر اعتماد کرنے والے، آبادیوں کے شاہد، تن تنہا محنت کرنے والے
گچھوں، کلیوں اور ساحل پر پڑی ہوئی ں پر غور و فکر کرنے والے
شادی بیاہ پر ناچنے والے، دُلہنوں کو پیار کرنے والے، بچوں پر شفقت کرنے والے، بچوں کے پیدا کرنے والے
بغاوتوں کے سپاہی، کھلی ہوئی قبروں کے دہانوں پر کھڑے ہونے والے، تابوت اُتارنے والے

فصل بہ فصل، موسم بہ موسم، سال بہ سال سفر کرنے والے
اپنے ساتھیوں، اپنے ہی مختلف روپوں کے ہمراہی
اپنے خوابیدہ بے تعبیر بچپن کے دنوں سے باہر نکلنے والے
اپنی چہکتی جوانی کے ہم سفر، اپنی تجربہ کار پختہ مردانگی کے ہم سفر

اپنی خوبصورت، فراخ دل، بے مثل قانع اور مطمئن نسوانیت کے ہم سفر
اپنے پاکیزہ اور برتر بڑھاپے کے ہم سفر
بڑھاپا جس میں پرسکون اور پھیلی ہوئی کائنات کے سانسوں کا زیر و بم ہے
بڑھاپا جو موت کی لطیف تر آزادی کے تصور کے ساتھ سیر کر رہا ہے

۱۴۔ بڑھے چلو
اس ابدیت کی طرف جس کی نہ ابتدا تھی نہ انتہائی ہے
دنوں کی آوارہ خرامی اور راتوں کے آرام کی طرف
اِس سیلِ رفتار میں سب کچھ غرق کر دو
اور پھر اس سیلِ رفتار کو نئے اور بہتر سفر کے طوفان میں ملا دو
راہوں اور گزرتی ہوئی منزلوں کے سوا کچھ نہ دیکھو
ہر چیز پر نظر ڈالو اور گزر جاؤ
وقت کا احساس ختم کر دو، راستہ کتنا ہی دور دراز کیوں نہ ہو
صرف اس وقت کو محسوس کرو جس سے تم گزر رہے ہو
کسی بھی سڑک کو اس نظر کے سوا کسی اور نظر سے نہ دیکھو کہ وہ تمہارے قدموں کے انتظار میں اپنی آنکھیں بچھا رہی ہے
وہ کتنی ہی طول طویل کیوں نہ ہو، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔
کسی وجود کی طرف نظر اٹھا کے نہ دیکھو چاہے وہ خدا کا وجود ہو یا مخلوقِ خدا کا، بلکہ خود اس وجود تک پہونچ جاؤ
کسی دولت کسی ملکیت پر نظر نہ ڈالو، بلکہ اُسے اپنی دولت اور ملکیت بنا لو اور بغیر محنت اور خریداری کے ہر چیز سے لطف اندوز ہو۔

دعوت میں پوری طرح شریک ہو لیکن ایک ریزہ بھی کم نہ ہونے پائے۔
کسان کے کھیت کا بہترین حاصل تمہارا ہے اور امیر آدمی کا پرشکوہ محل تمہارا ہے اور نئی نویلی دُلہن اور دُولہا
کی پاکیزہ دُعائیں تمہارے لئے ہیں اور گلناروں کے پھول اور ثمر ناروں کے
پھل تمہارے ہیں۔
گنجان شہروں سے گزرتے ہوئے اُن کی ہر برکت کو اپنے تصرّف میں لاؤ۔
اور پھر اُن کی عمارتوں اور سڑکوں کو بھی جاؤ اپنے ساتھ لے جاؤ
اور جب اُن سے ملو تو اُن کے دماغوں سے اُن کی عقل کو سمیٹ لو اور اُن کے دلوں سے اُن کے پیار کا رس نچوڑ لو۔
اپنے عاشقوں کو اپنے ساتھ لے کر چلو
ساری کائنات کو ایک سڑک سمجھو، بہت ساری سڑکیں جو رُوحوں کے سفر کے لئے کھلی ہوئی ہیں۔

رُوحوں کی ترقی کے سامنے ہر چیز ہیچ ہے۔
مذاہب، ٹھوس سے ٹھوس چیزیں، فنونِ لطیفہ، حکومتیں ہر شئے جو کرۂ ارض پر یا کسی دوسرے کُرّے پر تھی اور ہے،
رُوحوں کے اِس جلوس کی گردِ کارواں بن کر اُڑ جاتی ہے، جو کائنات کی عالیشان
سڑکوں پر رواں دواں ہے۔
کائنات کی اس عالیشان سڑک پر مردوں اور عورتوں کی ترقی سب سے زیادہ اہم ہے۔ باقی ساری ترقیاں
اُس کا زادِ راہ ہیں۔

ہمیشہ زندہ، ہمیشہ رواں دواں
پرشکوہ، مقدس، مغموم، سنجیدہ، حیرت زدہ، پاگل، طوفان خیز، نحیف و نزار، ناآسودہ
بیباک، مغرور، سرکش، شفیق مہرباں، بیمار، مقبولِ خلائق، مردودِ بارگاہ
وہ قدم بڑھائے چلے جارہے ہیں، چلے جارہے ہیں
میں جانتا ہوں وہ جارہے ہیں۔ لیکن کہاں جارہے ہیں یہ نہیں معلوم
البتہ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ بہترین سمت کی طرف، کسی عظیم چیز کی طرف جارہے ہیں

تم کون ہو، کیا ہو، اس سے کیا بحث

میں کہتا ہوں آگے آؤ، مرد ہو یا عورت، آگے آؤ
تمہیں گھر کے اندر اونگھنا اور سسکنا نہیں چاہیئے۔
خواہ وہ گھر تم نے خود تعمیر کیا ہو، خواہ تمہارے لئے تعمیر کیا گیا ہو

تیرہ و تار قید خانے سے باہر نکلو، پردے کے پیچھے سے باہر آؤ
احتجاج بیکار ہے، میں سب کچھ جانتا ہوں اور بے نقاب کرتا ہوں

اپنے اندر جھانک کر دیکھو، اتنی ہی بدی جتنی اوروں میں ہے
ہنسی، مذاق، رقص و سرود، دعوت اور ضیافت کے پیچھے
ترشے ہوئے ملبوس اور چمکتے ہوئے زیورات کے اندر
چکنے چپڑے، دھلے دھلائے چہروں کی تہہ میں
جھانکو اور دیکھو
حجابات کے اندر ایک خاموش، پوشیدہ نفرت، بیدلی اور نراشا نظر آئے گی۔

شوہر، بیوی، دوست
اعتراضات کے سننے کی تاب کسی کو نہیں
ہر ایک کے ساتھ ایک اجنبی شخصیت ہے، ہر ایک کا ہمزاد منھ چھپاتا، نظریں بچاتا چلا جاتا ہے
بے شکل اور بے آواز، وہ شہروں کی سڑکوں سے گزرتا ہے، سجے ہوئے کمروں اور بیٹھکوں میں وہ مہذب
اور خوش اخلاق بن کر داخل ہوتا ہے
ریلوں کے ڈبوں میں، جہازوں میں، جلسۂ عام میں
مردوں اور عورتوں کے گھروں میں، میز پر، خوابگاہ میں، غرض ہر جگہ، ہر مقام پر
خوش پوشش، تبسم ریز، پر وقار اپنی پسلیوں کے اندر موت کو چھپائے ہوئے اپنی کھوپڑی میں جہنم کی آگ
جلائے ہوئے
لبادوں اور دستانوں کے نیچے، فیتوں اور مصنوعی کاغذی پھولوں کے نیچے
روایات سے ہم آہنگ، اپنے وجود کے بارے میں خاموش اور دم بخود

باقی تمام چیزوں کے بارے میں رطب اللسان

۱۱۔ بڑھے چلو، جنگوں اور حوادث سے کھیلتے ہوئے
منزل کا نام لیا جا چکا ہے، اب اسے منسوخ نہیں کیا جا سکتا

کیا اگلی کوششیں کامیاب ہو چکی ہیں ؟
کون کامیاب ہوا ؟ تم ؟ تمہاری قوم ؟ فطرت !
اب اچھی طرح سمجھ لو، یہ راز ہر چیز میں مضمر ہے کہ ہر کامیابی کی تکمیل سے، جو کچھ بھی حاصل ہو، لیکن ایک نئی اور عظیم تر جدوجہد کا راستہ نکلتا ہے

میرا نعرہ، نعرۂ جنگ ہے، میں بغاوتوں کی پرورش کرتا ہوں
میرے ساتھ جو چلے پوری طرح ہتھیار سے سج کر چلے
میرے ہم سفر کو اکثر بھوک اور افلاس کا منھ دیکھنا ہوگا، اور برافروختہ دشمنوں اور بیوفائیوں سے سابقہ پڑے گا۔

۱۲۔ بڑھے چلو، سڑک سامنے پھیلی ہوئی ہے
یہ محفوظ ہے، میری آزمائی ہوئی ہے — ، میرے قدموں نے اسے بارہا آزمایا ہے — دیر مت کرو
میز پر لکھے کاغذ کو پڑا رہنے دو، الماری میں بے کھلی کتاب کو رکھا رہنے دو۔
اوزار کارخانے میں رہنے دو، روپیہ کمانے کی ضرورت نہیں
اسکول کی عمارت کو کھڑا رہنے دو، استاد کے چلّانے اور پکارنے کی پرواہ مت کرو
واعظ کا وعظ جاری رہنے دو، وکیل کو عدالت میں جرح کرنے دو، اور جج کو قانون کے نکات بیان کرنے دو

ساتھیو، میں اپنا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتا ہوں
میں روپے پیسے سے زیادہ قیمتی محبت تم کو عطا کرتا ہوں
وعظ اور قانون کے جھگڑوں میں پڑے بغیر میں اپنے آپ کو تمہارے حوالے کرتا ہوں

تم کیا اپنے آپ کو میرے حوالے کر دو گے؟ کیا تم میرے ساتھ سفر کرو گے؟
کیا ہم مرتے دم تک ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے؟

قابلِ رحم قوم

میرے دوستو اور میرے ہمراہیو

قابلِ رحم ہے وہ قوم جس کے پاس عقیدے تو بہت ہیں لیکن دل ایمان سے خالی ہے۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جو ایسے کپڑے پہنتی ہے جس کو اس نے خود نہیں بُنا ہے۔ ایسی روٹی کھاتی ہے جس کے لئے اُس نے خود گیہوں نہیں اُگایا ہے، اور ایسی شراب پیتی ہے جسے خود کشید نہیں کیا ہے۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جو دھوکہ دینے والے کو ہیرو بنا لیتی ہے اور چمکتے ہوئے اسلحہ سے مزین فاتح کو دریا دل سمجھتی ہے۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جو ہوس سے خوابوں میں تو نفرت کرتی ہے لیکن بیداری میں اُس کا شکار ہو جاتی ہے۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جو جنازوں کے جلوس کے علاوہ اور کہیں اپنی آواز بلند نہیں کرتی، اپنے ویران کھنڈروں کے سوا اور کسی مقام پر فخر کا اظہار نہیں کرتی اور اُس وقت تک بغاوت نہیں کرتی جس وقت تک اس کی گردن قاتل کی تلوار کے نیچے نہیں آجاتی۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جس کے لیڈر لومڑی کی طرح مکار ہیں، جس کے فلسفی صرف بازی گر ہیں اور جس کا فن صرف بھانڈوں اور نقالوں کا فن ہے۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جو اپنے نئے حکمرانوں کا استقبال باجے بجا کر کرتی ہے اور انھیں آوازے کس کے رخصت کرتی ہے تاکہ پھر باجے بجا کر کسی نئے حکمران کا استقبال کر سکے۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جس کے اہلِ دانش کو ماہ و سال نے گونگا بنا دیا ہے، اور جس کے سورما ابھی گہوارے میں پل رہے ہیں۔

قابلِ رحم ہے وہ قوم جس کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور ہر ٹکڑا اپنے آپ کو ایک قوم سمجھ رہا ہے۔"

خلیل جبران

سیّد احتشام حسین

ہم صفیرِ انقلاب ۔ مخدوم

کبھی شاعر اپنی شاعری سے پہچانا جاتا ہے اور کبھی شاعر کی ذات اور شخصیت اس کی شاعری کے سمجھنے میں معین ہوتی ہے۔ دونوں کا رشتہ اتنا گہرا اور پیچیدہ ہے کہ انہیں مکمل طور سے الگ کر کے دیکھا ہی نہیں جا سکتا۔ پھر بھی موجودہ عہد کے بعض نقادوں کا مطالبہ ہے کہ شاعری کو محض شاعری کی حیثیت سے دیکھنا چاہیئے رہا اسے اس کے خالق کے ذریعہ نہیں، اُن ملفوظی علامتوں کے ذریعہ پہچاننا چاہیئے جو شعر کے روپ میں ڈھل گئی ہیں۔ معمولی، سطحی اور لذّیاتی مطالعہ میں تو یہ بات کچھ دیر کے لئے ممکن ہے لیکن شاعری کی تہوں کو کھولنے، اس کی معنوی خصوصیتوں کو سمجھنے، اس کے فنّی محاسن اور معائب کا اندازہ لگانے، اس کی قدرتوں اور امتیازی کیفیتوں سے لطف اندوز ہونے میں شاعر کی ذات، اس کے ذہن، اُس کے نفسیاتی اور سماجی رجحانات، اس کے شعور اور جذباتی محرکات سے واقف ہوئے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ مطالعہ کی مختلف سطحوں پر شاعر یا شاعری کو علاحدہ علاحدہ پرکھا جا سکتا ہے لیکن یہ مطالعہ ہر حال میں ادھورا اور یک طرفہ ہی رہے گا۔ تخلیق کی عظمت میں خالق کی عظمت پوشیدہ ہے کیونکہ عملِ تخلیق کی ہر منزل پر دونوں ساتھ ساتھ رہے ہیں، ایک سے دوسرے کا پتہ ملتا ہے۔ شاعری اگر انکشافِ ذات ہے تو ذات سے حجابات کا اٹھانا ضروری ہے۔ یقیناً روایتی اور میکانکی انداز کی شاعری پر اس حقیقت کا اطلاق نہیں ہوگا کیونکہ ایسی صورت میں ہنر سینہ خراشی کا مطالبہ نہیں کرتا لیکن جذبہ اور ذہن میں کرید پیدا کرنے والی شاعری خیالوں کو شاعر کی طرف موڑ دیتی ہے۔ کوئی نظم کیوں کہی گئی۔ کن حالات میں کہی گئی، کہنے والے کی ذات اور خیالات سے اس کا کیا تعلق ہے۔ اس کی تاثیر کا کیا راز ہے۔ اس میں کس حقیقت کا اظہار ہے۔ یہ دوسروں کی ایسی ہی نظموں سے مختلف کیوں معلوم ہوتی ہے۔ اس طرح کے ہر سوال کا جواب شاعر کے حالات، ماحول، مشاہدہ، مطالعہ، شعورِ فن اور جذبۂ اظہار اس میں ملے گا۔ یہی بات مخدوم محی الدین کی شاعری کے لئے بھی درست ہے۔ شاعری ان کی پوری زندگی کی مظہر نہیں ہے لیکن جتنی ہے وہ ان کے "دامِ تمنّا میں کسی" صید زبوں کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ شعورِ حیات کی جیتی جاگتی تصویر اور فکر و عمل کی سچی ترجمان ہے۔

شاعری ذات اور کائنات کی دریافت کا عمل ہے اور دونوں صورتوں میں انتخاب کی باگ ڈور شاعر ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے اس طرح یہ کہہ سکتے ہیں کہ شاعر مکمل طور سے ماحول کا مجبور ترجمان نہیں ہے۔ ذات کی حد تک تو یقیناً نیم شعوری عمل

ی کی کارفرمائی بھی جاری رہتی ہے لیکن اپنی ذات کی باہر کی دنیا سے اپنا رشتہ قائم کرتے وقت شاعر بہت کچھ شعور سے کام لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کی آزادی یہی ہے کہ وہ سماج کے متصادم اور پیچیدہ مظاہر میں سے کسی کے ساتھ اپنی ذات کا رشتہ قائم کرے، یہی نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ مشکل یہ پیش آتی ہے کہ وہ اس کا اظہار اپنے فن میں کس طرح کرے۔ ہر فنکار کی طرح ابتدا میں مخدوم کو بھی سادہ عاشقانہ یا جذباتی اور ذہنی تجربات کو پیش کرنے میں کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ ان کا ذوق اور علمی سرمایہ، جوانی کا محدود مشاہدہ اور شوق اظہار اس شاعری کے لئے کافی تھا جس کے نمونے طور، ساگر کے کنارے، تلنگن، لمحہ رخصت، جوانی، سجدہ، یاد ہے، وغیرہ میں مل جاتے ہیں۔ ایسی نظمیں تقریباً ہر نوجوان شاعر کہہ لیتا ہے کیونکہ یہ تجربے عام ہیں لیکن اسی دور میں (جو غالباً ۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء ہوگا) ان کی بعض نظمیں ایک ایسی گونج بھی پیدا کرتی ہیں جس میں تھوڑی بہت انفرادیت ہے جیسے پچھلے پہر کے چاند سے، انتظار، برسات اور میں۔ اس زمانہ میں مخدوم نے ٹیگور اور ورڈسورتھ کو بھی پڑھا تھا ممکن ہے کہ ان کے ذہن نے ان شعرا کے اثرات بھی قبول کئے ہوں۔ اس طرح ان کے پہلے مجموعہ سرخ سویرا (۱۹۴۴ء) کی ابتدائی نظمیں ایک ایسے شاعر سے روشناس کراتی ہیں جو اپنی ذات، محبوب کی ذات اور دونوں کو مسرور و سرشار کرنے والی فطرت کی رنگینیوں میں کھویا ہوا ہے۔ رات کی تنہائیوں میں محبوبہ کے بت بنا کر پوجتا اور فردوس خیالی میں گیتوں کے جال بنتا ہے کہ یہی اس کی دنیا ہے یا یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ یہی اس کی دنیا کا سب سے بڑا سانحہ ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ وہ زندگی کے ہنگاموں سے یکسر بے خبر ہے لیکن اس کے خیالوں کا مرکز خود اس کی ذات ہے اور وہ مخصوص کیفیات جو اس ذات سے وابستہ ہیں رومانیت کا فطری انداز، جوانی کے تقاضے، ٹیگور اور ورڈسورتھ سے دلچسپی کا نتیجہ یہ تھا کہ حقیقتوں کو تخیل کی راہ سے پانے کا رجحان نمایاں ہوگیا یہاں تک کہ جب ہندوستان کی سیاسی جدوجہد نے بغاوت کی راہ دکھائی تو اس میں بھی تخیلی اور جذباتی وخود اظہار پر حاوی ہے۔ وہ نظم جس کا عنوان باغی ہے قطعاً اسی سلسلہ کی ایک کڑی معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی خود پرستاری ایک خام کار سیاسی ذہن پر چھائی ہوئی ہے اور اظہار کو غصہ اور جوش میں تبدیل کر دیتی ہے اس موضوع پر جوش، احسان دانش، مجاز، سردار جعفری سبھی کی ابتدائی نظمیں شعور پر جذبہ کے غلبہ کی غماز ہیں۔ اس ی نفسیاتی اور سیاسی توجیہہ کچھ ایسی مشکل نہیں ہے۔ اشارہ صرف اس بات کی طرف کرنا ہے کہ ذہن ارتقا کی اس نزل میں فکری، فنی پختگی کی جستجو تحصیل حاصل ہے تاہم جو چیز نمایاں ہے وہ ایک خاص قسم کا صحت مند جذباتی توازن ہے جو عمر کی فطری کیفیات سے ہم آہنگ کہا جا سکتا ہے۔

آج ہندوستان کی ترقی پسند ادبی تحریک کے جائزے میں اس کے ہم نوا اور مخالف دونوں الجھی الجھی باتیں رہے ہیں، دونوں فریق یہ بھول گئے ہیں کہ وہ تحریک ہندوستانی اور عالمی کشمکش حیات کا ایک منطقی اظہار تھی ر زندگی میں ہر طرح کے انفرادی اور اجتماعی جبر کے خلاف حشر انگیز صدائے احتجاج تھی، شعر و ادب کی دنیا میں ضمیر کی ہ آواز تھی جو حق، انصاف اور ارتقا کے لئے بلند ہوئی تھی۔ اسے ہر حساس انسان نے اپنے طرف کے اور ہر ادیب اور ر نے اپنے شعور کے مطابق قبول کیا تھا۔ یہ عالمی سطح پر آزادی مساوات اور ترقی کا پرچم بلند کرنے کی وہ کوشش تھی جس کے

ترقی پسند ادب نے بھی اپنی بقا کے لئے مفید پایا اور اس کے ذریعہ سے بھی زبانوں اور ملکوں کے ادیبوں کو ایک عالمی انسانی نصب العین کے لئے جدوجہد کرنے پر اکسایا۔ اس لئے آج جو کچھ بھی کہا جائے اس صدی کی تیسری دہائی میں اس کی آواز ہر آواز پر بالا تھی اور اکثر ذہین ادیب اور انسان دوست دانشور اس میں اپنے درد کا مداوا اور اپنی تخلیقی لگن کے لئے سازگار فضا پاتے تھے۔ اسی وجہ سے اردو کے بیشتر ادیب یا تو اس تحریک سے وابستہ ہوگئے یا اس سے متاثر ہوئے۔ مخدوم، جن کے سیاسی اور سماجی شعور کی ابتدا ہو چکی تھی۔ جنھوں نے فاشزم کے گھناؤنے پن کا ذکر اپنی نظم جنگ میں کیا تھا، ترقی پسند تحریک میں اپنی شعوری قوت سے شریک ہوگئے۔ اس کے پہلے اثرات مشرقی اور موت کا گیت نامی نظموں میں ظاہر ہوئے جہاں شعور محض جذبے پر غالب ہے اور گہرے تاثرات کے اظہار سے فن کی جلا ہو رہی ہے۔ تبدیلی کے اس عمل میں دوسری جنگ عظیم نے نہ صرف اور تیزی پیدا کردی بلکہ غور و فکر اور شعور فن کے نئے راستے کھول دئے۔ کوئی شاعر اپنی ذات کو نظر انداز کرکے تخلیق تو کرہی نہیں سکتا، ہاں ذات سے ماحول اور کائنات کے رشتوں کو نئی طرح جوڑ کر اظہار ذات کے طریقوں کو نیا فنی پیکر عطا کر سکتا ہے۔ مخدوم نے بھی یہی کیا، کبھی آزادی وطن کے سپاہی کے روپ میں، کبھی مستقبل کے خواب دیکھنے والے کے بھیس میں اور کبھی کٹھن راہوں پر چلنے والے مسافر کی شکل میں اپنے ہی کو دیکھا کیونکہ وہ اپنی شاعری کو اپنی زندگی کے وسیع تر مقصد اور عظیم تر نصب العین سے ہم آہنگ بنانا چاہتے تھے۔ وقت انہیں بدل رہا تھا اور وہ اسے اپنی شاعری میں قید کرنا چاہتے تھے۔

عقیدے اور فن کے باہمی تعلق پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے اسے دہرانے کی ضرورت نہیں ہے پھر بھی اتنا کہنا ضروری ہے کہ اچھے شاعر اور اچھے ادیب کی راہ میں عقیدہ رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ اکثر اسے قوتِ اظہار بخشتا ہے۔ نہ تو کسی سیاسی یا فلسفیانہ عقیدہ رکھنے والے پر یہ پابندی عائد کی جا سکتی ہے کہ وہ ایوانِ ادب میں داخل ہی نہ ہو اور نہ کسی کو یہ حکم دیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی شاعری میں کسی عقیدہ یا نظریہ کا اظہار ہی نہ کرے، زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ادبی تخلیقات کو پرکھتے وقت بھی فن کی وہی کسوٹی استعمال کی جائے جو کسی شاعر یا ادیب کے لئے کی جاتی ہے۔ تجربوں کی صداقت اور جذبات کی قدر و قیمت کی پرکھ، الفاظ کی معنوی حیثیت، زبان و بیان کی قوتِ اظہار، ہر چیز پر نگاہ رکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ترقی پسندی کسی طرح فنکاری کو نقصان نہیں پہونچاتی۔ ادبی حسن کی کمی اور فنی خامیاں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند دونوں کے یہاں ہو سکتی ہیں۔ اس بہ ظاہر غیر ضروری بحث کا مطلب صرف یہ ہے کہ مخدوم کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس حقیقت کا علم ہونا ضروری ہے کہ وہ مارکسی نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ عملی سیاست میں کمیونزم کی حمایت کرتے ہیں، اس کی اشاعت اور تبلیغ سے کسی وقت غافل نہیں ہیں۔ اس کی صداقت اور حق پسندی پر ان کا اس طرح ایمان ہے کہ وہ اس سے انحراف کو گمراہی سمجھتے ہیں۔ ایسی صورت میں یہ سوچنا بالکل عبث ہوگا کہ ان کی شاعری کی پرکھ میں ان حقائق کو نظر انداز کر دیا جائے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس نظریہ سے وابستگی نے ان کی تخلیقات کو قوت بخشی یا نقصان پہونچایا۔

جب دوسری جنگ ۱۹۳۹ء میں چھڑی تو نہ صرف دنیا کے ترقی پسندوں نے بلکہ ہر طرح کے صاحبان ہوش نے یہی سمجھا کہ یہ بڑی بڑی طاقتوں کے درمیان اقتدار کی جنگ ہے اور غلام ممالک اس کی بھٹی میں اپنے آقاؤں کا وقار قائم رکھنے کے لئے جھونکے جا رہے ہیں، پھر جب اس جنگ کی نوعیت بدلی اور وہ کھلم کھلا فاشزم کے دنیا پر مسلط کر کے رہی سہی جمہوریت کے ختم کر دینے کی جنگ بن گئی تو انسانیت کے مستقبل کے نقطۂ نظر سے ترجیحات میں تبدیلی ہو گئی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ گناہگاروں کے گناہ دھل گئے اور سامراجی جمہوریت نواز بن گئے بلکہ اضافی حیثیت سے بڑے اور چھوٹے خطروں سے باری باری نجات حاصل کرنے کا سوال پیدا ہو گیا۔ مخدوم نے جنگ کے ان دونوں اَدوار میں نظمیں لکھیں، ان میں نہ تو اپنے عقائد سے انحراف کیا اور نہ اس بات کو بھولے کہ ان کی شاعری شعور کے افق کو وسیع کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ اس لئے سپاہی اور جنگ آزادی دونوں کے لئے وجہ جواز نکل آتی ہے۔ دونوں نظمیں پُر اثر، مترنم، پُر جوش اور سادگی کے باوجود پُرکار ہیں، دونوں میں ایسا غنائی حسن پیدا ہو گیا ہے جو اُن دلوں کے علاوہ ہر دل کو متاثر کرے گا جنہیں ان سیاسی تصورات ہی سے اختلاف یا نفرت ہے۔ اسی سلسلہ کی کڑی انقلاب ہے جو شاعری اور سیاست، اظہار اور عقیدت کا خوبصورت سنگم ہے۔ اس میں آفاقی انسان کی وہ تمنا ابھر کر سامنے آگئی ہے جو بہتر سے بہتر کی جستجو میں اسے بے چین رکھتی ہے اور وہ تبدیلی اسی لئے چاہتا ہے کہ دنیا سوگوار نہ رہے، کلی کا غم اور ذروں کی پریشانی دور ہو، مسموم ہواؤں کا چلنا بند ہو، حیات بخش ترانے آزاد ہوں، ذہن کے سودائے خام اور توہمات کی غلامی ختم ہو، قبائے سیم و زر سے آزادی ملے اور شمیم عدل سے کوچہ و گلزار مہکیں۔ اگر یہ محض سیاسی تبلیغ ہے تو سوال پیدا ہوگا کہ انسانی تمنا اور کیا ہوگی!

اسی دور میں مخدوم نے استعاروں اور علامتوں کی قوت بھی پہچانی اور ان سے کام لے کر اظہار کے ذرائع کو اور وسیع کر دیا۔ اس طریق کار کا فائدہ یہ ہے کہ اگر علامتیں شاعرانہ شعور سے چنی جائیں تو خیالات اور تصورات میں زیادہ توانائی اور گہرائی پیدا ہو جاتی ہے اور زبان کا استعمال نئی معنویت کا حامل ہو جاتا ہے۔ سرخ سویرا کے دور میں اس کی طرف توجہ کم تھی لیکن پھر بھی حویلی، روح مغفور، قمر اور اندھیرا اس طرز اظہار کی خوبصورت مثالیں ہیں۔ یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ پہلی نظم جس میں مخدوم نے آزاد نظم کی تکنیک سے کام لیا وہ اندھیرا ہے جس میں جنگ کے ہولناک اثرات کی موثر تصویریں ہیں۔ نظم مثنوی اور مقفی انداز میں شروع ہوتی ہے، جذبۂ اظہار کی شدت سے مصرعے ٹوٹتے ہیں اور روانی میں اضافہ ہو جاتا ہے یہی کیفیت ان کی مشہور نظم اسٹالین میں بھی نظر آتی ہے۔

سرخ سویرا میں تو تقریباً ۱۹۴۳ء تک کی نظمیں شامل ہیں، پھر دوسرا مختصر مجموعہ گل تر سولہ سترہ سال بعد ۱۹۶۱ء میں نکلا، ایک بدلے ہوئے رنگ میں۔ مجموعوں کے ناموں کا فرق بھی بہت کچھ کہتا ہے اور خود مخدوم کے خیالات گل تر کے دیباچہ (پڑھنے والوں سے) میں مل جاتے ہیں۔ اس مجموعہ میں اگر ایک نظم ۱۹۴۸ء کی اور دو نظمیں ۱۹۴۷ء کی شامل نہ کرلی گئی ہوتیں تو یہ مکمل طور پر اُن کے دس سال کے ذہنی اور فنی ارتقاء کی تصویر ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں عملی شرکت، قید اور روپوشی کی وجہ سے انہوں نے ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۵ء تک انہوں نے بہت

نظمیں لکھیں۔ اس زمانے کی نظموں میں قید سب سے زیادہ متوجہ کرتی ہے کیونکہ اس کا تخیلی عنصر مخدوم کے ماضی اور حال دونوں
کو یکجا کر دیتا ہے۔ لیکن قبل اس کے کہ گلِ تر کی بعض نظموں کے متعلق کچھ کہا جائے مخدوم کے ان خیالات پر ایک نظر ڈال لینا
مفید ہوگا جو انہوں نے کتاب کے شروع میں ظاہر کیے ہیں کیونکہ اُن سے طرزِ اظہار کے نئے پن کے سمجھنے میں مدد ملے گی
انہوں نے لکھا ہے کہ عمر، تجربہ اور زمانے کی نوعیت بدل جانے کی وجہ سے خود ان کی شاعری میں ایک نیا رنگ ابھر آیا
ہے۔ پرانے رنگ سے اور نئے رنگ میں جو قدر مشترک ہے وہ " انسان دوستی اور سمٹا ہوا جمالیاتی اثر" ہے انسان
دوستی تو واضح ہے لیکن سمٹے ہوئے جمالیاتی اثر سے مراد غالباً علامتوں اور استعاروں، مترنم بندشوں کا وہ استعمال
ہے جس کا آغاز سرخ سویرا میں ہو چکا تھا۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ " زمان و مکان کا پابند ہونے کے باوجود شعر
بے زماں (Timeless) ہوتا ہے اور شاعر اپنی ایک عمر میں کئی عمریں گزارتا ہے۔ سماج کے بدلنے کے ساتھ ساتھ
انسانی جذبات اور احساسات بھی بدلتے جاتے ہیں مگر جبلتیں برقرار رہتی ہیں۔ تہذیب، انسانی جبلتوں کو سماجی تقاضوں
سے مطابقت پیدا کرنے کا مسلسل عمل ہے۔ جمالیاتی حس انسانی حواس کی ترقی اور نشوونما کا دوسرا نام ہے۔ اگر انسان
کو سماج سے الگ چھوڑ دیا جائے تو وہ ایک گونگا وحشی بن کر رہ جائے گا جو اپنی جبلتوں پر زندہ رہے گا۔ فنونِ لطیفہ انفرادی
اور اجتماعی تہذیبِ نفس کا بڑا ذریعہ ہیں جو انسان کو وحشت سے شرافت کی بلندیوں پر لے جاتے ہیں"۔ یہاں شاید
جبلت کا لفظ کچھ الجھن پیدا کرے کیونکہ اسی لفظ کا سہارا لے کر انسان کو درندہ اور تہذیبی ارتقا کو محض وقتی
ملمع کاری قرار دیا گیا ہے لیکن غالباً مخدوم نے اسے اس مفہوم میں استعمال نہیں کیا ہے بلکہ اس سے فطرت کی
وہ ابتدائی منزل مراد ہے جسے جمالیاتی عمل سے تہذیب یافتہ بنایا جاتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ کیوں کہتے کہ
وہ انسان جسے سماجی ارتقا میں شریک ہونے کا موقع نہیں ملتا وہ محض اپنی جبلتوں پر زندہ رہتا ہے۔ حقیقتاً
ان کا مقصد یہی ہے کہ جس طرح انسان سماجی عمل میں شریک ہو کر زمانے کو بدلتا ہے اسی طرح وہ خود بھی بدل
جاتا ہے اور اظہار کی نئی ٹکنیک دریافت کر کے اپنے خیالوں کو نئی طرح پیش کرتا ہے۔ یہ صورت سیدھے
سپاٹ طریقے سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ نفس کے اندر اور مادی دنیا میں زبردست کشمکش جاری رہتی ہے۔ یہی کشمکش
تخلیقی قوتوں کو مہمیز کرتی ہے۔ تخلیقِ فن کا یہ نظریہ شاعر کے دل کے اندر جاری رہنے والی جنگ اور کائنات
سے اپنا رشتہ استوار کرنے کی جدوجہد، دونوں کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے کیونکہ اسی طرح لڑتا جھگڑتا آخر کار
شاعر اپنے زخموں اور گیتوں کے ساتھ باہر آتا اور انسانی بھیڑ میں شامل ہو جاتا ہے۔ شروع میں جو یہ بات کہی گئی تھی کہ مخدوم
کی شاعری اُن کی زندگی کی مظہر ہے اس کا یہی مطلب تھا۔ شروع کی سادہ نگاری اور بعد کی علامتی شاعری کے اندرونی
ربط کا سلسلہ شعور کے وسیع اور عمیق تر ہونے سے مل جاتا ہے۔ اس بات کو مخدوم نے خود بھی اس طرح ظاہر کیا ہے
" شاعر اپنے دل میں چھپی ہوئی روشنی اور تاریکی کی آویزش کو اور روحانی کرب و اضطراب کی علامتوں کو اجاگر کرتا
اور شعر میں ڈھالتا ہے۔ اس عمل سے تضادات تحلیل ہو کر تسکین و طمانیت کے مرکب میں تبدیل ہو جاتے ہیں

شاعر بہ حیثیت ایک فرد معاشرہ، حقیقتوں سے متصادم اور متاثر رہتا ہے۔ پھر وہ دل کی جذباتی دنیا کی خلوتوں میں چلا جاتا ہے، روحانی کرب و اضطراب کی بھٹی میں تپتا ہے، شعر کی تخلیق کرتا ہے اور داخلی عالم سے نکل کر عالم خارج میں واپس آتا ہے تاکہ نوع انسانی سے قریب ہو کر ہم کلام ہو۔ باہمہ اور بے ہمہ کا یہی وہ نکتہ ہے جسے زوال یافتہ ادیب انا اور انفرادیت سے تعبیر کرتا ہے۔"

عمل تخلیق کے اس واضح اعلان میں انکشاف ذات کے جس نئے پہلو کی نشاندہی کی گئی ہے وہ بہت غور طلب ہے اس میں اُن نئے شاعروں کے لئے بھی غور و فکر کا سامان ہے جو مانگے کے اجالے اور فرضی نفسیاتی کیفیات کے اظہار کو تخلیق کی آخری منزل سمجھتے ہیں۔ مخدوم فن اور عقیدہ دونوں کے باطنی رشتہ سے واقف ہیں اس لئے انہیں ڈوب کر ابھرنے میں دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ گلِ تر کی اکثر و بیشتر نظمیں اور غزلوں کے بہت سے اشعار اسی جہد حیات کی علامتی تصویریں ہیں۔ اگر چارہ گر محبت کے سماجی پہلو کی عکاس ہے تو آج کی رات نہ جا اپنی ذاتی خواہش کی ترجمان۔ پہلی نظم کا انفرادی پہلو محبت کے سماجی المیہ کی تنقید اور تفسیر ہے دوسری نظم کا سماجی پہلو یہ ہے کہ فرد کو محبت کی بیکراں کیفیت سے لطف اندوز ہونے کا حق اور موقع ملتے رہنا چاہیئے۔ انکشاف ذات اور درد کائنات بالکل الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ زندگی کا صحت مند نقطۂ نظر اور شعور فن چاہیئے، زندگی کے تجربے، واقعات کو اُن کے پس منظر میں سمجھنے کی صلاحیت، خواہش اور حقیقت کی کشمکش، جدت اظہار کی خواہش، یہ تمام چیزیں فنی شعور کو بھی وسعت عطا کرتی ہیں اور طرز ادا میں خاص قسم کی تبدیلی نظر آنے لگتی ہے۔ اس لئے اگر گلِ تر کی نظمیں سرخ سویرا کی نظموں سے مختلف معلوم ہوتی ہیں تو کوئی تعجب نہیں، دیکھنا یہ ہے کہ نفس مضمون اور جمالیاتی اظہار کے لحاظ سے یہ تبدیلی کس حد تک ترقی اور قدرت بیان کا پتہ دیتی ہے۔ اس مجموعہ میں غزلوں کے علاوہ چارہ گر، آج کی رات نہ جا، رقص، چاند تاروں کا بن، جانِ غزل، پیار کی چاندنی اور چپ نہ رہو خاص توجہ کی مستحق ہیں کیونکہ ان کا علامتی حسن اور جمالیاتی انداز ہی نہیں۔ ان کے بنیادی موضوعات بھی مخدوم کے نظریۂ حیات اور ارتقائے فکر پر روشنی ڈالتے ہیں۔ سرخ سویرا کی نظموں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے کہا تھا کہ مخدوم کے یہاں ایک صحت مند جذباتی توازن ہے جو عقیدے کی گرمی سے پیدا ہوا ہے۔ اس کی ایک روشن مثال چاند تاروں کا بن ہے۔ اس مختصر نظم کے تینوں حصے کم سے کم جگہ میں بہت سے حقائق کو سمیٹ لیتے ہیں اور اندھیروں سے گذرتے ہوئے مستقبل پر نگاہیں جمائے رہتے ہیں۔ اس نظم کے لفظ لفظ میں علامتی تاثر اور فکری گہرائی نے قوت پیدا کر دی ہے۔ آزادی سے پہلے کی تشنگی اس تشنگی سے مختلف تھی جو آزادی کے بعد پیدا ہوئی بیرونی سیاست نے آزادی کی روشنی کو تاریکی میں کس طرح بدل دیا اس کا لطیف بیان اظہار کا معجزہ معلوم ہوتا ہے۔

کچھ امامانِ صد مکر و فن

ان کی سانسوں میں افعی کی پھنکار تھی

ان کے سینے میں نفرت کا کالا دھواں

اک کمیں گاہ سے

پھینک کر اپنی نوک زباں

خون نور سحر پی گئے

اس طرح صبح آزادی طلوع ہونے کے باوجود اندھیرے کی تلچھٹ رہ گئی اور صبح کے لئے جدوجہد کے دروازے کھلے رہ گئے۔ شاعر کو دکھ ہوا لیکن مایوسی نے اسے پسپا نہیں کیا، اس نے چاروں طرف دیکھ کر اپنے ہمدموں کو پھر للکارا کہ آخری حملہ کر کے اس اندھیرے کی دیوار کو بھی ڈھا دیا جائے۔

ہمدمو

ہاتھ میں ہاتھ دو

سوئے منزل چلو

منزلیں پیار کی

منزلیں دار کی

کوئے دلدار کی منزلیں

دوش پر اپنی اپنی صلیبیں اٹھائے چلو ا

اس طرح کی نظموں میں خیال اظہار سے اس طرح دست و گریبان ہو جاتا ہے اور علامتی الفاظ حقائق کو اس طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں کہ انہیں الگ الگ کر کے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی کیفیت اُن کی اس مختصر نظم چپ نہ رہو میں بھی ہے جو لومبا کے وحشیانہ قتل پر لکھی گئی آزادی وطن کا وہ حامی سامراجی سازش کا شکار ہو گیا، اس سازشی ماحول، قید و بند، دار و رسن، گی، المناکی کی مرقع کشی چند الفاظ میں کرنے کے بعد مخدوم نے پھر انسانی ضمیر کو امید کی کرنوں سے چھوا ہے تاکہ پھر ایسی ناپاک سازشیں اور ایسے بے گناہ قتل نہ ہو سکیں۔

اور اونچی ہوئی صحرا میں امیدوں کی صلیب

اور اک قطرۂ خوں چشم سحر سے ٹپکا

جب تلک دہر میں قاتل کا نشاں باقی ہے

تم مٹاتے ہی چلے جاؤ نشاں قاتل کے

روز ہو جشن شہیدانِ وفا چپ نہ رہو

بار بار آتی ہے مقتل سے صدا چپ نہ رہو، چپ نہ رہو

میں نے جان بوجھ کر دو ایسی نظموں کا انتخاب کیا ہے جن کو عام طور سے سیاسی نظمیں کہا جائے گا تاکہ عقیدہ اور شاعری کے اس باہمی ربط کا اندازہ ہو سکے جو تخلیق کا کرب بن کر شعر کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے اور

ایسی نظموں کو کسی طرح دوسرے موضوعات پر اس طرح لکھی ہوئی نظموں سے کمتر درجہ کا قرار نہیں دیا جا سکتا۔

مخدوم کی نظموں میں جو غنائیت اور صوتی آہنگ کا حسن ہے اس نے گل تر میں کمال کی جانب قدم بڑھائے ہیں جو نکہ زبان اور خیال دونوں پر قدرت نہ ہو خوبصورت شاعرانہ ہیئت وجود میں نہیں آتی اگرچہ انہیں پوری طرح ریاضت کا موقعہ نہیں ملا لیکن پھر بھی مخدوم نے ان خامیوں پر قابو پا لیا ہے جو ابتدائی نظموں میں جگہ پا جاتی تھیں غنائیت اور ایمائی انداز بیان غزل کا جوہر ہے۔ جب مخدوم کو ان پر دسترس حاصل ہو گئی تو انہوں نے غزل گوئی کی طرف بھی توجہ کی۔ پہلا مجموعہ غزلوں سے بالکل خالی تھا لیکن گل تر تقریباً آدھا حصہ اسی صنف پر مشتمل ہے۔ ان میں بھی مخدوم نے غزل کی روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنے انداز فکر کو برقرار رکھا ہے اور ایسے شعر کہے ہیں جو ان کی تمام خصوصیتوں کے حامل ہیں جیسے

تیرے دیوانے تری چشم و نظر سے پہلے — دار سے گزرے تیری راہ گزر سے پہلے

یہ کوہ کیا ہے، یہ دشت الم فزا کیا ہے؟ — جو اک تری نگہہ دل نواز ساتھ رہے
قدم قدم پہ اندھیروں کا سامنا ہے یہاں — سفر کٹھن ہے دم شعلہ ساز ساتھ رہے

اٹھو کہ فرصت دیوانگی غنیمت ہے — قفس کو لے کے اڑیں، گل کو ہم کنار کریں

تحفۂ برگ گل و باد بہاراں لے کر — قافلے عشق کے نکلے ہیں بیابانوں سے

ہجوم بادہ و گل میں، ہجوم یاراں میں — کسی نگاہ نے جھک کر مرے سلام لئے
کسی خیال کی خوشبو کسی بدن کی مہک — در قفس پہ کھڑی ہے صبا پیام لئے
مہک مہک کے جگاتی رہی نسیم سحر — لبوں پہ یار مسیحا نفس کا نام لئے

ساز آہستہ ذرا گردش جام آہستہ — جانے کیا آئے نگاہوں کا پیام آہستہ
چاند اترا کہ اتر آئے ستارے دل میں — خواب میں ہونٹوں پہ آیا ترا نام آہستہ

وا ہو رہی ہے میکدۂ نیم شب کی آنکھ — انگڑائی لے رہا ہے جہاں دیکھتے چلیں

منزلیں عشق کی آساں ہوئیں چلتے چلتے — اور چمکا ترا نقش کف پا آخر شب

آج تو تلخی دوراں بھی بہت ہلکی ہے — گھول دو ہجر کی راتوں کو بھی پیمانوں میں

اسی ادا سے اسی بانکپن کے ساتھ آؤ — پھر ایک بار اسی انجمن کے ساتھ آؤ
ہم اپنے ایک دل بے خطا کے ساتھ آئیں — تم اپنے محشر دار و رسن کے ساتھ آؤ

یہ اشعار تغزل اور معنوی حسن سے بھرپور ہیں۔ اپنے جمالیاتی اظہار کے ذریعہ زندگی کے ان حقائق سے محبت پیدا کراتے ہیں جنہیں شاعر عزیز رکھتا ہے شاعر اور قاری کے درمیان مفاہمت اور یگانگت کا یہ رشتہ اظہار کی گہرائی اور بیان کی گہرائی سے پیدا ہوتا ہے۔ مخدوم اس میں اکثر و بیشتر کامیاب ہیں۔

تنقید و تبصرہ

"ابھی تنقید اس صاف گوئی کے بغیر ممکن نہیں جو نہ صرف مشرقی مزاج کے خلاف پڑتی ہے بلکہ انسانی نفس کے خلاف بھی۔ لیکن دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے جہاں اور بہت سی انسانی کمزوریوں پر فتح پائی ہے وہاں اس کمزوری پر بھی غالب آئی ہیں جو بے لاگ تنقید سننے اور سہنے میں مانع آئی ہے۔ اپنے افکار و اعمال پر بے لاگ تنقید سُننا بڑے دل گُردے کی بات ہے۔ لیکن جب تک کسی جماعت یا قوم کے افراد اپنے سینوں میں بے لاگ تنقید سننے اور سہنے والے دل گُردے پیدا نہیں کرتے اُن کی ترقی یا تو بہت سست رفتار ہوتی ہے یا معرضِ التوا میں پڑی رہتی ہے۔"

نظیر صدیقی

تین تنقیدیں

میرے سامنے تنقید کی تین کتابیں ہیں۔ ان میں سے دو کتابیں ایسے ادیبوں اور شاعروں کی تصنیف ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی زمانے میں کسی نہ کسی حیثیت سے ترقی پسند تحریک و تنظیم سے بھی تھا اور جواب اس سے قطعی طور پر لاتعلق ہیں یا ظاہر کرتے ہیں۔ میرا اشارہ باقر مہدی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کی طرف ہے۔ جن کی بالترتیب تصنیفات "آگہی و بے باکی" اور "زاویۂ نگاہ" میرے سامنے ہیں۔ تیسری کتاب پاکستان کے بیدار مغز شاعر، نقاد اور انشائیہ نگار ڈاکٹر وزیر آغا کی "اردو شاعری کا مزاج" ہے۔

ہاں تو باقر مہدی اور اعظمی کا تعلق ترقی پسندوں سے تھا۔ یہ بات محض اس وجہ سے کہی گئی ہے کہ میرے نزدیک اس بات کو پیشِ نظر رکھے بغیر ان حضرات کی ادبی اور ذہنی نشوونما اور تنقید کی کسوٹیوں کا گیان ادھورا رہ جائے گا۔ میں تحلیل نفسی اور ذہنی تجزیے کا قائل صرف اسی لئے ہوں کہ اس سے ادیب و شاعر کے رجحانات کے سلسلے میں کیوں؟ اور کیسے؟ کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ زیرِ بحث ادیب، شاعر یا نقاد کی کسوٹیاں کہاں کہاں اس کی ادبی پرکھ، سوجھ، بوجھ اور ادبی ایمانداری اور خلوص کی آئینہ دار ہیں۔ اور کہاں کہاں ذاتی مایوسیوں، خامیوں کچے پن، بے حسی اور مصلحت کوشیوں پر خوبصورت الفاظ، پُر مغز فلسفے اور آتش فشانیوں کی نقابیں پڑی ہوئی ہیں۔

باقر مہدی نے اپنی شناخت مرزا یاس یگانہ چنگیزی کے آئینے میں کی ہے اور اپنی زندگی کا آدرش یگانہ کی شخصیت بلکہ شخصیت کے کج پہلو کو مانا ہے۔ اس بات کا ثبوت اُن کے اشعار بھی مہیا کرتے ہیں اور تنقید بھی۔ باقر خود تک یگانہ سے ہو کر آئے ہیں۔ انھوں نے یگانہ کے ہر پہلو کو دیکھا اور آخر میں اس پہلو کے مرید ہو گئے جہاں یگانہ یوں ملتے ہیں کہ ؎

جیت بھی میری ہے پٹ بھی میری ہے   میں کہاں ہار ماننے والا

میں اپنی اس پرُخلوص رائے کا عکس آپ کو باقر مہدی کی تنقید میں دکھاتا ہوں۔ "آگہی و بے باکی" کا آٹھواں مضمون ہے "اختر الایمان ایک منفرد نظم گو"۔ مضمون پر پڑی ہوئی تاریخ سے معلوم ہوا کہ یہ مضمون ۱۹۵۶ء میں یعنی اس مجموعے کے دسویں مضمون "فیض ایک نیا تجزیہ" سے لگ بھگ نوسال پہلے لکھا گیا تھا۔ دوسرا مضمون ۶۵ء کا ہے۔

پہلے مضمون میں انھوں نے ایک جگہ لکھا ہے۔ " مجھے فیض کے یہاں جو نمایاں خامی نظر آتی ہے، وہ اختر الایمان کے یہاں نہیں ہے۔ فیض کے یہاں ایک خاص قسم کی سطحیت ہے۔ جو نظمیں بار بار پڑھنے کے بعد نظر آجاتی ہے اختر الایمان کے یہاں یہ خامی نہیں ہے، اس کے علاوہ وہ طلادرجہ روایتی شاعر ہیں۔" ایک مضمون اور بھی ہے۔ جس کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ یہ اس مجموعہ کا پہلا مضمون ہے" ترقی پسند شاعری" یہ مضمون ۱۹۵۲ء کا ہے۔ اس میں ایک جگہ لکھا ہے" میں فیض کو بڑا شاعر نہیں مانتا۔ اس لیے کہ فلسفیانہ شعور اور فکری عناصران کے یہاں کم ملتے ہیں۔"

ان جملوں میں جو تضاد چھپا ہے، سردست اسے نظر انداز کر دیجئے اور ۶۵ء والے مضمون کے یہ جملے ملاحظہ فرمایئے۔

"اب بھی فیض کی آواز کانوں کو بھلی لگتی ہے اور دل میں یادوں کا قافلہ رواں ہوجاتا ہے۔ شاید یہی ہے ایک سچے شاعر کی پہچان۔ !"

دیکھیے ہوئی نہ وہی بات۔ حالانکہ معاملہ صرف اتنا تھا کہ باقر مہدی ایک جگہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ اختر الایمان اچھے ہیں۔ عجب اتفاق ہے کہ میں بھی اس مسئلے پر باقر مہدی کا ہم نوا ہوں۔ مگر باقر مہدی کے ساتھ ٹریجڈی یہ ہوئی کہ ان کے دل میں یہ وہم سما گیا کہ ہزاروں دلیلیں دینے کے باوجود وہ اختر الایمان کو اچھا شاعر نہیں ثابت کر پائے ہیں، اس وہم سے چھٹکارا پانے کے لیے انھوں نے فیض کی گردن ماردی اور یہ بھول گئے کہ نوسال بعد انھیں فیض کی گردن سے چھری ہٹانا پڑے گی۔ غلطی یہی تھی۔ فیض اور اختر الایمان اس عہد کے دو اہم نام ہیں۔ مگر ان کے راستے الگ ہیں اور اپنے اپنے راستوں پر دونوں کامیاب ہیں۔

ایک مضمون "ترقی پسند شاعری" بھی دیکھتے چلیے۔ باقر مہدی کہتے ہیں "شاعر کی کسی جماعت سے وابستگی مفید بھی ہے اور ادبی تحریک کی فضا محدود بھی ہوجاتی ہے۔" باقر صاحب یہ تضاد کیوں ہے، کیا اس وجہ سے کہ آپ بھی کسی جماعت سے وابستہ رہ چکے ہیں۔ اور اس "محدودیت" کے ڈر سے اب اس سے الگ ہیں۔ اور اب ان دونوں باتوں کو حق بجانب ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ جس طرح کبھی سیاسی ہونا فیشن ہوتا تھا اور اب غیر سیاسی ہونا، مگر یہ بات اپنی جگہ اٹل ہے کہ زندگی کے مسائل آپ کو کسی نہ کسی مقام پر ایک خاص سیاسی موقف اختیار کرنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔

پھر ایک بات اور بھی ملاحظہ کیجئے۔ باقر مہدی اقبال کو مطعون کر جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عدم منطقیت پر زورِ قلم صرف کر دیتے ہیں۔ مگر آگے چل کر عبدالعزیز خالد کی خالص "اسلامی شاعری" (جس پر غالباً حسن عسکری

کہ جو کچھ ثبت ہے، کو تھوڑا سا الزام دیتے ہوئے، انھیں یک لخت بہت بڑا شاعر تسلیم کرنے لگتے ہیں۔

لیکن یہاں ان مضمونوں کا ذکر نہ کرنا بڑی ناانصافی ہوگی جو بہت اہم ہیں۔ محنت سے لکھے گئے ہیں اور بہت درست ہیں۔ یہ مضامین ہیں۔ "اختر الایمان کی پانچ نظمیں"، "یاس یگانہ پر دونوں مضامین، "بھولا سے تبل تک"، "سعادت حسن منٹو افسانوی کردار، اور مصحفیہ کا زیر لب" ان مضامین میں تنقید کا معیار اور ادبی ایمان داری بہت نمایاں ہیں۔ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ نقاد نے موضوع سے انصاف کیا ہے اور صرف ان مضامین کے سبب ہی اس کتاب کا پڑھنا نہایت ضروری ہے۔

اب ایک قدم آگے بڑھیے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کا "زاویۂ نگاہ" اختلاف کا موضوع ہو سکتا ہے۔ لیکن اس کی انفرادیت کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں۔ تضادات کی کیفیت یہاں بھی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ یہاں آگہی اور بے باکی نے تلخی کی منزل پر قدم نہیں رکھا ہے۔ ذہنی کیفیت خلیل الرحمٰن اعظمی کی بھی تقریباً وہی ہے۔ نہ جانے کن حالات نے ہمارے چند اچھے ادیبوں، شاعروں کو اتنا سہما دیا ہے کہ اب وہ ماضی کے احساس سے بھی گریزاں ہیں۔ وہ ماضی جس میں وہ کبھی برضا و رغبت، بخوشی اور مطمئن ہو کر ایک تحریک سے وابستہ ہوئے تھے۔ اب وہ اس تحریک کو اپنے لئے باعث ننگ سمجھتے ہیں۔ لیکن دوسری طرف یہ احساس بھی ہے کہ اس تحریک میں انھیں کوئی کھینچ کر نہیں لایا تھا، اس لئے وہ اسے یکسر رد کرتے بھی گھبراتے ہیں۔ بس اسی مقام پر قلم کے قدم ڈگمگانے لگتے ہیں۔ یہ فیصلہ نہیں ہو پاتا کہ جو کچھ لکھا جا رہا ہے، وہ قلم کا کام ہے یا چور دل کا۔

پھر بھی مجموعی طور پر خلیل الرحمٰن اعظمی کے ہاں زیادہ کشادہ اور مخلص فضا ملتی ہے۔ مایوسیوں پر انھوں نے بھی اپنی مدافعت کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان کا ذہن کہیں نہیں بگڑتا اور یہ بھی بہت بڑی بات ہے۔

ایک عجیب بات ہے کہ اگر کوئی شاعر بیک وقت شاعر بھی ہو اور نقاد بھی تو اس کے بارے میں متضاد رائیں سننے کو ملیں گی۔ شاعر کہتے نظر آئیں گے کہ وہ بہتر نقاد ہے اور نقاد کہیں گے کہ وہ بہتر شاعر ہے۔ لیکن اگر آپ ایمان کی پوچھیں تو میرے نزدیک خلیل الرحمٰن اعظمی بہتر شاعر ہیں، بہتر نقاد نہیں۔ اگر آپ کو یقین نہ آئے تو آپ "جگر مرادآبادی" پر ان کا مضمون پڑھ ڈالیے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے نیاز کے حملوں سے جگر کو بچانا چاہا۔ لیکن نیاز کی انتہاپسندی کے باوجود تنقیدی توازن خلیل الرحمٰن سے بن نہ پایا۔ وہ جگر کی مدافعت کرتے رہے۔ جگر کے اتنے شعر پیش کیے کہ جگر بھی تھک گئے اور برخوردار کے بازو بھی شل ہو گئے لیکن بات وہیں کی وہیں رہی۔ آخر وقت تک یہ نہ کھلا کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کیا کہنا چاہتے ہیں۔

لیکن پھر، فراق گورکھپوری کا مضمون ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ یہ مضمون بہت اچھا ہے تو گویا خود اپنی تردید کروں گا اور اس مضمون کو کمزور کہوں تو دلائل کہاں سے لاؤں۔ کیونکہ میری زبان تو کوئی بھی یہ کہہ کر پکڑ سکتا ہے کہ فراق کی زندگی میں ان کی شاعری کا حسین ترین انتخاب کرنے والا خلیل الرحمٰن اعظمی سے بہتر شخص نہیں ملے گا۔

یقین نہ آئے تو شاہکارکا فراق نمبر دیکھ لیجئے۔ اس کے علاوہ خود فراق پر یہ مضمون اتنا بھاری ہے کہ اس کے خلاف میری ہر دلیل کمزور ثابت ہو کر رہے گی۔

لیکن میں اپنا تحفظ یہ کہتے ہوئے کر سکتا ہوں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی میرا اور فراق کے ماہر ہیں اور بس۔ ثبوت میں سرسید کے ادبی تصورات" اور "نظم کا نیا آہنگ" اور "ابوالکلام آزاد کے مکاتیب" پیش کروں گا جو تنقید سے زیادہ تحقیقی مضامین ہیں۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ کتاب پڑھنے کی سفارش کن بنیادوں پر کی جائے تو اس کے لئے یہ عرض کروں گا کہ "اعتراف ایمان" دو نے شعری مجموعے، اور فراق کو رکھ لو پوری ایسے مضامین ہیں جن کو پڑھ کر بہت کچھ ہاتھ آتا ہے اور ان مضامین کی افادیت کے پیش نظر کتاب پڑھنے کا سودا بہت سستا ہے اور اس سودے میں منافع کی کمی بھی نہیں ہے۔

آخری کتاب" اردو شاعری کا مزاج" ہے۔ یہاں لفظ آخری کا تعلق نہ مذہب سے ہے نہ سیاست سے۔ یہ کتاب میں نے سب سے آخر میں پڑھی ہے۔ لفظ سیاست آج کل بہت عجیب سمجھا جاتا ہے۔ مگر یقین کیجئے کہ ہندوستان اور پاکستان کی فضا اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ ایماندارانہ آنکھوں سے دیکھئے تو نظر آئے گا کہ ان دونوں ملکوں کی فضاؤں میں نوے فیصدی جہالت ۹۵، فی صدی تعصب، ۸۰ فیصدی تنگ نظری اور سو فی صدی مکار سیاست نظر آئے گی۔ ان حالات میں اگر ایک کتاب ان میں سے کسی بھی ملک میں ایسی لکھی جاتی ہے، جس میں ادب پر بات کرتے وقت خالص ادب اور تمدن کی بات کرتے وقت خالص تمدن نظر آتا ہے تو نہ صرف خوشی ہوتی ہے۔ بلکہ سیاست کے نام سے بدکنے والوں اور ناک بھوں چڑھانے والوں کی مخالفت کا خطرہ مول لیتے ہوئے زبان سے بے ساختہ واہ نکل جاتی ہے۔ وزیر آغا نے اُردو شاعری کی جڑیں ڈھونڈنے کے لئے نہ عرب کے نخلستانوں اور سوکھے صحراؤں کا رخ کیا اور نہ ایران کے خوبصورت شہروں کا۔

انھوں نے ذرا سی محنت کی، نظر بلند کی اور جرأت سے کام لیا اور اردو زبان، شاعری اور سارے ادب کی جڑیں اسی دھرتی میں ڈھونڈلیں جو اب ہندوستان اور پاکستان کے دو الگ الگ ناموں سے جانی جاتی ہے۔ بات درست تھی اور محنت میں خلوص تھا۔ میں ادب کے طالب علم کی حیثیت سے اس کتاب کی افادیت سے متاثر ہوا ہوں۔

اس کتاب سے جو چند باتیں سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں کہ ادیب جدید ہے، اس کا ذہن نیا ہے، اس کے سوچنے کا طریقہ نیا ہے اس کا مطالعہ وسیع ہے، ہندوستان کی تاریخ پر اس کی گرفت بہت مضبوط ہے اور جب وہ ۱۹۳۵ء کے بعد کے ادب کا ذکر کرتا ہے تو اس کی سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ اس ادب کی مخالفت اس لئے کی جائے کہ اس میں کچھ خامی ہے، یا اس لئے کی جائے کہ اس کی مخالفت کرنا وہ ضروری سمجھتا ہے۔ آخری بات کا ثبوت کتاب کے دوسرے حصے کا تیسرا مضمون اُردو نظم ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا کا ذہن کسی بھی لسانی یا مذہبی یا جغرافیائی تعصب سے پاک ہے۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ میراجی کا ذکر کرتے ہوئے وہ ایک جگہ لکھتے ہیں "جدید ہے کہ پاکستان کی اردو نظم میں بھی اس برّ صغیر کی دیومالا کی بیدی عکاسی موجود ہے جو اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ اگر غوّاصی کے عمل کو اپنایا جائے تو دھرتی کا مشترکہ نسلی سرمایہ منظر سطح پر آتا ہے اور یہ بات صرف وہی ادیب لکھ سکتا ہے جو مشترکہ نسلی سرمائے کی قدر و قیمت جانتا ہو۔ رہا غواصی کا عمل تو اس کے لئے صرف اتنا

عرض کروں گا کہ غواصی تو ہمارے بہت سے نام نہاد جدید شاعروں نے کی۔ مگر تہ سے موتی لانا تو درکنار، باہر آنا ہی بھول گئے مگر یہ الگ بات ہے۔

ہاں تو مندرجہ بالا حوالہ تو وزیر آغا کے سلسلے میں میری پہلی باتوں کا ثبوت ہیں۔ آخری بات، جس کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ثبوت کی تلاش میں یہ دلیل لائی ہے کہ عارف عبدالمتین کے یہاں جو فرد وزیر آغا کو مستقبل کی طرف نظریں اٹھائے ملتا ہے، انھیں اچھا لگتا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں یہی فرد جب انھیں فیض کے شعروں کا جامہ پہنے نظر آتا ہے تو ان کی نگاہوں میں نہیں سماتا۔ میں نے مانا کہ انھیں فیض کی بعض تراکیب اور تو ند کا سیلاب پسند نہیں۔ لیکن فیض کے بعض خصائص بھی ان کی نظر سے اوجھل ہو گئے اور مزا یہ ہے کہ وہی فیض اپنی روائتی تراکیب کے باوجود غزل میں اپیل کرتا ہے۔

لیکن میں پھر عرض کروں گا کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے اتنی اہم، کینوس کے اعتبار سے اتنی وسیع اور معیار کے لحاظ سے اتنی بلند ہے کہ کوئی چھوٹا مضمون اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

وزیر آغا کی زبان میں بھی روایتی فرسودگی نہیں ہے۔ اس کے بجائے ایک خوش گوار تازگی ہے۔ ایسی تازگی جو ہری بھری گھاس کے لان میں دکھائی دیتی ہے۔ ان کے بات کہنے کے انداز میں اتنی لوچ اور لچک ہے کہ وہ دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ اردو تنقید میں اس کتاب نے ایک گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

تو اس طرح "آگہی و بے باکی" میں تلخی کے باوجود اچھے مضامین کی کثرت" زاویۂ نگاہ" میں ایک نرم رَو ایمان داری اور "اردو شاعری کا مزاج" میں اس کی ہمہ گیری، ایسی چیزیں ہیں جن کا بھاری پتھر چومے بغیر تنقید ادب کے کسی باذوق کی گاڑی ایک انچ آگے نہیں کھسک سکتی۔ لیکن ان نئے نقادوں نے ایک مرتبہ یہ دکھایا کہ تنقید نہ صرف زندہ ہے بلکہ پہلے سے زیادہ صحت مند و توانا ہے اور پچھلی تنقید کو منزلوں پیچھے چھوڑ چکی ہے۔

حسن کمال

باز دید (نظمیں) منیب الرحمٰن۔ ناشر: انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڑھ۔ ضخامت ۸۰ صفحات۔ قیمت تین روپے پچاس پیسے۔

نہایت نفیس سفید دبیز کاغذ، نہایت نفیس ٹائپ کے حروف میں چھپی ہوئی یہ کتاب، نہایت نفیس جلد اور نہایت نفیس گرد پوش کے ساتھ ان لوگوں کو بھی، جو ڈاکٹر منیب الرحمٰن کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں، ان کی نفاست اور شرافت سے آشنا کرتی ہے۔

اسی صفحات کے اس مختصر سے مجموعے میں ۴۹ چھوٹی چھوٹی نظمیں ہیں اور یہ شاعری کی بائیس سال کی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ایک ایک مصرعے پر برسوں محنت کی ہے، ایک ایک لفظ کو مہینوں الجھا اور پرکھا ہے اور تشبیہوں اور استعاروں کو نگینوں کی طرح تراش تراش کے جڑا ہے۔ اور تب کہیں جا کے یہ نفاست پیدا کی ہے۔ لیکن شاعری صرف مرصع سازی نہیں ہے کچھ اور بھی ہے، اور اس کچھ اور کی کمی نے نظموں میں شبنم کی سی ٹھنڈک تو بھر دی ہے لیکن سورج کی کرنوں کی حرارت سے محروم کر دیا ہے۔

"باز دید" کی نظموں میں غم ذات اور غم کائنات دونوں کی لو بہت مدھم ہے۔ اس لئے لفظی آرائش اور صناعی کاری پر زور زیادہ ہے۔ ابلاغ اتنا مکمل ہے کہ ہر مصرعہ نظریں ملا کے بات کرتا ہے اور جی پلکوں کے سائے کے لئے ترس جاتا ہے، فارسی کے ادب عالیہ کا ستھرا مذاق نظموں سے چھلکا پڑتا ہے۔ اس کا استقبال اس لئے کرنا چاہئے کہ آجکل جب نوتلے اور بیکلے لفظوں کی بہتات کوئی تو ہے جو پورے پورے لفظ بول رہا ہے۔ ان کا نام کبھی کبھی نئے شاعروں کی فہرست میں لیا جاتا ہے۔ لیکن ان میں صورت و معنی دونوں کے اعتبار سے نئے شاعروں کی سی کوئی بات نہیں ہے۔

منیب الرحمٰن کا نام ۴۴-۱۹۴۳ء کے "ساقی" (دہلی) اور ادب لطیف (لاہور) میں اکثر چھپا رہتا تھا اور ان کی نظمیں حلقۂ ارباب ذوق کے سالانہ انتخابات کی بھی زینت ہوتی تھیں لیکن وہ حلقۂ ارباب ذوق کی آغوش میں سما نہ سکے۔ ان میں شعور اور احساس کی ایک ایسی رو تھی جو دوسری طرف کھینچ رہی تھی۔

اس وقت کی بعض جانی پہچانی نظمیں "باز دید" میں شامل ہیں۔ لیکن بعض نظمیں قلمزد کر دی گئی ہیں۔ اور بعض مختصر سے مختصر تر (جیسے وسعت بیکنار صحرا) اور ان میں ایسی نظمیں بھی ہیں جو انہوں نے قیام یورپ کے زمانے میں کہی تھیں ۵۰ - ۱۹۵۱ء میں انہوں نے امن عالم کے موضوع پر بھی کچھ نظمیں کہی تھیں (وہ کہاں چھپی تھیں اب یاد نہیں) ان میں سے کسی نظم کا اس کتاب کے اوراق پر پتہ نہیں چلتا۔ کتاب میں کوئی دیباچہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ شاعر نے اپنی نظموں کو کیوں قلمزد کیا ہے ہیئت کی وجہ سے یا موضوع کی وجہ سے۔

منیب الرحمٰن بہت محفوظ زندگی کے شاعر ہیں، وہ زندگی جس تک زندگی کے طوفانوں کے پہنچنے میں دیر لگتی ہے اس وجہ سے ان کی شاعری میں مجموعی طور سے ایک عجیب و غریب قسم کی آسودگی ہے جو شاعر کے جذبۂ تخلیق کے لئے مضر ہے۔

ان کا خوبصورت مجموعہ پڑھنے اور اس سے لطف لینے کے بعد امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی ایک نظم یاد آجاتی ہے اس میں شاعر نے جاڑوں کی برف پگھل جانے کے بعد آنے والی بہار کی ہواؤں سے کچھ اس طرح کی بات کہی ہے کہ شاعر کی

کھڑکیاں اور دروازے توڑ دو، اس کے کمرے میں دندناتا گھس آئے، میز پر سلیقے سے رکھے ہوئے نظموں کے مسودوں کو پھینک دو اور شاعر کو کمرے سے باہر نکال دو۔
مجھے نہ جانے کیوں یقین ہے کہ خلیل الرحمٰن صاحب کو اپنی شاعری میں ضرورت سے زیادہ آرائش کا خود احساس ہوگا۔ میں نے جدید شاعری پر ان کی کتاب پڑھی ہے۔ لیکن وہ خود اس کتاب کے مصنف ہیں اور جدید عہد کے سارے تقاضوں سے واقف ہیں، پھر اتنی آرائش، اتنی ٹھنڈک، اتنی نفاست کیوں؟

"ہم قلم"

اسم اعظم (نظمیں) شہریار۔ ناشر۔ انڈین بک ہاؤس۔ علی گڑھ۔ قیمت تین روپے۔

"اسم اعظم"، شہریار کا پہلا مجموعۂ کلام ہے جس میں ۶۲ مختصر نظمیں، ۲۶ غزلیں اور کچھ متفرق اشعار شامل ہیں شہریار کا شمار اردو شاعروں کی اس نسل میں کیا جاتا ہے جو آزادی کے بعد کے ہندوستان میں ابھری ہے۔ وحید اختر نے اپنے تعارفی مضمون میں اس کا رشتہ دوسری جنگ عظیم سے جوڑنا چاہا ہے، جو مناسب نہیں۔ اردو کے نئے ذہن کو یورپین حالات کے بجائے دھرتی کی غیر فطری تقسیم، اقتصادی بحران، غیر انسانی فسادات، اور اجڑتے بستے آنگنوں کی کنویں میں پڑھنے کی ضرورت ہے عالمی جنگوں کو نئے آدمی نے کتابوں میں ہی پڑھا ہے، ممکن ہے اس کا اثر غیر شعوری طور پر قبول بھی کیا ہو، مگر وہ درد جو اس کے ہونٹوں سے زہر بن کر ابل رہا ہے وہ پیٹ اور دماغ، دونوں کے ملے جلے زخموں کا ردعمل ہے۔ دھرتی کی تقسیم نے محبتوں کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا ہے۔ اقتصادی بحران نے بھرے پرے سماج کو چھوٹے چھوٹے کمروں میں تقسیم کر دیا۔ جالوریت کے خوف ناک تماشے نے وقت کے تسلسل کو لمحوں میں بکھیر دیا۔ اور اجڑتے بستے آنگنوں نے دھرتی پوجا کے سہارے کو چھین لیا۔ گھٹتے ہوئے کمروں کی پتھریلی دیواروں سے ٹکراتی ہوئی زندہ آوازیں اور پیٹ کے بل رینگتی ہوئی تنہائیاں۔

یہ مسائل کئی نوعیتوں کے لحاظ سے پچھلی پیڑھی کے مسائل سے مختلف ہیں۔ مسائل سے جوجھنے اور ان سے ٹکرانے کا تعلق خون کے دوران سے بھی، جو عمر کے ساتھ ہلکا اور تیز ہوتا رہتا ہے، بہت گہرا ہوتا ہے۔ خون کی رفتار ہی باہری دنیا سے ہمارے رد عمل کی سمتیں متعین کرتی ہیں۔ شعور کی تیزی بھی نوجوان خون کی گرمی اور تیز رفتاری کا تقاضا کرتی ہے۔ شہریار نئے شاعر ہیں۔ ان کے لہجے کا تیکھا انداز، ان کا فکری تناؤ، ان کی تخیلی دروں بینی، ہر جگہ نئے پن کا احساس دلاتی ہیں۔ شہریار نے اپنی ذات کی تجربہ گاہ میں زندہ سانسوں کو نام دینے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نظمیں عام طور سے مختصر ہوتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے شاعر نے ایک ایک لفظ کا منہ کھول کر اسے اوپر تک بھر دیا ہے۔ اور ہر شبہہ اپنے لغوی چہرے کے اندر کئی کئی چہرے چھپائے بیٹھا ہے۔ ان میں آنکھ میں آنکھ ڈالنے والی بیباکی نہیں بلکہ شرمائی آنکھ کی طرح دھیمے دھیمے کھلنے والا حسن ہے۔ کہیں کہیں زبان کا روایتی استعمال اور غزلیاتی امیجری ضرور کھٹکتی ہے۔ انسانوں کی طرح الفاظ اور امیجری کی بھی عمر ہوتی ہے۔ یہ بھی پیدا ہوتے ہیں، جوان ہوتے ہیں اور بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ ہر عہد کی سوچ اپنا لباس خود بنتی ہے۔ اور یہی اس کے نئے پن کی شناخت

بھی ہے۔ مشعلِ درد، متاعِ جاں، دامِ الفت، دستِ ستم، ہجوم درد، شمیم زلف، دشتِ تنہائی۔ یادوں کے غبار، شورِ نالہ سوزِ غم، فاصلوں، عمرِ رفتہ اور بہت سی ایسی تراکیب اور تصویریں، جو اپنی عمریں پوری کر چکی ہیں، نئی سانسوں کو زبان دینے میں کہاں تک کامیاب ہو سکتی ہیں؟ یہ ایسا ہی ہے جیسے ۶۰ء میں کوئی آدمی انگرکھا اور پگڑی پہنے نظر آ جائے۔

ساتھ ہی پیش رو شعراء کے واضح اثرات بھی نمایاں ہیں۔ مثلاً فیض کی ابتدائی غزل کا ایک شعر ہے ؎

نہ جانے کس لئے امید وار بیٹھا ہوں ‏ ‏ اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگذر بھی نہیں

یہ شعر شہریار کی نظم "عرفان" کے پہلے دو مصرعوں میں ڈھل گیا ہے ؎

میں اس راستے پر کھڑا ہوں جہاں سے ‏ ‏ کسی اشک کے گذرنے کی امید بالکل نہیں

اسی طرح نظم "موت" معنوی اعتبار سے جذبی کی نظم "موت" سے قریب ہے اور ٹکنیک میں اختر الایمان کی غماری ہے۔ مثال۔ "ابھی نہیں ابھی منزل ہزار کوس ہے دور" (اختر الایمان)

"ابھی نہیں ابھی زنجیر خواب برہم ہے" (شہریار)

شاید اس کی وجہ وہ ٹھہری ہوئی پرسکون بستی ہو، جس میں وہ بسے ہوئے ہیں۔ اور جہاں ابھی تک پہیئے کی رفتار آدمی کے قدموں کی رفتار کے برابر ہی ہے۔ زبان اور سوچ دونوں کی تربیت میں زمینی پھیلاؤ اہم رول ادا کرتا ہے۔

شہریار کی نظمیں کتابی سوچ کی بلند آہنگی اور اوڑھے ہوئے درد کی آرائش سے پاک ہیں۔ یہ دھیمی دھیمی سرگوشیوں اور انفرادی دکھوں کی رازداریوں کا فن ہے۔ ان میں جی ہوئی زندگی کی حرارت بھی ہے۔ مگر ایسی زندگی کی ـــــ جو تجربات و مشاہدات کی سطح پر ابھی محدود دائرے میں گھری ہوئی ہے یہاں وہ نفسیاتی پچکیلا پن بھی نمایاں طور سے ابھر نہیں پایا جو اقدار کی قطعیت کی نفی کرتا ہوا نئی دشائیں کھوجتا ہے۔

"اسمِ اعظم" ایک نئے اور اچھے شاعر کے تجربات و احساسات کا پہلا خوبصورت کتابی روپ ہے۔ اس میں زندگی کے اوپری پردوں کے پیچھے ہونے والے ڈرامے کی رازداری کی لے تو مدھم ہے لیکن تاثر کی دھیمی دھیمی آنچ اور فکر و خیال کی تازگی ہر جگہ نمایاں ہے۔

"اسمِ اعظم" میں نظموں کے ساتھ غزلوں کا بھی ایک الگ سے سیکشن ہے۔ ان غزلوں میں بھی اپنی نظموں کی طرح شہریار کئی جگہ جھانکتے ہوئے نظر آتے ہیں کہیں کہیں تو شہریار نے شعروں پر اپنے دستخط کر کے چھوڑ دیئے ہیں۔ ان میں اپنی بات کا خلوص بھی ہے اور تاثر کی سچائی بھی۔

خون میں جوش نہیں آیا زمانہ گذرا
دوستو آؤ کوئی بات نکالی جائے

سنا ہے اگلے زمانے میں سنگ داہن تھے ‏ ‏ ہمارے عہد میں تو مٹی کے گھڑے ہیں لوگ

عجیب سانحہ مجھ پر گزر گیا یارو — میں اپنے سائے سے کل رات ڈر گیا یارو

وہ کون تھا وہ کہاں کا تھا کیا ہوا تھا اسے — سنا ہے آج کوئی شخص مر گیا یارو

مگر میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ شاعر کے مجموعے میں مزید روایتی قسم کے ایسے اشعار کیسے در آئے جیسے ؎

جو بھی ملتا ہے ترے در ہی سے ملتا ہے اسے — ورنہ ترا چھوڑ کے کیسے یہ سوالی جائے

ترے کرم کی یہی یادگار باقی ہے — یہ ایک داغ جو اس دل میں جگمگاتا ہے

نذرانہ ترے حسن کو کیا دیں کہ اپنے پاس — لے دے کے ایک دل ہے سو ٹوٹا ہوا سا ہے ؎

ندا فاضلی

اجنبی شہر، اجنبی راستے (نظمیں)، راہی معصوم رضا۔ ناشر سعید پبلکیشنز۔ الہ آباد۔
قیمت۔ پانچ روپے۔

شخصیت کی تکمیل کے لیے انسان کو تین بار جنم لینا ہوتا ہے۔ پہلی بار اپنی ماں کے پیٹ سے، دوسری بار ماحول کی کوکھ سے اور تیسری بار اپنے وجود کے شکم سے۔ پہلے جنم سے تیسرے جنم تک جو راستے ہیں وہ اجنبی ہیں اور ان کی تلاش انسان دوسرے جنم کے بعد ہی کرنے لگتا ہے۔ یہ بھیڑ میں گم ہو کر اپنے آپ کو بھیڑ سے الگ کرنے کا عمل ہے۔ لیکن تیسرے جنم کا دوران پہلے اور دوسرے جنم کی مانند اتفاقات کے بجائے شعوری کوششوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ ایک لڑائی ہے جو فرد اپنی ذات کے میدان میں اپنے اردگرد کے ماحول سے لڑتا ہے۔

اچھا ادب شخصیت کی تکمیل سے عبارت ہے جس کی تخلیق کے لیے ادیب کو پہلے خود اپنے آپ کو پیدا کرنا پڑتا ہے راہی معصوم رضا کے شاعرانہ سفر کی ابتدا بھی شخصیت کی تکمیل کی اس تیسری منزل سے بہت پہلے ہو جاتی ہے۔ جلدی ہونا ممکن ہے ذہانت کی پہچان بھی جاتی ہو مگر اس میں درحقیقت ذہن کی بہ نسبت ہونٹوں سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ راہی کی نظموں میں اور غزلوں میں جن کی تعداد ۱۲۵ صفحات کے مجموعے میں اچھی خاصی ہے۔ ان کے صرف ہونٹ ہی ہونٹ نظر آتے ہیں۔ ان سے پھوٹتی ہوئی آوازیں شاعری نہیں کہی جا سکتیں۔ یہ پہلے کی سنی سنائی اور جانی پہچانی کئی آوازیں ہیں۔ ان نظموں میں سچ دھج بھی ہے اور حسن بھی، مگر ایسا حسن جو دیواروں پر ٹنگی خاموش تصویروں میں ہوتا ہے جو کمرے کو تو سجا دیتی ہیں لیکن کمرے میں بسنے والوں کی تنہائیوں کو نہیں بانٹ پاتیں۔ الفاظ سے تصویریں تو بن جاتی ہیں، لیکن انکو زندہ جسم بنا دینے کا حب الد غالب کے الفاظ میں دل گداختہ کا مرہون منت ہے۔

لیکن اس شاعرانہ تساہل کے، ایک راہی ہی نہیں بلکہ ان کے بیشتر معاصرین خلیل الرحمن اعظمی، باقر مہدی، عمیق حنفی اور بہت سے دوسرے بھی شکار نظر آتے ہیں۔ عمیق، باقر، اور خلیل کے پہلے شعری مجموعے اس ثبوت میں پیش کئے جا سکتے ہیں۔ اور ان میں سے کئی تو آج تک باوجود اپنے تحریری اعلانات کے، اپنے آپ کو صحیح معنوں میں

تبدیل کرنے میں ناکام نظر آتے ہیں۔ فیشن جب عادت بن جاتی ہے تو دور تک ساتھ چلتی رہتی ہے۔ فرق صرف شعوری اور غیر شعوری عمل کا ہوتا ہے۔ فیشن کو کھلی آنکھوں سے اختیار کیا جاتا ہے اور عادت غیر شعوری طور پر اپنا اظہار کرتی رہتی ہے
راہی کی انفرادیت اس میں ہے کہ انھوں نے فیشن کو عادت بنا دینے کے بجائے اُسے اپنی فطرت بنا لیا اور بہت جلد اپنی سوچ کی گرمی کو اپنے خون کے دریئہ حرارت لے آئے۔

راہی نظریاتی شاعر ہیں۔ زندگی کے بارے میں ان کا ایک واحد نقطۂ نظر ہے جن کی جھلک کم و بیش انکی ہر نظم اور غزل میں نمایاں ہے۔ نظریات کو شاعری بنا دینے کے لئے جن جذباتی خلوص، حیاتی حرارت، اور مشاہداتی بے لاگی کی ضرورت ہوتی ہے۔ راہی نے اپنے جیون کی دھوپ چھاؤں سے حاصل کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا آرٹ فارمولوں کی طرح سیدھا اور خشک منطقیانہ ہونے سے بچ گیا۔ اس میں پگڈنڈیوں کے سے ٹیڑھے میڑھے خم بھی ہیں اور پیڑوں سے چھنتی ہوئی دھوپ کی سی چھوٹی بڑی لکیریں بھی۔ اس میں بانسوں کے جھنڈ میں چیختی شام کی سی تیز مدھم آوازیں بھی ہیں اور کھلی ہواؤں کے سے لہریئے بھی۔ اس شاعری میں وقتی ضرورتوں کا پیٹ بھرنے کے ساتھ زندگی کا دور تک ساتھ دینے کی شکتی بھی ہے۔ راہی کی شاعری کبھی پروائی کی طرح بہتی ہے اور کبھی بگولوں کی طرح چلتی لیکن اس کے قدم دھرتی پر جمے ہوئے ہیں۔

سڑک، گنگا اور دیا دیو، سب سے چھوٹی اقلیت، چاند کی بڑھیا، نیند کا گاؤں، سراپا، ایسی خوبصورت نظمیں راہی کا بھرپور تعارف کراتی ہیں۔ ان میں راہی کا چہرہ اور اس کے خدوخال صاف طور سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ ان نظموں میں صرف ہونٹ ہی نہیں بلکہ آواز بھی انہیں کی سی لگتی ہیں۔ یہ ضرور ہے ابھی یہ آواز اکھڑی اکھڑی اور دبی دبی سی محسوس ہوتی ہے۔ وہ معنوی تہہ داریاں بھی خال خال ہیں جو آواز کو عظمت بخشتی ہیں لیکن اس [illegible] پھیلاؤ کا امکان بہت ہے اور یہ شاعر کی خود اپنی صلاحیتوں پر منحصر ہے۔

ان نظموں میں اور دوسری نظموں میں (زخموں کی آواز، آج کی رات، آخری پڑاؤ، اے اجنبی) وہی فرق ہے جو فیشن اور فطرت میں ہے۔ دونوں قسم کی نظموں کے ٹکڑے دیکھیے:

یہ ہے ہندوستاں کی مقدس زمیں — جیسے میلے میں تنہا کوئی نازنیں
سجدہ ہائے غلامی سے زخمی جبیں — ایک کہنہ گریباں پھٹی آستیں

ایک گھر جس میں مہنگا سہ آ [illegible] ہے
اک نشیمن جو صدیوں سے برباد ہے

کالی داس اور ٹیگور کا یہ چمن — میر و غالب اور اقبال کا یہ وطن
ایشیا کے حسیں جسم کا پیرہن — رشکِ صد میکدہ تھا یہ دار المحن

(اے اجنبی)

ہر سو پھیلے / ایک پیالہ ——— گر جانے پر / پٹنا پڑتا ——— گڑیا چلتی

باجی اٹھتیں / بچنا پڑتا / دادا کے بوڑھے ہاتھوں سے تھپڑ چلتا / ٹلنا پڑتا

یہ جو سڑک ہے ان موتیوں پر / مجھ کو اپنی ——— گود میں لے کر / ٹل جاتی تھی

گھر دیں اٹ کر / گھر میں آتا ——— دھویا جاتا / پیٹا جاتا / لیکن جوں ہی باہر جاتا

ٹھنا ٹھنا بھول سا جاتا / میرا اور اس راہ گذر کا

ساتھ کوئی دو دن کا نہیں ہے ——— (سڑک)

فضا تو ان نظموں کی بھی رومانی سی ہے لیکن یہ رومانیت پہلے کی طرح تھکی تھکی اور افسانوی نہیں ہے۔ یہ تھوڑی دور دھوپ میں چلنے کے بعد کسی چھاؤں تلے بیٹھ جانے ایسی ہے۔ راہی کی ان نظموں کو پڑھ کر کاٹھ کی گھنٹیوں کے مشہور مہدی شاعر سرد شہور دیال سکسینہ کی یاد آجاتی ہے۔ راہی اور سکسینہ کے لہجے کی مماثلت محض اتفاقیہ ہے یا شعوری یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن یہ ذہنی قربت بھاشائی یگانگت کی علامت ضرور ہے۔

"اجنبی شہر اور اجنبی راستے" راہی معصوم رضا کی شعری ذہانت کا جاندار ثبوت بھی ہے اور پچھلے چار پانچ سال کی گنتی کی چند اچھی کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ اور اکیلے دوکیلے شعر بھی۔ کہیں کہیں اس میں (ایک آدمی کئی راستے، طوفان) وہ ذہنی چھپٹپاہٹ بھی نظر آتی ہے جو بندھے ٹکے گھیروں سے شاعر کی ذہنی بے اطمینانی ظاہر کرتی ہے اور یہ بھی ایک باشعور شاعر کی زندگی کی پہچان بھی ہے راہی متوازن قدم رکھنے کے عادی ہیں۔ وہ آرٹ کی سطح پر جلد بازی کے قائل نہیں ہیں۔ ممکن ہے یہ چھپٹپاہٹ کی لہر، راہی کے شاعرانہ سفر میں نئے کناروں کی کھوج ثابت ہو۔ انہوں نے خود بھی کہا ہے۔

آباد تھا یہ دل تو نہ مہماں ہوا کوئی ——— ویران ہو گیا ہے تو اک راستہ ہوا

(ندا فاضلی)

"دشمنوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ وہ تمہاری جان لے سکتے ہیں۔ دوستوں سے ڈرنے کی ضرورت نہیں، بہت ہوا تو وہ تمہارے ساتھ غداری کریں گے۔ ڈرو بے حس اور بے پروا (Indifferent) لوگوں سے کیونکہ وہ نہ تو جان لیتے ہیں اور نہ غداری کرتے ہیں لیکن دنیا میں قتل اور غداری کا وجود ان کی خاموشی کی وجہ سے باقی ہے۔"

برونو یاسنسکی

نیا عہد نامہ (نظمیں غزلیں) خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ناشر: انڈین بک ہاؤس علیگڈھ۔ ملنے کا پتہ: انجمن ترقی اردو (ہند) علیگڈھ۔ ضخامت ۲۰۵ صفحات۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔

بمبئی کے ہندی ہفتے وار "دھرم یگ" میں لکھتے ہوئے راہی معصوم رضا نے خلیل الرحمٰن کے مجموعے کے نام پر اعتراض کیا ہے۔ یہ انجیل مقدس کے دوسرے حصّے کا نام ہے جو حضرت عیسٰی کی زندگی اور تعلیمات سے متعلق ہے۔ اس کا اعتراف خلیل نے خود اس طرح کیا ہے۔

اے غم دنیا ہمیں اس وقت تنہا چھوڑ دے ایسے عالم میں کہ جب ہم پر اتر تی ہے کتاب

زبان و بیان کی خامیوں سے قطع نظر ایسے آسمانی نام میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہے جب کہ شاعری کو پیغمبری اور صریر خامہ کو نوائے سروش کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے بعد شاعر کی ذمّہ داری بڑھ جاتی ہے۔ پھر اس کی تخلیق کو کم سے کم "بال جبریل" اور "جاوید نامہ" ہونا چاہیئے۔ "این کتاب از آسمانی دیگر است"

لیکن میرا خیال ہے کہ شاعر نے "عہد نامہ" کو پیمانِ وفا کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے اس عنوان کی نظم پڑھ کر یہی اثر پڑتا ہے چونکہ دیباچے میں انہوں نے اپنے پرانے مسلک ترقی پسندی سے برأت کا اعلان کیا ہے اس لئے قیاس یہی کہتا ہے کہ نئے عہد نامے کا مطلب نیا پیمانِ وفا بھی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر کا نیا پیمانِ وفا کس کے ساتھ ہے

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیل الرحمٰن نے اپنے پہلے مجموعے "کاغذی پیرہن" سے "نیا عہد نامہ" تک کوئی لمبا سفر کیا طے کیا ہے لیکن یہ فکر اور جذبے کی کسی نئی کروٹ کے بجائے صرف یقین کی کمی کا سفر ہے۔ مگر پیغمبری اور بے یقینی ایک ساتھ ممکن نہیں ہے۔

نیا عہد نامہ کے اوراق پر عہد حاضر سے ناآسودگی کا شدید احساس ابھرتا ہے۔ اور اس میں ایک جمالیاتی لذت ہے۔ خلیل کے پاس کسی فردا کا تصوّر نہیں ہے (ان کی لیلیٰ کھو گئی ہے) لیکن فردا کی آرزو موجود ہے اور یہ بڑا قیمتی جذبہ ہے۔ اس آرزو سے کسی شاعر کا دل خالی نہیں رہ سکتا۔ ہر شاعر پر غالب کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ "میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں" اب وہ گلشن کیسا ہوگا اس پر منحصر ہے کہ شاعر کے "نشاطِ تصوّر" میں کتنی گرمی ہے۔ اسی سے شاعر کی نغمہ سنجی کا مرتبہ متعین ہوتا ہے۔

خلیل الرحمٰن میرے نزدیک جدید شاعر نہیں ہیں۔ (اس سے ان کی شاعری پر حرف نہیں آتا) وہ صرف جدید عہد کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنا سارا انداز کلاسیکی شاعری اور خاص طور سے غزل سے لیا ہے۔ اس میں جو بھی جدت ہے وہ ترقی پسند مدرسۂ فکر کی دین ہے اور یہ خلیل کی اپنی شاعری کا ماضی ہے۔

ان کی ذہنی تربیت اس دور میں ہوئی ہے جب مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کا اردو ڈپارٹمنٹ اپنے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے ذوق لطیف کے احترام میں صرف غزل کی سرپرستی کر رہا تھا اور آل احمد سرور "ذوقِ جنوں" کی غزلیں کہہ رہے تھے۔ خلیل الرحمٰن کے جذبۂ آزادی اور حب الوطنی نے ان کے شاعرانہ خلوص کو ترقی پسند تحریک کے حلقے میں پہونچا دیا لیکن وہ اس کے ساتھ تھوڑی ہی دور چل سکتے تھے۔ اگر تحریک میں انتہا پسندی نہ آئی ہوتی، اس پر حکومت کا عتاب نہ نازل ہوا ہوتا اور وہ پاش پاش نہ ہوئی ہوتی۔ تو بھی خلیل الرحمٰن کا شاعرانہ مزاج انہیں اس تحریک سے الگ لے جاتا۔ اور یہ کوئی بری بات نہ ہوتی۔ حسرت، یگانہ اور جگر نے بھی آخر تحریک سے الگ رہ کر اچھی شاعری کی ہے۔

آج بھی خلیل الرحمٰن نے اپنا رشتہ ایک ایسے رجحان سے جوڑ رکھا ہے جس سے ان کا مزاج ہم آہنگ نہیں ہے۔ جسے آج "نئی شاعری" کہا جا رہا ہے اس میں پرانے تغزل اور حسن کاری کی گنجائش نہیں ہے۔ عمیق حنفی کے الفاظ میں یہ "عشقی اور نقالی" کا دوسرا نام ہے اور خلیل کے یہاں پرانے تغزل اور حسن کاری کے چھینٹے جا بجا مل جائیں گے۔ بغیر آتش اور فراق کے نخروں کی صحیح داد دینے والا آخر اس سے بچ کے جا بھی کہاں سکتا ہے۔ آل احمد سرور کے اس بیان پر خلیل کی شاعری پوری نہیں اترتی کہ آج کا نیا شاعر "ایذرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ اور میراجی سے متاثر ہے۔ خلیل کے یہاں ان میں سے کسی کی پرچھائیں بھی نہیں ملے گی۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک ایک "نئی شاعری" کی خصوصیات میراجی کی دین ہیں اور یہ خصوصیات ہیں اقبال، اختر شیرانی اور فیض کے برعکس میراجی کے یہاں بات میں تکمیل کی کمی، زبان کا نظم و ضبط سے عاری ہونا، زبان کی شکست و ریخت، تصورات کی فراوانی اور افکار کی مبہم پرچھائیں اور الفاظ کا چمک دمک اور آہنگ و فکر کی ایک خاص نہج سے محروم ہونا (اوراق سالنامہ ۱۹۶۷ء)

اس اعتبار سے خلیل میراجی سے اور شاعری کے نئے پن سے کوسوں دور ہیں اور اقبال اور فیض کے قریب ہیں اور ان کی وساطت سے ترقی پسند خاندان میں واپس آ جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے۔

در اصل خلیل کو اپنی شاعرانہ شخصیت کی دریافت از سرِ نو کرنی ہے۔ ان کی غزلیں تڑپ تڑپ کر کہہ رہی ہیں کہ شاعر کی اصل شاعرانہ شخصیت بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب ہے۔ اگر بیس برس کی مشقِ سخن کے بعد بھی انہوں نے اس نقاب کو نہ اُتارا تو قاری ان کی شاعری کے جلووں سے محروم رہ جائیں گے۔

خلیل کی غزلیں پڑھ کر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ ماضی اور حال کی کشمکش میں مبتلا ہیں۔ وہ جس ماضی سے رشتہ توڑ آئے ہیں یا رشتہ توڑ لینے پر مجبور کر دئے گئے ہیں، وہ انہیں بری طرح یاد آتا ہے اور انہیں بار بار آواز دیتا ہے انہیں خود اپنے کھو جانے کا احساس ہے۔ آج کے آئینے میں وہ اپنی شکل تک نہیں پہچان سکتے۔ نام تک بھولے جا رہے ہیں ۷۰ غزلوں اور چند نظموں کے اس مختصر سے مجموعے میں ایک ہی خیال، ایک ہی جذبے کی تکرار ہے ؎

وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا
گھر میں کوئی آئے کہ نہ آئے ایک دیا سا جلتا تھا

نہیں اب کوئی خواب ایسا تری صورت جو دکھلائے / بچھڑ کر تجھ سے کس منزل پہ ہم تنہا چلے آئے

تری گلی سے چھٹ کے نہ جائے اماں ملی!
اب کے تو میرا گھر بھی مرا گھر نہ ہو سکا!
تیرے نہ ہو سکے تو کسی کے نہ ہو سکے!
یہ کاروبارِ شوق مکرر نہ ہو سکا!

یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا　　پوچھ کر گردشِ دوران سے بتا دو ہم کو
یا ہمیں قید کر دو مجلسِ تنہائی . . . . میں　　یا اسی دشمنِ جانی سے ملا دو ہم کو

ہم بھولتے جاتے ہیں اس چہرۂ زیبا کو
اے خواب ذرا اس کی صورت تو دکھا جانا

غرض آدھی سے زیادہ غزلیں ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہیں۔ ان میں یکساں جذبے اور خیال کے باوجود حسن اور تاثیر ہے۔ ان کے لہجے میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے اور پرانی آوازوں کے تہوں کے اندر اس کی اپنی آواز کی تہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ یہ خلوص اور صداقت کے بغیر ممکن نہیں۔

ٹیکنیک کے اعتبار سے ان اشعار میں میرؔ اور فراقؔ کی سی پرکار سادگی ہے۔ یہ بیجا تشبیہوں اور استعاروں سے مارواڑی عورتوں کی طرح آراستہ نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں فکر اور جذبے کی کوئی پیچیدگی ہے۔ زبان کو بھی نیا انداز دینے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ یہ کلاسیکیت کے رچے ہوئے مذاق کی غمازی کرتی ہیں۔ یہ حسن اور سادگی "نئی شاعری" کے مدرسۂ فکر میں بار نہیں پا سکتی۔ ان میں وہ ٹوٹی ہوئی شخصیت بھی نہیں ہے جسے "نئی شاعری" آج کا انسان کہہ کر ابھارنا چاہتی ہے۔ صرف زخم خوردہ شخصیت ہے جو اپنی لیلیٰ کے کھو جانے کا ماتم کر رہی ہے آج وہ ایسا شعر کہنے پر قادر نہیں سے

چاہے اب نجد کا ہر ذرّہ مخالف ہو جائے
قیس ہیں ہم تو بہر حال ہیں لیلیٰ کی طرف

اور یہاں روحانی لیلیٰ اور سماجی لیلیٰ کی تو تفریق ممکن نہیں ہے۔ کوئی شاعر آدرش کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس سے مراد نہ تو سیاسی پارٹیوں کی پالیسی ہے اور نہ کوئی منظم فلسفہ۔ صرف حسن و خیر کی تلاش اور وہ بھی آج کے حالات میں۔ مخصوص ماحول میں، جو گذشتہ ماحول اور حالات سے مختلف ہے، شاعر کو اس کے تصور کی لیلیٰ کے قریب لے جا سکتی ہے۔ پرانی کھوئی ہوئی لیلیٰ تو کبھی نہ ملے گی لیکن نئی لیلیٰ کی تلاش کے لئے نجد کے ہر ذرے سے دست و گریباں ہونا پڑے گا۔

اس نئے آدرش کی تلاش خلیل صرف اپنی شخصیت کی بازیافت سے کر سکتے ہیں اور اس میں ماحول کی بازیافت شامل ہے یہی عمل فردا کی جستجو اور آدرش کا تعین کرتا ہے۔ اور یہ آدرش خلیل کی شاعری میں کہیں کہیں جھانکنے لگتا ہے سے

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

مرے لہو سے معطر ترے لبوں کے گلاب　　تری وفا سے کنول میرے دل میں کھلتے ہیں
دھڑک رہا ہے مسرت سے کائنات کا دل　　کبھی کے بچھڑے ہوئے دوست آج ملتے ہیں

آج ڈوبا ہوا خوشبو میں ہے پیراہنِ جاں
اے صبا کس نے یہ پوچھا ہے مرا نام و نشاں

آنے ہوں ملن کی گھڑیاں

سورج کہیں غم کا ڈوبتا ہو

مہکی مہکی ہو شب کی دلہن

کچنار کہیں پہ کھل رہا ہو

ہر موڑ پہ اک نیا خدا ہو

وہ ذوق فرداجو ان خوبصورت جھروکوں سے جھانک رہا ہے اس کو ایک پیکر دینے کی کاوش خلیل کی شاعری کا مستقبل ہے۔ اس کے لئے میر کی فریاد کی لے کافی نہ ہوگی۔ اس لئے انانیت اور بے دماغی کو بھی حاصل کرنا پڑے گا جس نے میر کو ٹیڑھا بانکا بنا دیا ہے ؎

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجلا کے نہ ہم

اپنے جامے میں اگر آج گریبان ہوتا

آخر میں چند الفاظ خلیل کی ہجو یلٹ کے بارے میں۔ وہ بہت ہی بے کار ہیں اور ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتی ہیں ترقی پسند شعرانے جو ایجی ٹیشنل نظمیں کہیں اُن میں کم سے کم آزادی کا جذبہ تھا اور ظفر علی خاں اور شبلی کی روایت تھی۔ خلیل کی ہجویات ان نظموں سے بھی زیادہ کم صورت ہیں۔ اگر یہ بات کہنا ہی تھی اقبر؛ اس کے لئے دیباچے میں جگہ نکالنی چاہیئے تھی۔

"ہم قلم"

اعتبار نظر

(تنقیدی مضامین) احتشام حسین۔ ناشر، کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ۔ قیمت چار روپے پچاس پیسے۔

پروفیسر احتشام حسین اردو کے بزرگ اور بالغ نظر نقاد ہیں۔ گذشتہ بیس پچیس سال میں جن ناقدوں نے ترقی پسند تنقید کو معتبر بنایا ہے ان میں احتشام حسین صاحب کا نام سر فہرست ہے۔ آپ کسی منزل پر جذبات کی رو میں نہیں بہے، کسی وقت انتہا پسندی کا شکار نہیں ہوئے اور تنقید کے علمی وقار اور سنجیدہ شعور کو برقرار رکھا۔ آج بھی ان کی تنقید نئے اندھیروں میں مشعل راہ کا کام دے رہی ہے۔ ان سے اگر کوئی اختلاف کرنا چاہے تو کر بھی سکتا ہے لیکن ایک احترام اور ادب کے ساتھ۔

پیش نظر کتاب احتشام صاحب کے تنقیدی مضامین کا تازہ ترین مجموعہ ہے۔ اس کی خوبیوں کے لئے صرف اتنی ضمانت کافی ہے کہ مصنف کا نام احتشام حسین ہے۔

اب وقت آگیا ہے کہ احتشام صاحب کو مضامین سے آگے بڑھ کر مستقل تصنیف کی طرف توجہ دینا چاہیئے اردو میں یہ بڑی کمی ہے کہ، تحریکات، نظریات، رجحانات اور شخصیات پر مستقل کتابیں نہیں لکھی جارہی ہیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے احتشام صاحب پیش قدمی کر سکتے ہیں۔ "ہم قلم"

شب گزیدہ

(ناول) قاضی عبدالستار۔ ناشر:۔ ادارۂ انیس اردو، الہ آباد۔ تقسیم کار: مکتبۂ فسانہ۔ ۲۱۲ دائرۂ شاہ اجمل الہ آباد۔ قیمت تین روپے پچہتر پیسے۔ نفیس طباعت خوبصورت گرد پوش۔

نہ صرف یہ کہ قاضی عبدالستار کو کہانی سنانے کا ڈھنگ آتا ہے بلکہ اپنے موضوع اور اپنے کرداروں سے آتنی گہری واقفیت بھی کم افسانہ نگاروں کو حاصل ہوگی۔ اودھ کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ "شب گزیدہ" بھی اودھ کی فیوڈل تہذیب کا ایک المیہ ہے۔ لیکن آزادی سے چند سال قبل کے اودھ کے یہ تعلقدار اور اُن کی رعیت محض ٹائپ یا علامتی کردار ہرگز نہیں ہیں بیحد حقیقی اور جیتے جاگتے انسانوں کی انفرادی اور طبقاتی شخصیتوں اور ان کے کربناک سماجی اور جذباتی رشتوں کے حیرت انگیز تنوع اور ایک مٹتے ہوئے معاشرے اور ایک انسانی ڈرامے کی بے مثال مصوری کے ساتھ "شب گزیدہ" کے ایسے ناولٹ اردو میں غالباً نہیں لکھے گئے۔

"شب گزیدہ" سے بہتر کہانی قاضی عبدالستار ہی لکھ سکتے ہیں۔

قرۃ العین حیدر

غالب شناسی

(تنقید) ظ۔ انصاری۔ ملنے کا پتہ:۔ علوی بک ڈپو، محمد علی روڈ بمبئی۔ ۳۔ مکتبۂ جامعہ جامعہ نگر، نئی دہلی، بمبئی ۳۔ قیمت تین روپے۔

زیر تبصرہ کتاب چار مختلف ابواب میں تقسیم کی گئی ہے۔ ۱۔ غالب کا مطالعہ۔ ۲۔ غالب کی زندگی اور فن کی رفتار ۳۔ مثنوی ابر گہربار اور ۴۔ غالب کا ورثہ۔

کتاب کے ابتدائی صفحات میں اب تک کے غالب نگاروں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میرے خیال سے یہ نہایت مختصر لیکن بڑے کام کا جائزہ ہے۔ یہ مختصر سا اشاریہ غالب کا ادب عزیز رکھنے والوں کو غالبیات کے انبار سے روشناس کرا دیتا ہے اور یہ مصنف کی قابلِ تعریف کوشش ہے۔

غالب شناسی کے دوسرے باب میں شاعر کی زندگی اور فنی رفتار پر مختصر مگر جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔ بالفاظ مصنف "فرد اور اس کے زمانے کے حالات کا رشتہ، ان حالات کا ذہن و عمل پر اثر، مختلف اثرات کی باہمی کشمکش، ادبی اور فنی معیار، ان معیاروں کے مدارج، ان سب کی ناپ طول اور پھر اس کی بنا پر کسی فنی کارنامے کے اندرونی حسن ظاہری تناسب اور گہرائی کی داد دینا آج کی تنقید کا تقاضا ہے۔" میں سمجھتا ہوں کہ قابل مصنف نے اس تقاضے کو پورا کیا ہے اور تنقید کے ان اصولوں کو شاعر کی زندگی اور فن کو پرکھنے کے لئے بڑی دیانت داری سے نبھائے ہیں۔ اس کتاب میں جو غالب پر پانچ کتابوں کے سلسلے کی پہلی کڑی ہے، غالب کے ذہنی سفر کی روئداد سادہ اور شگفتہ زبان میں بیان کی گئی ہے۔ بڑی کاوش اور محنت سے مصنف نے غالب کے ذہنی اپروچ کو سمجھا ہے اور اسکے آئیڈلس اور اخلاقی اقدار کو شاعر کی حقیقی زندگی اور حالات کے کینوس پر ابھارا ہے۔ بڑی دیانت داری کے ساتھ اس تضاد اور ٹکراؤ کو نفسیاتی عوامل کی روشنی میں پیش کیا ہے جو غالب کے آئیڈلس اور زندگی میں پایا جاتا ہے۔

غالب کی آرزومندی، ان کا اپنے غموں پر مسکرانا۔ جبر کے طوفانی سمندر میں اختیار کی کشتی کھینے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا۔ اپنی شکستہ اور زخمی زندگی کے باوجود خودداری اور عزتِ نفس کا پرچم لہرانا، آزادہ روی پر زور دینا اور ایسے ہی زندگی کے اعلیٰ اصول جو غالب کو بے حد عزیز ہیں، ان کی چھان بین کر کے ہمارے سامنے پیش کئے ہیں۔ وہ غالب کی بڑائی اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ زندگی میں ردّ و قبول اور آزادانہ فکر و عمل کا زبردست حامی ہے۔

نا۔ صاحب نے ایک بڑا اہم انکشاف کیا ہے اور وہ یہ کہ پرانے طرز تعلیم میں جن طالب علموں میں منطق و فلسفے کا رجحان ہوتا ہے وہ فارسی کی طرف جھک جاتے ہیں اور مذہبی رجحانات رکھنے والے عربی کی طرف مجھے اس بات سے سو فیصدی اتفاق ہے لیکن میری توجیہہ ذرا مختلف ہے۔ ایران اور یونان میں پرانی دشمنی چلی آ رہی تھی اور ایران برسوں تک یونان کے کئی سیاسی مہاجرین کے لئے جائے پناہ بنا رہا۔ ان مہاجرین میں کچھ فلسفی بھی شامل تھے۔ غالباً یوں یونان سے فلسفہ ایران منتقل ہوا اور یہ ایرانیوں کے لہو میں رچ بس گیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی دور میں بھی ایران نے بڑی دھوم کے فلسفی پیدا کئے مثلاً غزالی، ابن مسکویہ، ابن سینا، عمر خیام وغیرہ۔ چنانچہ باریک بینی، تردف نگاہی اور فلسفیانہ موشگافی کو ایرانی ادب میں خوب برتا گیا۔ اور یہ فلسفیانہ رچاؤ فارسی شاعروں کا تہذیبی ورثہ ہے

مثنوی ابرِ گہر بار کا جو غالب کی بہت اہم مثنوی ہے، صاف ستھری اور سلیس زبان میں ترجمہ اس کتاب کا بہت ہی قیمتی حصّہ ہے۔ اس مثنوی میں غالب نے اپنے ذہن کو نچوڑ کر رکھ دیا ہے۔ کیونکہ زندگی کی وہ تمام اعلیٰ قدریں جو غالب کو بے حد عزیز ہیں اس مثنوی میں ملتی ہیں۔ غالب کا مطالعہ کرنے والوں کے لئے یہ مثنوی بڑا اہم درجہ رکھتی ہے۔

"غالب شناسی" کا آخری باب "غالب کا ورثہ" مثنوی ابرِ گہر بار کی طرح اس کتاب کا نچوڑ ہے۔ واقعی یہ مضمون مصنّف نے اپنے خونِ جگر سے لکھا ہے۔ اس میں غالب کا فلسفیانہ پہلو ان کا تصوف سے لگاؤ، زندگی میں تصوف سے لیا گیا اخلاقی برتاؤ اور ان کے صوفی کلٹ کی وسیع المشربی کو بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ مصنّف نے صفحہ ۱۴۳ پر علامہ شبلی کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے تصوف کے ابتدا کی بڑی انوکھی اور دلچسپ وجہ بیان کی ہے۔ ممکن ہے تاریخ شبلی کی تائید کرے لیکن مصنّف کا خیال ہے کہ:

"غالباً یوں ہے کہ جب کوئی فکری نظام اپنے جارحانہ عمل سے پھیلنے پھولنے کی جگہ بنا چکتا ہے، قدم جما چکتا ہے، جب اس کے کارکن نظام سلطنت قائم کر کے اس کے چھتّے سے شہد نچوڑنے اور اپنے حلق میں ٹپکانے کے عادی ہو جاتے ہیں، اور اسی جبر کے اندر سے فکری آزادی کی تحریک اٹھتی ہے۔ فاتح کو قوت کے زور سے اپنا حق منوانے کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ مفتوح کے تمدّن اور تہذیب کے ساتھ سنگم بنانے کا عمل شروع ہوتا ہے۔ دوسری قوموں کے علم و فن کے دریچے ذہنوں پر کھلتے ہیں اور تہذیب ردّ و قبول کے تیز رفتار عمل سے گذرنے لگتی ہے تب اس جلال کے سنگین سینے سے جمالی صفات کا دھارا پھوٹتا ہے اور تصوف، سیاسی اور فکری جارحیت کا رد بن کر زندگی کی خوبصورتیوں اور سادگیوں کا قبول بن کر ذہنوں میں پرورش پاتا ہے

اور بالآخر ایک اخلاقی برتاؤ ہو کر روزمرہ کے بیوہار میں درس لیں جاتا ہے۔"

مصنف کی یہ رائے بڑا وزن رکھتی ہے اور اہل نظر کی توجہ کی مستحق ہے۔ تاریخی حقائق اور دلائل کی روشنی میں اس رائے پر بڑی دلچسپ بحث کی جا سکتی ہے۔ غالباً تصوف کی ابتدا اور اس کے پھیلاؤ پر ایسی رائے پہلی مرتبہ پیش کی گئی ہے[۱] اور اس میں شک نہیں کہ بڑے دلکش انداز میں پیش کی گئی ہے۔

یہ کتاب غالبیات کے انبار میں ایک جداگانہ مقام رکھتی ہے۔ اس میں مصنف نے تحقیق کا دعویٰ نہیں کیا لیکن ان کے مطالعے کی گہرائی کا ہمیں ضرور اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ غالب کے تازہ افکار کا ایسا البم ہے جس میں شاعر کے ذہنی اور تہذیبی سفر کے مختلف ادوار کی رنگا رنگ تصویریں سلیقے اور نفاست سے سجائی گئی ہیں۔

ا۔ جمیز

پچاس جیبی کتابیں

ہندی میں جیبی کتابیں شائع کرنے والے مشہور و معروف اشاعت گھر ہند پاکٹ بکس دہلی نے اب اردو میں بھی دس دس کتابوں کے پانچ سیٹ شائع کئے ہیں۔ ملک میں جیبی کتابیں چھاپنے والے کئی اشاعتی ادارے موجود ہیں لیکن ان سب میں ہند پاکٹ بکس کو امتیازی درجہ حاصل ہے کیونکہ یہ ادارہ سستی کتابیں تو چھاپتا ہے لیکن گھٹیا نہیں۔ طباعت اور ادب دونوں پہلوؤں میں اس کا معیار انتہائی بلند اور باوقار رہتا ہے۔ مثال کے طور پر زیر تبصرہ پانچوں سیٹوں کو دیکھ کر اور پڑھ کر ادبی ذوق رکھنے والے قارئین بڑا فخر کر سکتے ہیں کہ ہند پاکٹ بکس نے جیبی کتابیں چھاپنے میں ہمارے ملک کو امریکہ اور یورپ کے مقابلے پر لا کھڑا کیا ہے۔ ان پانچوں سیٹوں میں ملکی اور بین الاقوامی شہرت کے مالک مصنفین کی کتابیں شائع کی گئی ہیں۔ مثلاً کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، کنہیا لال کپور، فراق گورکھپوری، سجاد ظہیر، اوپندر ناتھ اشک، پرکاش پنڈت، بلونت سنگھ، اے حمید، شفیق الرحمٰن، جیلانی بانو، وغیرہ کی ادبی تخلیقات ان پانچوں سیٹوں کے معیار اور وقار کی ضامن ہیں۔ ان کتابوں میں ناول بھی ہیں، کہانیاں بھی، شعر و شاعری بھی اور طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بھی۔ ان سیٹوں کی ایک منفرد خصوصیت رکھی گئی ہے کہ ہر سیٹ میں کسی نہ کسی غیر ملکی اور ملکی زبانوں کی بہترین کتاب بھی ترجمہ کر کے شائع کی جاتی ہے اور ایک دو معلوماتی کتابیں بھی چنانچہ ان پانچوں سیٹوں میں ٹالسٹائی، پرل بک، امرتا پریتم، ملک راج آنند، رانگے راگھو، کرتار سنگھ دگل، سویٹ مارڈن وغیرہ کی تخلیقات شامل کی گئیں ہیں۔ ہم ان معیاری اور خوبصورت ادبی کتابوں کی اشاعت پر جہاں ہند پاکٹ بکس کو مبارکباد دیتے ہیں وہاں مشہور افسانہ نگار پرکاش پنڈت کو بھی مبارکباد دیتے ہیں جو اس ادارے کی جیبی کتابوں کے نگراں، اور ایڈوائزر ہیں کیونکہ انہیں کی ذہانت اور سوجھ بوجھ اور محنت کی بدولت یہ کتابیں معیاری اور حسین بن پائی ہیں۔

فکر تونسوی

[۱] اس بیان میں مبالغہ ہے۔ ادارہ

پشپا پکچرز پرائیویٹ لمیٹڈ

دھرمیندر۔ جے للیتا۔ بلراج ساہنی۔ تنوجہ، اور محمود

ڈائرکشن :۔ ٹی۔ پرکاش راؤ۔

گیت :۔ ساحر لدھیانوی میوزک :۔ لکشمی کانت پیارے لال

مکالمے :۔ راجندر سنگھ بیدی

پروڈیوسر :۔ اے۔ کے۔ ناڈیاڈوالا

آر۔ سی۔ کمار

شترو جیت فلمز

سادھنا۔ منوج۔ بلراج ساہنی
رحمان۔ ششی کلا۔ سلوچنا۔ ترن بوس

اور

محمود

ڈائرکشن۔ ٹی۔ پرکاش راؤ

گیت :۔ ساحر، میوزک۔ روی

سکرین پلے، مکالمے، راجندر سنگھ بیدی

فوٹوگرافی، دھرم چوپڑہ

پروڈیوسر:۔ شترو جیت پال

جاری کردہ :۔ شترو جیت فلمز۔ رنجیت سٹوڈیوز۔ دادر۔ بمبئی ۱۴

انوریتا آرٹس کی پیش کش

ڈاسنا

راجکمار، پدمنی۔ بسواجیت، کمد چگانی

سعیدہ خاں۔ ببلو اور راجندر ناتھ

ڈائرکشن:۔ ٹی پرکاش راؤ

گانے:۔ ساحر لدھیانوی۔ موسیقی: چترگپت

فوٹوگرافی:۔ مدن سنہا، مکالمے، اندرراج آنند

کہانی:۔ گلشن نندا۔ پروڈیوسر۔ کل جیت پال

جاری کردہ

انوریتا آرٹس۔ رنجیت سٹڈیوز۔ دادر۔ بمبئی ۱۴

KASHMIR MARCHES AHEAD

The following are some concrete achievements made by the State of Jammu and Kashmir in various spheres of social and economic reconstruction :-

1. The Revenue Receipts have risen from Rs. 274.45 lakhs in 1947-48 to Rs. 30.17 crores in 1965-66
2. Per capita income of the State at 1955-56 price level has risen from Rs. 188.41 to Rs. 252.60 between 1951-61.
3. Average life expectancy has incresed from 32 years to 47 years between 1951-61.
4. A record revenue of Rs. 4.10 crores was realised in 1964-65 from the forests as against Rs. 0.28 crores obtaining in 1947.
5. The first and second Five Year Plan was completed at a cost of Rs. 11.52 crores and Rs. 25.95 crores respectively. The Third Five Year Plan was of the order of Rs. 75 crores. As a result of the Five Year Plans 33,569 additional jobs were created.
6. The supply of electric power in the State has registered a steady increase. On the eve of independeuce the supply of power in the State was 4.36 MWS. It rose up to 15.20 MWS at the beginning of the 3rd Plan and was scheduled to be 36.52 MWS by the end of the 3rd. Plan. As many as 643 villages were also scheduled to be electrified by the end of the 3rd Plan.
7. Education from Kindergarten to the University standard has been made free. During 1947-65 the number of all types of educational institutions in the State rose from 1,663 to 6,862 and the number of scholars from 1,02,500 to 5,14,400.
8. In recent years professional Colleges and Institutions such as Medical College, an Engineering College, two Agricultural Colleges, two Polytechnics and seven Industrial Training Institutions have been established.
9. In November 1948, the Jammu and Kashmir University was established as an examining institute. Today it imparts Post-Graduate instructions in 21 subjects. In order to provide facilities for post-graduate studies in the two provinces the University was re-organised into two Divisions-one each for Jammu and Kashmir during 1964.
10. Per capita expenditure on public health has risen from Rs. 0.47 in 1947 to Rs. 4.80 in 1964-65. Free Medical aid is provided to the people.
11. During 1953-65 over five thousand youngmen of the State were deputed for professional trainning in and outside India at a cost of Rs. 2,78,96,700.

Issued by :-

Directorate of Information, Jammu & Kashmir Government.

BOAC
VC10